تذکرۂ معاصرین

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

تذکرۂ معاصرین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

تذکرۂ معاصرین

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران میں وفات
پانے والے ادبا کے حالات اور کلام

از

مالک رام

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ
نئی دلّی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دلّی ۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دلّی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ، بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

اپریل ۱۹۷۲ء

تعداد ۱۱۰۰

جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶

تعارف

بعض احباب کے تعاون سے ۱۹۶۶ء کے اواخر میں دلّی میں 'علمی مجلس' کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے اصلی مقصد یہ تھا کہ ہم لوگ کبھی کبھی مل بیٹھیں، جب کسی علمی یا تحقیقی موضوع پر تبادلۂ خیالات کیا جا سکے۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ مجلس اپنا رسالہ بھی شائع کرے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق تماہی 'تحریر'، ۱۹۶۷ء میں جاری کیا گیا؛ اس کی ترتیب میرے سپرد ہوئی۔ ابھی ایک ہی شمارہ شائع ہوا تھا کہ لکھنؤ میں میرزا جعفر علی خاں اثر کا انتقال ہو گیا۔ میرے ان کے برسوں کے تعلقات تھے جی میں آئی کہ ان کے مختصر حالات تحریر میں شائع کر دوں۔

ابھی ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رفیق مارہروی کے بھی انتقال کی خبر موصول ہوئی؛ یہ بھی میرے ملنے والے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ اچھا، ان کے بھی سہی۔ بدقسمتی سے وہ تماہی ختم ہوتے ہوتے چار پانچ صاحب داغ مفارقت دے گئے؛ اور میں نے ۱۹۶۷ء کی دوسری تماہی کے شمارے میں ان سب کے مختصر حالات شائع کر دیے۔ یوں گویا تحریر میں وفیات کے مستقل باب کا اضافہ ہو گیا۔

یہ فیصلہ کسی بڑی ہی بُری گھڑی میں ہوا تھا۔ وہ دن، اور آج کا دن؛ اس کے بعد شاید ہی کوئی تماہی ایسی گذری ہو، جس میں کسی نہ کسی مرحوم کے حالات مجھے نہ لکھنا پڑے ہوں۔

جب خیال کرتا ہوں کہ ان پانچ برس میں ستّر سے زیادہ اہلِ علم و قلم ہم سے جدا ہو گئے

ہیں، تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جو جاتا ہو، اپنی جگہ کچھ اس طرح سے خالی کر جاتا ہے کہ پھر کوئی اسے کما حقّہٗ پُر نہیں کر سکتا۔ کہنے کو تو غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ موت ابنِ آدم کی میراث ہے؛ جو پیدا ہوا ہے، اسے ایک نہ ایک دن ضرور مرنا ہے۔ آج وہ، کل ہماری باری ہے۔ لیکن ہم میں سے کس کی خواہش نہیں ہوتی کہ کاش، غالب کوئی دن اور زندہ رہتے، تاکہ نہ صرف ہم خود ان سے مستفید ہو سکتے، بلکہ وہ اپنے علم و فضل، گفتار و کردار سے نئی نسل کو بھی روشنی دکھاتے، جس سے ہماری ذہنی اور اخلاقی اقدار اور زندگی کا تسلسل قائم رہتا۔ اس سے نہ صرف ان کی جدائی اور موت کے صدمے کی شدّت کم ہو جاتی، بلکہ یہ اطمینان بھی رہتا کہ جس کام کے لیے وہ جیے، اور جو راہ انھوں نے دکھائی، اس کام کے کرنے والے اور اس راہ پر چلنے والے اب بھی موجود ہیں۔

میں نے حتی الوسع حالات کی صحت سے متعلق اطمینان کر لیا ہے۔ میری اپنی یادداشت تو ہے ہی کیونکہ خوش قسمتی سے اس دور کے بہت سے اصحاب سے میرے ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ کم و بیش یادداشتیں بھی لکھی رکھی ہیں۔ اس کے باوجود میں نے بالعموم مرحومین کے پسماندگان اور دوست احباب سے بھی استمداد کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ بے عیب اور غلطی سے مبرّا ذات تو صرف خدا کی ہے؛ اس لیے کاملاً صحت کا دعویٰ غلط ہوگا۔ لیکن اس طرح سے جتنا کچھ جمع کر سکا ہوں، مجھے یقین ہے کہ اس میں سقم کے راہ پا جانے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے۔

اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت بہت پرانی ہے۔ شروع میں ان تذکروں کی حیثیت بیاض سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی: تذکرہ نگار کی بیشتر توجہ اشعار کے جمع کرنے پر رہتی؛ حالات ضمناً، اور وہ بھی ایک آدھ سطر میں لکھ دیے جاتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، حالات مفصّل تر ہوتے چلے گئے۔ لیکن قدیم تذکروں کی وہی مختصر یادداشتیں آج تاریخِ ادبِ اردو

کا خام مواد ثابت ہو رہی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر کہیں قدما نے یہ تذکرے مرتب نہ کیے ہوتے، تو تاریخِ ادب کی تکمیل کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔

ادھر بہت دن سے کوئی قابلِ قدر تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ معاصرین کے حالات سے خاص کر بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ میرے علم میں ان کے مصدقہ حالات کہیں جمع نہیں ہو رہے ہیں۔ اس طرح جو خلا پیدا ہو رہا ہے، اس کے اثرات، آج تو نہیں، زمانہ گذرنے کے ساتھ محسوس ہونگے، جب مؤرخِ ادب اِس دور کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کریگا۔ اس وقت اسے ان اصحاب کے حالات جمع کرنے میں جو دقت پیش آئیگی، اس کا اندازہ اسی سے لگایئے کہ اساتذۂ متقدمین و متوسطین سے متعلق کتنی معلومات اور تفصیلات ہیں، جن کی کھوج میں آج ہم سرگرداں ہیں۔ اگر حسنِ اتفاق سے کہیں سے کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی ہے، تو ہمیں کتنی مسرت ہوتی ہے؛ اور دریافت کرنے والے کو کتنا فخر۔ جو آسانیاں ہمیں میسّر ہیں، وہ بعد کے مؤرخ کی دسترس سے باہر ہونگی۔ اس سے بھی ہماری ذمّے داری بڑھ گئی ہے۔

اسی خیال سے میں نے مرحومین کے حالات، جہاں تک ہو سکا، پوری تفصیل سے قلمبند کر دیے ہیں۔ ممکن ہے، کسی صاحب کے نزدیک بعض تفصیلات غیر ضروری ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والا مؤرخ ان کی قدر کریگا اور اس سے اس کا کام بہت آسان ہو جائیگا۔

دنیات میں شائع شدہ حالات کے کتابی شکل میں منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا، تو میں نے ان پر نظرِ ثانی کی۔ جہاں کہیں کوئی کھانچا نظر آیا، اُسے پُر کرنے کی کوشش کی۔ جن اصحاب کی نظر سے یہ مضمون 'تحریر' میں گذر چکے ہیں، وہ بھی مقابلہ کرنے پر بہت فرق پائینگے، انھیں کئی مقامات پر اضافہ ملیگا، اجمال کی جگہ تفصیل نظر آئیگی۔ دو ایک نام کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ جن کے حالات پہلے لکھنے سے رہ گئے تھے، نیز میں نے خیال کیا کہ ان میں جو شاعر حضرات تھے، اگر ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کر دیا جائے، تو اس سے

استفادے اور دلچسپی کا دائرہ وسیع تر ہو جائیگا۔ یہ بجائے خود بہت محنت طلب کام تھا۔
بارے، یہ بھی ہو گیا۔ فالحمد للہ۔
میں ان تمام حضرات کا شکرگزار ہوں، جنھوں نے مختلف شعرا کے حالات اور دواوین مہیا کرتے میں مدد فرمائی۔

مالک رام

نئی دلی

۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء

فہرست

بترتیبِ حروفِ تہجّی

فہرست
بترتیبِ تاریخِ وفات

نام	مقام	تاریخ	سال	صفحہ
باسط اوجینی، نیاز محمد خان	اوجین	۱۷ دسمبر	۱۹۷۰ء	۲۸۰
شاغل جبلپوری، احترام الدین احمد عثمانی	جبلپور	۱۸ جنوری	۱۹۷۱ء	۲۸۴
عابد لاہوری، سید عابد علی	لاہور	۲۰ جنوری	۱۹۷۱ء	۲۸۹
روش صدیقی، شاہد عزیز	شاہجہانپور	۲ جنوری	۱۹۷۱ء	۲۹۷
عقیل جعفری، سید عقیل احمد	کراچی	شب ۲۶/۲۷ جنوری	۱۹۷۱ء	۳۰۵
وکیل اختر، وکیل احمد اختر خان	کلکتہ	۹ فروری	۱۹۷۱ء	۳۰۷
میاں بشیر احمد	لاہور	۳ مارچ	۱۹۷۱ء	۳۱۰
عبدالقادر سروری، پروفیسر	سرینگر	۱۱ مارچ	۱۹۷۱ء	۳۱۴
قیس بنارسی، منشی شیو مورت لال	بنارس	۲ اپریل	۱۹۷۱ء	۳۱۹
اختر تلہری، سید اختر علی	لکھنؤ	۲۱ اپریل	۱۹۷۱ء	۳۲۳
حبیب اشعر دہلوی، حکیم حبیب احمد	لاہور	۱۵ جون	۱۹۷۱ء	۳۲۸
محمد حبیب، پروفیسر	علی گڈھ	۲۲ جون	۱۹۷۱ء	۳۳۱
تسکین قریشی، محمد یٰسین	آگرہ	۲۴ جون	۱۹۷۱ء	۳۳۷
شاغل قادری، سید محمد شاغل	پنجوارہ	۱۶ جولائی	۱۹۷۱ء	۳۴۸
خیر بھوروی، ابوالخیر	بھورہ	۱۷ جولائی	۱۹۷۱ء	۳۵۳
راز بلگرامی، سید شریف الحسن	بلگرام	۱۰ اگست	۱۹۷۱ء	۳۵۵
طالب کشمیری، پنڈت نند لال کول	سرینگر	۱۳ ستمبر	۱۹۷۱ء	۳۵۷
عارف عباسی، محمد عثمان بلیاوی	میرٹھ	۲۶ ستمبر	۱۹۷۱ء	۳۶۲
منظر صدیقی، شمشاد حسین	کراچی	۲ اکتوبر	۱۹۷۱ء	۳۶۷
سامی، مہادیو پرشاد	جبلپور	۲ اکتوبر	۱۹۷۱ء	۳۷۰

افقر موہانی وارثی، سید محمد حسین	لکھنؤ	۲ نومبر	۱۹۷۱ء	۳۷۴
سید عبداللطیف، ڈاکٹر	حیدرآباد	۴ نومبر	۱۹۷۱ء	۳۸۲
مہر، مولانا غلام رسول	لاہور	۱۶ نومبر	۱۹۷۱ء	۳۹۸
سیدین، خواجہ غلام السیدین	نئی دلّی	۱۹ نومبر	۱۹۷۱ء	۴۰۰

فلک، لالہ لال چند

۱۲ جنوری ۱۸۸۷ء کو اپنے آبائی وطن یعنی ضلع گوجرانوالہ (پنجاب، پاکستان) کے مشہور قصبے حافظ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کی لاہور میں غلّے اور اناج کی دکان تھی۔ چنانچہ ان کا بچپن اور تعلیمی زمانہ یہیں گزرا۔ ۱۹۰۴ء میں دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد کسبِ معاش کے لیے ملازمت اختیار کی اور چیف انجنیر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب انگریز افسر اپنے دیسی ماتحتوں سے بہت درشتی اور فرعونیت کا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے آئے دن اس طرح کے ناخوشگوار حالات دیکھے، تو ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس پر وہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور پھر ساری عمر سرکاری نوکری کے نزدیک نہیں گئے۔

کانگریس کی سیاسی تحریک اب روز بروز تیز تر ہو رہی تھی۔ لال چند فلک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پُرجوش تقریریں اور نظمیں پڑھنے لگے۔ نوبت قید و بند تک پہنچی۔ جون ۱۹۱۷ء میں بجرمِ بغاوت ۲۰ سال کے لیے

کالے پانی (جزیرہ انڈیمان) کی سزا ہوئی جو بعد کو ۱۴ سال کی قید میں تبدیل کردی گئی۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں دستوری اصلاحات کا نفاذ ہوا تو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ اسی میں انھیں بھی رہائی ملی لیکن اُن کا نشہ ایسا نہیں تھا کہ تعزیر و تعذیب کی تُرشی اُسے اتار دیتی۔ ان کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔

شعر پر اصلاح منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی سے لی۔ اسی زمانے میں ان کی قومی نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے تھے: جام فلک، پیام فلک، کلام فلک۔ مہابھارت بھی بطرز ناول نثر میں لکھی تھی۔ ان کا یہ مصرع ضرب المثل بن چکا ہے۔

تو بھی بدل، فلک! کہ زمانہ بدل گیا

اس بزرگ قوم پرست شاعر کا ۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء کو دلّی میں انتقال ہوا۔ ۸۰ سال کی عمر پائی۔

افسوس، کوشش کے باوجود ان کے کلام کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوا۔ مندرجہ ذیل چند شعر بڑی کوشش سے مہیّا کر سکا ہوں۔ ان کا کلام آپ بیتی اور دلی جذبات کا آئینہ ہے۔

آگ میں پڑ کر بھی سونے کی دمک جاتی نہیں
کاٹ دینے سے بھی ہیرے کی چمک جاتی نہیں

سِل پہ گھس دینے سے بھی جاتی نہیں چندن کی بُو
پھول کی مٹی میں مل کر بھی، مہک جاتی نہیں

رنج میں آتا نہیں نیکوں کی پیشانی پہ بل
دھوپ کی تیزی میں سبزے کی لہک جاتی نہیں

جا نہیں سکتی کٹہروں میں بھی شیروں کی دہاڑ
دستِ گلچیں میں بھی غنچوں کی چٹک جاتی نہیں

صاحبِ ہمت نہیں دبتا مخالف سے کبھی
زور سے آندھی کے آتش کی بھڑک جاتی نہیں

نعرہ زن رہتا ہے آفات و حوادث میں دلیر
بادلوں میں گھر کے بجلی کی کڑک جاتی نہیں

ملک کی الفت کا جذبہ دل سے مٹ سکتا نہیں
قوم کی خدمت کی خواہش اے فلک جاتی نہیں

دل سے نکلیگی نہ مر کر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئیگی

میں اٹھا لونگا بڑے شوق سے اس کو سر پر
خاک اڑانے کے لیے بادِ صبا آئیگی

زندگانی میں تو ملنے سے جھجکتی ہے فلک!
خلق کو یاد مری بعدِ فنا آئیگی

وطن کی پھانس جس دل میں گڑی ہے
خوشی سے وہ اٹھاتا ہر کڑی ہے

محن کا ابر، ہے رحمت کا بادل
گھٹا آفت کی، ساون کی جھڑی ہے

اخگر فیروزپوری، نند کشور

۲۶ اگست ۱۹۰۱ء کو فیروزپور کے ایک متموّل گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ جگن ناتھ کا شہر کے سربرآوردہ اصحاب میں شمار تھا۔ ابھی ۲۲-۲۳ برس کے تھے کہ انگریزی حکومت نے انھیں آنریری مجسٹریٹ بنا دیا۔ وہ کوئی ۴۰ سال اس عہدے پر فائز رہے۔ لکھنے پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ان کی تصنیف "بھگوت گیتا کی شرح" مطبوعہ موجود ہے۔

اخگر صاحب نے بی اے اور ایل ایل بی کی اسناد پانے کے بعد فیروزپور میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔

والد لالہ جگن ناتھ کا ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوگیا، اور گھر کی ذمّے داری اخگر صاحب پر آپڑی۔ ۱۹۳۸ء میں آپ بھی آنریری مجسٹریٹ بنے اور آزادی (۱۹۴۷ء) تک پوری دیانت داری اور تندہی سے اس کے فرائض سرانجام کرتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنی ذاتی وکالت بھی ترک کر دی تھی، تاکہ دونوں میں کسی جگہ ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ شہر کے رفاہِ عامہ کے کاموں سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ "انجمن امدادِ قیدیان" کے اعزازی سکرٹری تھے۔ نیز مقامی اسکول کی مجلسِ منتظمہ کے نائب صدر تھے۔

آخری چند سال میں اپنا کاروبار کر لیا تھا۔ فیروز پور کا سینما ہال، شملہ ٹاکیز نامی انھیں کی ملکیت تھا۔ ۲۰ اپریل، ۱۹۶۰ء کو فیروز پور ہی میں رحلت کی۔

طالبعلمی کے زمانے ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جب سنجیدگی سے شعر کہنے لگے، تو خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے اصلاح لینے لگے۔ اس طرح اخگر کا سلسلۂ تلمذ خدائے سخن میر تقی میر پر منتہی ہوتا ہے۔

انھوں نے کسی زمانے میں گیتا کا منظوم ترجمہ شروع کیا تھا اور اس کا کچھ حصہ "درسِ حیات" کے عنوان سے چھپا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ آخری ایام میں انھوں نے اسے مکمل کر لیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا مسودہ کہاں ہے، یہ چھپ جانا چاہیے تاکہ محفوظ ہو جائے۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تمام عمر مرے دل کے زخم بھر نہ سکے
مرے نصیب وہ بگڑے کہ پھر سنور نہ سکے

ترے بغیر سمایا نہ کوئی آنکھوں میں
ہزار نقش اتارے مگر اتر نہ سکے

تمھاری یاد میں کچھ بھی رہا نہ یاد ہمیں
کہاں کہاں تمھیں ڈھونڈا یہ یاد کر نہ سکے

عبث ہیں روز کے نالے چمن میں اے بلبل!
لگا وہ آگ کہ گلچیں بھی گل کتر نہ سکے

شرف ملا نہ جنھیں تیری بار یابی کا
گزر کے بھی ترے کوچے سے وہ گزر نہ سکے

شبیہہ کھینچ تو دی ہے مصوّروں نے مری
مگر وہ دردِ محبت کا رنگ بھر نہ سکے

نہ بحرِ غم میں دلِ زار غرق ہو اخگر!
یہ وہ سفینہ ہی جو ڈوب کر ابھر نہ سکے

صد حیف اسے تو نے جدا چھوڑ دیا ہے
جس نے سبھی کچھ تیرے سوا چھوڑ دیا ہی

درکار رہے محفل کو عنایت کی نظر بھی
تم نے تو فقط تیرِ ادا چھوڑ دیا ہی

اللہ رے ساقی! وہ تری شوخ نگاہی
واعظ نے بھی مضمونِ خدا چھوڑ دیا ہی

اے تارکِ دنیا! تجھے جنّت کی ہوس کیوں؟ چھوڑا نہ اسے تو نے، تو کیا چھوڑ دیا ہے
اس ترکِ تمنا کی کوئی حد بھی ہے، اخگر!
کیوں حلقۂ اربابِ وفا چھوڑ دیا ہے؟

رباعیات

مظلوم ہیں ہر طرح خطا وار، افسوس!
اب صاحبِ قدرت ہیں ستمگار، افسوس!
منظور ہے ہر کسی کو طاعت زر کی
مفلس کا نہیں کوئی بھی غمخوار، افسوس!

لڑتے ہیں بہم دگر برادر، افسوس!
سر ان کا پھر گیا ہے سراسر، افسوس!
خویشوں کی نگاہ سے تلملاتے ہیں
غیروں کی وہ کھا رہے ہیں ٹھوکر، افسوس!

چھٹ گئی آہ! وطن پرستی، افسوس!
ہو گئی آہ! ذلیل ہستی، افسوس!
ہر گھر میں بپا ہے ایک بزمِ ماتم
ویرانہ سی ہو گئی ہر بستی، افسوس!

رفیق مارہروی، رفیق احمد

احسن مارہروی مرحوم کے صاحبزادے، ۲۴ مئی ۱۹۶۷ء کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے بدایوں اسپتال میں انتقال ہوا۔ ۴ اپریل ۱۹۱۶ کو مارہرہ میں پیدا ہوئے تھے، گویا ۵۱ برس کی عمر پائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رفیق ان کا تخلص تھا حال آنکہ یہ صحیح نہیں ہے؛ وہ محض اپنا نام اس طرح لکھتے تھے، نہ یہ تخلص تھا، نہ کبھی انھوں نے شعر کہا۔ نثر میں البتّہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب "اسلام اور نظریۂ شرافت" تھی۔ چونکہ ان کے والد احسن مرحوم داغ کے محبوب شاگردوں میں تھے، اس لیے ان کے خاندان میں داغ سے متعلق بہت مواد تھا۔ اسی کا ثمرہ رفیق مرحوم کی دو کتابیں زبانِ داغ اور بزمِ داغ تھیں۔ وہ داغ کی سوانح عمری بھی مرتّب کر رہے تھے؛ خدا معلوم، یہ کس مرحلے پر تھی۔ ان کی ایک کتاب "ہندوؤں میں اردو" اگرچہ اغلاط اور عدمِ توازن سے خالی نہیں، تاہم قابلِ قدر ہے۔ اپنے والد احسن مرحوم کے کلام کا انتخاب جلوۂ احسن کے عنوان سے شائع کیا اور اس کے

شروع میں ان کی اچھی مبسوط سوانح عمری شامل کر دی تھی۔ تعلیم دسویں درجے تک تھی۔ وہ ساری عمر معمولی ملازم رہے۔ کنبہ بھی بڑا تھا، اس لیے کبھی فراغت کا منہ نہ دیکھا۔ یکم مئی کو ہیضے میں گرفتار ہو گئے۔ دو روز اسپتال میں رہ کر داتا گنج میں اپنے مسکن پر آئے۔ لیکن حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ بدایوں میں سول سرجن کا علاج ہو۔ اسی دوران میں ذیابیطس کے پرانے مرض نے غلبہ پالیا۔ جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو ۲۴ مئی کو اسپتال میں داخل کیے گئے۔ اسی شام اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شاہد احمد دہلوی

مترجم قرآن شمس العلما مولوی نذیر احمد دہلوی (ف ۱۹۱۲ء) کے پوتے اور "واقعاتِ دار الحکومتِ دہلی" کے مؤلف مولوی بشیر الدین احمد (ف ۱۹۲۷ء) کے بیٹے شاہد احمد دہلوی کا ۲۶/۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کی درمیانی شب میں پونے بارہ بجے بعارضۂ قلب کراچی میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو اپنے خاندانی مکان دلّی میں پیدا ہوئے تھے؛ گویا ۶۱ سال کی عمر پائی۔ خدا مغفرت کرے۔

ان کے والد مولوی بشیر الدین احمد ان کے بچپن کے زمانے میں ریاست حیدر آباد (دکن) میں ملازم تھے، اس لیے شاہد صاحب کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد ہی میں ہوئی۔ اس کے بعد پہلے علی گڑھ اور پھر دلی آئے۔ دسویں درجے کی سند انھوں نے عربک اسکول سے لی تھی۔ اس کے بعد لاہور جا کر فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا، لیکن ایف ایس سی کرنے کے بعد جب یہ میڈیکل کالج میں پہنچے، تو یہاں مردہ لاشوں کی چیر پھاڑ سے طبیعت اتنی مکدر ہوئی کہ بھاگ نکلے۔ بالآخر سان سٹیفنس کالج، دلّی سے انگریزی ادبیات میں

بی اے آنرز کی سند لی، اور پھر یہیں دلّی یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں ایم اے کیا۔ ادب کے علاوہ انھیں موسیقی سے بھی گہرا شغف تھا۔ انھوں نے سولہ برس کی عمر سے مختلف گھرانوں کے نمایندہ گایکوں کی خدمت میں رہ کر کلاسیکی موسیقی میں کامل درک حاصل کیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی معلومات اتنی وسیع اور جزئیات تک پر دسترس اتنی ماہرانہ تھی کہ وہ اس موضوع پر گھنٹوں صاحبِ فن اور بالغ نظر مبصّر کی حیثیت سے گفتگو کر سکتے تھے۔

مولوی نذیر احمد حیدر آباد میں صوبیدار رہے تھے اور مولوی بشیرالدین احمد تعلقدار اول۔ دونوں جزرس اور دور اندیش بزرگ تھے۔ چنانچہ شاہد صاحب کے والد اچھا خاصا اثاثہ چھوڑ مرے تھے: تینوں بھائیوں کے لیے پچاس پچاس ہزار روپیہ نقد اور متعدّد مکاناتِ جن کے کرایے سے دو دو سو کی ماہانہ آمدنی الگ تھی؛ لہٰذا شاہد صاحب کو بسر اوقات کے لیے کسی ملازمت کی ضرورت نہ تھی۔ خاندانی ماحول میں انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہو گیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے اپنے ایک دور کے عزیز انصار ناصری کے مشوروں سے ہوشوں سے ملاقات کی تقریب پیدا کرنے کے لیے جنوری ۱۹۳۰ء میں دلّی سے ماہنامہ ساقی جاری کیا؛ اور اسی کے ساتھ ساقی بک ڈپو بھی قائم کر دیا۔ اس ادارے کی طرف سے تقریباً دو سو کتابیں شایع ہوئیں۔ ساقی اردو کا بہت کامیاب پرچہ ثابت ہوا۔ اس کے ذریعے سے انھوں نے اردو علم و ادب کی بڑی وقیع خدمات سرانجام دیں۔ وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور درمے، درمے مدد کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان چلے گئے؛ دس مہینے لاہور میں قیام کرنے کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان خرید لیا اور

ساقی بھی دوبارہ جاری کر دیا۔ لیکن زمانہ بہت ناموافق رہا! اسے جاری رکھنے کے لیے انھیں کیا کیا جتن نہیں کرنا پڑے! ان حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ ہاری نہیں مانے۔ جس استقلال سے وہ آخری دم تک جُتے رہے، یہ ان کا قابلِ تعریف و تقلید کارنامہ ہے۔ یہاں انھوں نے اُجرت پر مضمون لکھے، ریڈیو کی ملازمت کی، جہاں وہ ایس احمد کے نام سے موسیقی کے پروگرام کے نگران اور ہدایت کار تھے۔ اور اس طرح جو کچھ کمایا، اسے ساقی کے تنور میں جھونکتے رہے۔

پاکستان میں ان کا بہت بڑا کارنامہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" کی تاسیس تھی، جسے انھوں نے ۱۹۵۹ء کے اوائل میں سات اور ادیب دوستوں کے ساتھ مل کر قائم کیا انھیں دلّی کی ٹکسالی زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔

انھوں نے کم و بیش پچاس کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ ان میں دلی کی بپتا' گنجینۂ گوہر' اور فاؤسٹ' بہت مشہور ہیں۔

۱۹۶۶ء میں وہ بیمار ہو گئے، ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا، اور بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اب وہ چلنے پھرنے لگے تھے، اور ان کی صحت بھی بتدریج عود کرنے لگی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلسل محنت اور مکروہات کی یورش نے ان کی تندرستی کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ ۱۰ فروری ۱۹۶۷ء کو دل پر پہلا حملہ ہوا۔ پندرہ بیس دن ہسپتال میں رہے اور بظاہر صحتیاب ہو کر گھر آ گئے۔ لیکن یہ سنبھالا ثابت ہوا۔ ۲۷ مئی کو وہ دن بھر اچھے رہے۔ شب میں کچھ بےچینی کا اظہار کیا، نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔ یکایک کھانسی کا دورہ پڑا۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے وہ جاں بحق ہو چکے تھے۔ ان کی وفات سے ایک اردو کا شیدائی، دلّی کی تہذیب اور وضعداری و شرافت کا نمونہ ہم سے جدا ہو گیا۔ حق مغفرت کرے۔

اثر لکھنوی، میرزا جعفر علی خان

حضرت اثر بہت دن سے بیمار چلے آتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، جس سے وہ زیادہ نقل و حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ ادھر حافظہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ نظر آ رہا تھا کہ اب وہ برسوں کے نہیں، ہفتوں اور دنوں کے مہمان ہیں۔ چنانچہ وقتِ موعود آن پہونچا، اور منگل کے دن ۶ جون ۱۹۶۷ء صبح کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اثر صاحب کا خاندان ایرانی تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ میرزا محمد شفیع اصفہان سے آگرے آئے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ طبیب تھے۔ آگرے میں اُن کی حذاقت نے ایسی شہرت حاصل کی کہ نواب وزیر شجاع الدولہ نے انھیں فیض آباد طلب کر لیا؛ مناسب قدر و منزلت ہوئی اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ حکیم محمد شفیع کے صاحبزادے میرزا محمد سمیع ذرّہ تخلص (ف ۱۲۰۰ھ) کربلا چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ وہی حکیم محمد سمیع ذرّہ ہیں، جن کی یہ رباعی بہت مشہور ہے:-

گر ما بگذشت وایں دلِ زار ہماں   سر ما بگذشت وایں دلِ زار ہماں

القصّہ ہزار گرم و سردِ عالم   بر ما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں

خان علاّمہ تفضّل حسین خان (ف ۱۸۰۱ء) بھی اسی خاندان سے تھے۔

حکیم محمد سمیع ذرّہ کے بیٹے حکیم میرزا علی خان جو والد ہی کے ساتھ کربلا گئے تھے، ان کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے، یہاں انھیں شاہی میں حکیم الملک کا خطاب ملا اور بڑا عروج پایا۔ انھیں کی اولاد میں اثرؔ مرحوم کے والدِ بزرگوار حکیم میرزا افضل حسین خان تھے۔

اثرؔ اپنے خاندانی مکان کٹرہ ابوتراب خاں (لکھنؤ) میں ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے، منہ میں روایتی چاندی کا چمچہ نہیں، سونے کا چمچہ لیے ہوئے بڑے ہوئے حالات کے اقتضا سے خاندان کی روایات کے برخلاف، ان کی تعلیم مغربی طرز پر ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں بی اے کی سند لی؛ ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے اور ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر اور دوسرے ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۳۵ء میں کلکٹری پر منتقل ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں پنشن کے بعد اولاً کشمیر میں وزیر مال اور پھر وہیں چندے وزیرِ اعظم بھی رہے۔ خدماتِ جلیلہ کے لیے حکومت کی طرف سے ۱۹۳۶ء میں خطاب خان بہادر اور ۱۹۳۹ء میں ایم بی ای، ملا۔ ۱۹۲۴ء میں زیاراتِ مقاماتِ مقدّسہ کی غرض سے عراق کا سفر کیا۔

۶ جون ۱۹۶۷ء بوقتِ صبح رہ گرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ اسی شام جنازہ اٹھا اور کربلائے خدا بخش (تال کٹورہ) میں دفن ہوئے۔

شاعری کا شوق اوائل سے تھا اور اس میں میرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی (ف ۱۹۳۵ء) سے تلمّذ رہا۔ عزیزؔ کے بعض دوسرے شاگردوں کے افسوسناک رویے کے برعکس

اثرؔ آخر تک استاد کے احسانات کے معترف رہے۔ کٹرۂ ابوتراب کی سکونت سے ان کا خاندان اپنی زباندانی کے باعث "ثقاتِ کٹرہ" کے عرف سے مشہور تھا۔ اثرؔ کو بھی زبان و بیان اور فنِ شعر میں غیر معمولی مہارت اور قدرت حاصل تھی، جس کی شہادت ان کی تالیف "فرہنگ اثر" سے بھی ملتی ہے۔ اس میں انھوں نے نور اللغات کی تعمیری تنقید اور اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب پر انھیں یوپی حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔ حکومتِ ہند نے انھیں خطاب 'پدم شری' سے نوازا تھا۔

ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "چھان بین" اور "اثر کے تنقیدی مضامین" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ غالبؔ کے کچھ اشعار کے مطالب "مطالعۂ غالب" کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ انیسؔ سے متعلق بھی ایک مجموعۂ مضامین "انیسؔ کی مرثیہ نگاری" کے نام سے ہے۔ ان کی غزلیات کے چار مجموعے شائع ہوئے: اثرستان، بہارستان، بہاراں، نو بہاراں، ایک جلد (عروسِ فطرت) میں نظمیں ہیں۔ ایک اور مجموعہ "لالہ و گل" کے نام سے بھی چھپ چکا ہے۔ لکھنوی ہوتے ہوئے بھی وہ میرؔ کے عاشق تھے؛ انھوں نے اس کے کلیات کا ایک نمائندہ انتخاب بھی مزامیر کے نام سے کیا، جو دو حصوں میں چھپ چکا ہے۔ دوسری زبانوں کے نظموں کے تراجم اور مختارات کا ایک مجموعہ (رنگ بست) بھی ان سے یادگار ہے۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ "نغمۂ خداوندی" کے نام سے کیا تھا۔ دو ڈرامے۔ زنگاری بیگم (منظوم) اور ہلاک فریب۔ بھی چھپ چکے ہیں۔ پہلا فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہے، دوسرا پولستانی مصنف سگمنڈ کرانسکی کے ڈرامے کا آزاد ترجمہ

غرض شعر و ادب اور علم و فن میں ان کی تحریریں وقیع اور پائیدار حیثیت

کی مالک اور ہماری ادبی تاریخ کا قابلِ قدر حصہ ہیں۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

کتنے ہی شکوے زباں پر آئے، آ کر رہ گئے
کچھ نہ کہتے بن پڑا، گردن جھکا کر رہ گئے

کیسی تسکیں، بیقراری میں اضافہ ہو گیا
ہاتھ وہ نزدیک دل کے لائے، لا کر رہ گئے

اور جو کچھ ہو) یہ اندھیر نہ ہونے پائے
یاس امید کا بیڑا نہ ڈبونے پائے

تسلی کی یہ باتیں ہیں کہ تڑپانے کی باتیں ہیں
خموشی، پھر تبسّم، پھر خطاب آہستہ آہستہ

محبت، راہ کرتی ہے یونہی محبوب کے دل میں
کہ جیسے نشہ کرتی ہو شراب آہستہ آہستہ

جنالوں نے اثر کے پھر ہنگامہ کیا برپا
منہ پھیر کے پھر کہہ دو "دیوانے کو کیا کہئے"

تری گفتگو جو سن لے، تو ہو موج موج رقصاں
وہ ہے کیف خامشی میں کہ ہو غرقِ مے ترنّم

کیا جانیے، کس نے اسے یہ بات سکھا دی
جب تم کو پکارا ہے، مرے دل نے صدا دی

محبت اور اظہارِ محبت
یہی تو بات ہے دیوانے پن میں

دل کا ہے رونا، کھیل نہیں ہے، منہ کو کلیجا آنے دو
تھمتے ہی تھمتے، اشک تھمینگے، ناصح کو سمجھانے دو

کتنے ہی کتنے حال کہینگے الیسی ابھی نہیں جلدی کیا ہے؟

دل تو ٹھکانے ہونے دو، اور آپ ہیں ہم کو آنے دو

شکوہ کیا از راہِ الفت، طنز سمجھ کر روٹھے ہو
ہم بھی ہیں نادم اپنی خطا پر، آؤ تم بھی جانے دو

صورتِ منزل کیا نظر آئے، ثبت ہیں دل پر نقشِ خودی
عقل ہے دشمن نفس ہے رہزن، ٹھوکریں کچھ تو کھانے دو

دل کو اثر کے لوٹ لیا ہے، شوخ نگہ اک کافر نے
کوئی نہ اس کو رونے سے روکو، آگ لگی ہے بجھانے دو

ظہورِ عشقِ حقیقت طراز تھی ورنہ یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرنا راتوں کو
جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں، عشق و جنوں کی باتوں کو

بات یہ اور ہے، شوق کے ہاتھوں، خونِ دلِ عاشق ہو جائے
کام نہیں کچھ خونریزی سے، تیرے خالی ہاتھوں کو

کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے، کیسی کیسی مہر و وفا
تلخ اگر سن سکتے نہیں، تو کیوں چھیڑو ان باتوں کو

ہونہ ہو، سب اپنی بیتی، لاکھ کرو انکار، اثر!
نیند آنکھوں کی اڑاتے ہو، کہہ کہہ کے فسانہ راتوں کو

دل کہ ہلاکِ شوق تھا، اب ہے حسن کی دنیا، کیا کہنا!
جوشِ طرب ہے، ترکِ طلب میں، ترکِ طلب کا کیا کہنا

آئینہ دارِ عشرتِ دریا، قطرہ بھی مثلِ دریا ہے
کیسی جدائی، وصل کہاں کا، ایک ہے نقشا، کیا کہنا

حیف اثرؔ کا کھویا سا رہنا، اور کبھی جو بات بھی کی
طنز ہے تیرا ہنس کر کہنا: "آپ کی سننا، کیا کہنا!"

آغازِ محبت کی لذت، انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو مسو سے رہتے تھے، اب ہاتھ لگانا مشکل ہے

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے
آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

حیف تمہیں فرصت ہی نہیں ہو، ورنہ کیا کیا حسرت تھی
حال ہمارا سن لیتے، اور اپنا حال سناتے تم

جان کو روگ ہیں دنیا بھر کے
ہم تو پچھتائے محبت کر کے

سوئے مستقبل رواں ہو شہپرِ دل پر حال کے
بھول جا ماضی کو، لاشِ کہنہ اک مدفن میں ہے

زینہ، بامِ کامیابی کا، ہیں یہ ناکامیاں
سعی سے باز آنہ ہرگز جان جب تک تن میں ہے

اپنی ہستی محو کر دے کشت زارِ جہد میں
بارور ہوتا نہیں وہ دانہ، جو خرمن میں ہے

دل میں ہمت ہو اگر، اور استواری عزم میں
موم سے بھی بڑھ کر اثرؔ! گداز آہن میں ہے

کسی کا ہائے، یہ کہنا اثرؔ سے وقتِ وداع
جو ہو سکے، تو ہمیں دل سے تم بھُلا دینا

حال بھی اپنا سناؤ نگا تمھیں
اک ذرا دل تو ٹھہر جانے دو

دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی
تم کو خبر نہیں، جو تمھاری نظر میں ہے

نہیں شرط ابتدا کی، نہیں قید انتہا کی
ہے لطیف قصۂ غم، اسے چھیڑ دو جہاں سے

برق شرمندہ اُدھر، میں ہوں پشیمان اِدھر
چار تنکوں کے سوا، خاک نشیمن میں نہیں

ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں
ورنہ آلودہ جبینِ بندگی ہو جائیگی

جوشش رہنا ہے بس اتنا دمِ تحریکِ جنوں
جیسے چھینے لیے جاتا ہے گریباں کوئی

اس قدر بے اعتباری پر ہے اتنا اعتبار
بیوفا! یہ تیرے وعدے میں عجب تاثیر ہے

اک بات بھلا پوچھیں، کس طرح مناؤ گے؟
جیسے کوئی روٹھا ہے، اور تم کو منانا ہے

دیکھنا ظرف کہ باوصف ہزاراں مستی
راز میخانے کا محفوظ ہے میخانے میں

آکے ذرا میری قسم آزما
تجھ سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو

ہنگامۂ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے
اک موج تھی، جو اٹھ کر پھر مل گئی دریا میں

نذر سجاد حیدر

نذر سجاد حیدر جنھیں کسی نے اردو کی جین آسٹن کہا ہے، اتر پردیش کے ایک قدیم زمیندار گھرانے کی نام لیوا تھیں۔ ان کے پر دادا میر معصوم علی (مصنف انشائے معصوم) سلطنت اودھ میں ناظم او رچکلہ دار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے پنجاب کا نظم ونسق چلانے کے لیے جن اصحاب کا یو پی سے انتخاب کیا تھا، ان میں میر معصوم علی کے صاحبزادے خان بہادر میر قائم علی بھی تھے۔ انھوں نے پنجاب کے قانونِ اراضی کی تشکیل اور تنظیم میں نمایاں حصہ لیا۔ میر قائم علی کے پوتے اور میر مظہر علی کے بیٹے خان بہادر میر نذر الباقر مدتوں فوج کے رسد (سپلائی) کے محکمے میں ایجنٹ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں تعینات رہے۔ یہیں ان کے ہاں ۱۸۹۴ء میں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے نذر زہرا بیگم رکھا۔ یہ لڑکی اپنے خاندانی ماحول کے اثرات کے تحت بہت جلد لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئی؛ اور اس کے مضمون بنت نذر الباقر کے قلمی نام سے

سید ممتاز علی مرحوم کے ماہانہ رسالے تہذیب نسواں میں چھپنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں جب اس کی عمر مشکل سے ۱۴ سال کی ہوگی، اس کا پہلا ناول "اختر النسا بیگم" دارالاشاعت، لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

تہذیب نسواں کے علاوہ ان کے مضمون بچوں کے ہفتہ وار پھول اور دوسرے رسائل میں بھی شائع ہو رہے تھے۔ ان کا معیار اتنا بلند تھا کہ مصنفہ کی دھوم مچ گئی۔ شدہ شدہ اس کی اطلاع نواب بیگم بھوپال تک پہنچی، اور انھوں نے انھیں اپنا سکریٹری مقرر کرنے کی دعوت دی؛ لیکن میر نذر الباقر نے اپنی ساری روشن خیالی کے باوجود بیٹی کو یہ ملازمت قبول کرنے کی اجازت نہ دی۔ میر نذر الباقر عورتوں کے روایتی پردے کے قائل نہیں تھے؛ لہذا ان کے گھر میں بھی اس کا رواج نہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی بچیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیا، وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ لڑکیاں شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر جہاں چاہیں اکیلی پھرتی رہیں۔

۱۹۱۲ء میں نذر زہرا بیگم کی شادی سید سجّاد حیدر یلدرم سے ہو گئی، جو اردو ادب میں رومانی افسانے اور مضمون نگاری کے بانیوں میں سے ہیں۔ یلدرم انگریزی ملازمت کے سلسلے میں بہت دن تک قسطنطنیہ اور بغداد میں مقیم رہے تھے اور وہاں سے واپسی پر امیر کابل کے نائب پولیٹکل ایجنٹ مقرر ہو کر مسوری میں رہنے لگے تھے۔ جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی تو وہ ۱۹۲۰ء میں اس کے پہلے رجسٹرار (مسجل) مقرر ہوئے۔ شادی کے بعد نذر زہرا بیگم نے اپنا قلمی نام نذر الباقر بدل کر نذر سجّاد حیدر رکھ لیا۔ انھوں نے ہر طرح یلدرم کا ہاتھ بٹایا۔ یونیورسٹی فنڈ میں چندہ جمع کرنے کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؛ بلکہ وہ اس کی یو۔پی کی صوبائی شاخ کی سکریٹری بھی

رہیں۔ پھر کھدر پرچار میں پوری گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی کی تھی۔ اس کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ انھوں نے "اختر النسا بیگم" کے علاوہ اور بھی متعدد ناول لکھے، جن میں سے حرماں نصیب، آہِ مظلوماں، نجمہ، جانباز، ثریا، مذہب اور عشق وغیرہ نے خاصی شہرت حاصل کی۔

انھیں ۲۰۔۲۵ برس سے فشارِ دم (ہائی بلڈ پریشر) کا عارضہ تھا؛ ۱۹۶۱ء میں علاج کے لیے لندن بھی گئی تھیں۔ عمر کے ساتھ کچھ اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ آخر ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ اثنا عشری آرام گاہ، رحمت آباد (بمبئی) میں دفن ہوئیں۔

اس سلسلے میں دو ایک اور باتوں کا ذکر دل چسپی کا باعث ہوگا:-

نذر سجاد حیدر کے دادا میر مظہر علی سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے۔ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد (عرف میاں نتھو) ان کے گھر پر بیٹھ کر کپڑے سینے اور رفو کا کام کیا کرتے تھے۔ اقبال اپنی طالب علمی کے زمانے میں میر مظہر علی کے تینوں بیٹوں کے ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ اقبال نے اپنے خطوں میں نذر سجاد حیدر کو 'آغازادی' کے لقب سے خطاب کیا ہے۔

اردو کے ایک مصنف میر افضل علی ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب "تخیلات" آج سے ۴۰۔۵۰ برس پہلے اچھی خاصی مشہور رہی ہے۔ وہ کسی زمانے میں پنجاب میں انکم ٹیکس کے محکمے میں ملازم تھے۔ اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ نسبتاً جوان عمری میں ان کا ۱۹۳۷ء میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت وہ غالباً لاہور میں اڈیشنل انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے

احمدی تھے۔ تو خیر، میر افضل علی، مرحومہ نذر سجاد حیدر کے ماموں زاد (اور پھوپھی زاد) بھائی تھے، اُن کی والدہ اکبری بیگم اِن کی پھوپھی تھیں میر افضل علی کی شادی ثروت آرا بیگم یعنی نذر سجاد حیدر کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی۔ خود اکبری بیگم کا مشہور ناول "گودڑ کا لال" غالباً ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔

قرۃ العین حیدر جنھیں امسال (۱۹۶۷ء) افسانوں کے مجموعے "پت جھڑ کی آواز" پر ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا ہے، نذر سجاد حیدر کی صاحبزادی ہیں۔

علی بہادر خان، حافظ

ان کا خاندان مراد آباد کا رہنے والا تھا۔ علی بہادر خان ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا ان کی بہت کم عمری میں انتقال ہوگیا، جب کہ ہنوز ان کی تعلیم شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے ان کی تربیت کا بار بڑی مردانگی سے اٹھایا اور انھیں اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ان کا تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ دسویں درجے میں صوبے بھر کے اولین دس طلبہ میں تھے؛ وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ پہنچے؛ ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ان کے معاصر تھے۔ یہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی ایس سی کی امتیازی سند لی۔ ایم ایس سی میں تعلیم پا رہے تھے کہ ملک میں قومی تحریک اور عدم تعاون کے ہنگامے میں کالج کو خیر باد کہہ دیا، اور کانگریس اور خلافت کے سرگرم رکن بن گئے۔

اب انھوں نے صحافت کی طرف رخ کیا۔ "تاج" جبلپور اور "مدینہ" بجنور اور "نصرت" بمبئی کی ادارت سے وابستہ رہے، اور اس میں اتنی کامیابی حاصل

کی کہ مرکزی جمعیتِ خلافت کے اخبار خلافت بمبئی کی ادارت ان کے سپرد کردی گئی۔ اس عہدے پر چار برس تک کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ہفتے وار "اتحاد" اور خواتین کے لیے "معین نسواں" جاری کیے۔ اسی کے ساتھ روزنامہ "ہلال" جاری کیا، جو آج تک زندہ ہے۔ اسی دوران میں قید وبند کے ابتلا سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

وسیع معلومات کے مالک تھے اور متعدد زبانیں جانتے تھے۔ قلم میں زور تھا اس لیے ان کی تحریر سے وثوق اور وقار کا اظہار ہوتا تھا۔ صحافتی سرگرمیوں کے علاوہ بعض کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔ مثلاً محمود غزنوی، حکومت الٰہیہ، پردہ اور اسلام، ترکی زبان وغیرہ۔ بعض انگریزی کتابیں اور مختصر رسالے بھی شائع ہوئے؛ انگریزی میں بعض پرچے بھی چھاپے۔ وفات سے پہلے اردو ہفتے وار "دورِ جدید" کے اڈیٹر تھے۔

حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے ۵/۶ نومبر ۱۹۶۷ کی درمیانی شب دلی میں انتقال کیا۔ اگلے دن جنازہ اٹھا اور جسدِ خاکی فیروز شاہ کوٹلہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ تخلص ہلالؔ تھا۔ ایک غزل کے چند شعر دیکھیے:

ستم سے کھیلنے والے، جفا سے کھیلنے والے
جفا تو کیا، مسلماں ہیں قضا سے کھیلنے والے

مسلماں خاک و خوں میں جان پر کھیلے ہیں دنیا میں
خبر بھی ہو تجھے، رقص و غنا سے کھیلنے والے!

جہادِ زندگی ہے کس قدر مجموعۂ اضداد
بقا کا لطف پاتے ہیں، فنا سے کھیلنے والے

تعجب کیا، بنائیں بجلیوں میں آشیاں اپنا
چمن میں جلوۂ برق و فنا سے کھیلنے والے

کبھی تو خاک و خوں میں جان پر کھیلے، تو ہم جانیں
خدا کے نام پر، ابر و دریا سے کھیلنے والے!

وہی منزل پہ بڑھتے ہیں، وہی ساحل کو پاتے ہیں
سفینے جو ہیں گرداب بلا سے کھیلنے والے

شکستہ ہو ربابِ زندگی، ٹوٹی ہوئی مضراب گر
تو ہیں کیا، ہم ہیں سازِ بے نوا سے کھیلنے والے

ہلالؔ! ان کو ملے گا لطف جینے اور مرنے کا
جہادِ حق میں جو ہوں گے قضا سے کھیلنے والے

مہاشہ سدرشن، بدری ناتھ

منشی پریم چند کی افسانہ نگاری نے بہت لوگوں کو متاثر کیا، لیکن غالباً مہاشہ سدرشن اور اعظم کریوی کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ اعظم کریوی کو ہم سے جدا ہوئے بہت دن ہوئے۔ مہاشہ سدرشن کا بھی ۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ کو ہری کرشن داس ہسپتال، بمبئی میں انتقال ہو گیا۔

مہاشہ سدرشن کا اصلی نام بدری ناتھ تھا۔ وہ ۱۸۹۶ء میں ضلع سیال کوٹ کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ شروع سے طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل تھی۔ کہتے ہیں کہ جب ان کا پہلا افسانہ چھپا ہے، وہ ہنوز آٹھویں درجے کے طالب علم تھے۔ بی اے تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد انھوں نے دو چیزوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ آریہ سماج تحریک اور افسانہ نویسی، اور بعد کو یہ شوق محض افسانہ نویسی تک محدود ہو گیا۔ اس کی تکمیل اور تسکین کے لیے انھوں نے ماہنامہ چندن جاری کیا تھا، جس میں صرف افسانے چھپتے تھے۔

ان کی شہرت میں اب روزافزوں ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ فلنکس کمپنی والوں نے

پبلسٹی کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لیں، یہاں وہ چار سو مشاہرہ پاتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے فلم کے لیے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلے میں وہ چندے بھارت لکشمی پکچرز (کلکتہ) اور نیو تھیٹرز (کلکتہ) سے وابستہ رہے۔ آخر الذکر کی فلم "دھوپ چھاؤں" کی کہانی کے علاوہ گانے بھی انھیں نے لکھے تھے۔ اس کے گیت: دنیا رنگ رنگیلی بابا، اور پیتری گٹھری میں لاگا چور بہت مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی بھی انھیں اپنی مجلسوں میں سنا کرتے تھے۔ ہر دلعزیز گلوکار سہگل کا ایک گیت: "اب میں کیا کروں، کت جاؤں بہت مشہور رہے، یہ بھی سدرشن نے لکھا تھا۔ انھوں نے تقریباً ۵۴ فلموں کی کہانیاں، گیت اور مکالمے لکھے۔ ان میں دھوپ چھاؤں، پتھروں کا سوداگر دشمن، گراموفون سنگر، پردیسی، سکندر، پڑوسی، چندر ریکھا وغیرہ بہت کامیاب رہیں۔

مہاشہ سدرشن نے اپنی تصنیفی زندگی اردو سے شروع کی تھی، لیکن بعد کو وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے تھے؛ اور رفتہ رفتہ صرف ہندی کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن اردو افسانے کے ارتقا میں ان کا حصہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں ان کے کہانیوں کے چار مجموعے شائع ہوئے: سدا بہار پھول، چندن، بہارستان اور سولہ سنگھار۔ اس کے علاوہ انھوں نے مشہور بنگالی ناول نویس بنکم چندر چیٹرجی کے دو ناول 'تازیانے' اور زہریلا آب حیات' کے نام سے اردو زبان میں منتقل کیے تھے۔ ایک اور ناول 'عورت کی محبت' بھی بنگالی سے ترجمہ کیا تھا۔ بے گناہ مجرم، بعض بنگالی اور فرانسیسی ناولوں پر مبنی تھا۔ ہندی میں ان کی تقریباً بیس کتابیں ہیں۔

سراج لکھنوی، سراج الحسن

سراج الحسن سراج کہنے کو تو لکھنوی شاعر تھے۔ لیکن ہے یہ کہ ان کے ہاں لکھنؤ کی خارجیت سے زیادہ دلّی کی داخلیت ملتی ہے۔ انھوں نے پیارے صاحب رشید اور ان کے بھائی باقر رضا حمید۔ دونوں سے اصلاح لی اور خود استادی کا درجہ حاصل کیا۔ لکھنؤ میں ان کے بہت شاگرد ہیں۔

سراج کا خاندان قدیمی کسڑہ مانکپور کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے والد شیخ نور الحسن نقلِ مکان کر کے لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ یہیں ۱۸۹۴ء میں سراج پیدا ہوئے۔ انگریزی میں دسویں درجے تک تعلیم چرچ مشن ہائی اسکول لکھنؤ میں پائی۔ اور اس کے بعد محکمۂ امدادِ باہمی (کواپریٹو سوسائٹیز) میں ملازم ہو گئے۔ ساری عمر اسی محکمے میں گزری اور یہیں سے ۱۹۴۶ء میں پنشن پائی۔ کنبہ خاصا بڑا تھا۔ تنخواہ بھی قلیل رہی، اور پنشن تو ظاہر ہے کہ قلیل تر ہونا ہی چاہیے تھی۔ اس لیے عسیر الحالی میں بسر ہوتی، کبھی خوش حالی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

انھوں نے ۱۹۰۸ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ اردو کا یہ مشہور شعر انھیں کا ہے:

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

کلام میں غزلیات کا انتخاب "شعلۂ آواز" کے عنوان سے ۱۹۶۰ء کے قریب شائع ہوا تھا۔ بہت سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ کسی زمانے میں وہ لکھنؤ کی ادبی انجمن 'معراج الادب' سے وابستہ رہے؛ بلکہ اس کے ایک سکریٹری تھے، صدر حکیم آشفتہ تھے۔ لیکن بعد کو جب اس کے اراکین میں باہم شدید اختلافات پیدا ہوئے، تو سراج اس سے الگ ہوگئے اور بہار لکھنوی کی قائم کردہ انجمن 'بہار ادب' میں شامل ہوگئے۔ وہ مدتوں اس کے بھی سرگرم رکن رہے۔ بہت خاموش اور مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی؛ جذبات کی رو میں نہیں بہ جاتے تھے۔ جس زمانے میں پورا لکھنؤ یاس یگانہ کے خلاف تھا اور کسی کی جرأت نہیں تھی کہ عزیز اور ان کے دوستوں کو ناراض کرکے یگانہ کے حق میں کلمۂ خیر کہے، سراج نے یگانہ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

تندرستی کبھی تسلی بخش نہیں رہی، فشارِ دم کے دائمی مریض تھے۔ بالآخر اسی سے ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء صبح ساڑھے آٹھ بجے جاں بحق ہوئے۔ عیش باغ کے قبرستان میں آخری آرام گاہ بنی۔

اب کچھ شعر دیکھیے، جو ان کے مجموعۂ کلام شعلہ آواز سے ماخوذ ہیں:

مری فنا بھی ہو تکمیلِ آرزوئے حیات
کہ خاک تو ہوں، مگر خاکِ کوئے یار ہوں میں

ہو خوابِ عدم، زلفِ سیاہ فام نہیں ہو
اس شام کے بعد اور کوئی شام نہیں ہو

روشنی کرتا ہوں کم، شمع جلاتا ہوں کبھی
چاہتا ہوں کہ سرِ شام سحر ہو جائے

نصیحتیں تری ناصح! بامرے سر آنکھوں پر
جو خود کسی کو ضرورت ہو دل لگانے کی

جفا بھی کرتے ہیں، احسان بھی جتاتے ہیں
کہ جیسے ہم کو غرض ہو ستم اٹھانے کی
وہ سنگِ راہ سہی، سنگِ آستاں نہ سہی
صلاحیت بھی تو ہو، قسمت آزمانے کی

کیا کہوں، حضرتِ ناصح! نہیں حاضر ہے دماغ
پھر کسی دن نہ چلے آئیے، سمجھانے کو!

اب آگے دیکھیے تقدیر کیا دکھاتی ہے
قفس تک آ کے تو پہنچا گئی بہار مجھے
پروں سے منہ کو چھپائے قفس میں بیٹھا ہوں
یہ شرم ہے کہ نہ پہچان لے بہار مجھے

نشیمن منتشر، صیاد دشمن، پھول بیگانے
قفس کے رہنے والو! آج ہی کل میں بھی آتا ہوں

چہرہ اداس، آنکھوں میں آنسو، لبوں پہ آہ
سب رنگ پھیکے پڑ گئے، دل ٹوٹنے کے بعد

اب مجھے "نامرادِ زیست" کہہ کے پکارتے ہیں لوگ
سب نے سمجھ لیا ہے یہ جیسے مرا خدا نہیں

تجھ سے بہت ملا مجھے، تو نے بہت دیا مجھے
اب تجھے مانگتا ہوں میں، اب کوئی حوصلا نہیں

باتیں بھی بیوفا کی بہت دل فریب ہیں
کچھ رنگ بھی بھرا ہے مرے اعتبار نے

ہر پنکھڑی پہ کھینچ دی، جیسے تری شبیہ
کتنا حسین فریب دیا ہے بہار نے

یہ مقامِ عشق ہے کونسا، یہ ہیں کیسی صبر کی منزلیں
نہ تڑپ ہو دل میں، نہ درد ہے، نہ سکون ہے نہ قرار ہے

یہ صدا تو ہے وہی دُکھ بھری، مرے کان جس سے ہیں آشنا
ذرا چپ رہو، مجھے سننے دو! یہ تو میرے دل کی پکار ہے

حقیقت میں بندہ بھی بننا نہ آیا سمجھتے تھے دل میں، خدا ہو گئے ہم
قیامت تھا تجھ سے نگاہوں کا ملنا زمانے سے نا آشنا ہو گئے ہم

خوشا وہ دور کہ جب مرکزِ نگاہ تھے ہم
پڑا جو وقت، تو اب کوئی رُو شناس نہیں

ہوا ہے رفتہ رفتہ یوں کسی کا سنگِ در اپنا
بجائے کتنی دہلیزوں سے ٹکرایا ہو سر اپنا

لبوں پہ خشکی، نظر میں حسرت، جو بات تھی ترجمانِ دل تھی
اسی تکلف میں رہ گئے ہم، وہ حال پوچھیں تو ہم بتائیں

غم کا خوگر ہو کہ یہ چیز ہے رہنے والی دل کو مانوس نہ کر عیش کے سامانوں سے

آفتاب پانی پتی، انوپ چند

۱۳ اپریل ۱۸۹۶ء کو بیساکھی کے موسمی تیوہار کے دن پانی پت کے ایک کھاتے پیتے جین خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کی، تو یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں چکبست اور سرور کی قومی شاعری کا غلغلہ ہر طرف بلند ہو رہا تھا۔ اس سے انھیں بھی شعر گوئی کی طرف توجہ ہوئی۔ اتفاق سے انھیں ایام میں مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی روزنامہ زمیندار (لاہور) کی ملازمت ترک کر کے اپنے وطن واپس آ گئے۔ آفتاب نے ان سے اصلاح کی درخواست کی، جو قبول ہوئی۔ یہ سلسلہ سلیم کی وفات (۱۹۲۷ء) تک جاری رہا۔

آفتاب کو غزل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی؛ انھوں نے زیادہ تر نظمیں کہی ہیں، اور وہ بھی بیشتر قومی اور سیاسی۔ ان کے منظومات کے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں: جلوۂ آفتاب، آفتاب وطن، جذبات وطن، جذبات کی دنیا، حب وطن، شمشیر وطن۔ زبان سلیس اور بیان جذبات سے مملو ہے۔ منظومات کے علاوہ انھوں نے بعض ڈرامے بھی تصنیف کیے تھے۔ ان میں سے مَن موہنی،

شریمتی انجنا دیوی، ہندوستانی سورما، دیر چھیترانی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی قومی و ادبی خدمات کے پیشِ نظر حکومتِ ہریانہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو انھیں 'راج کوی' کا اعزاز عطا کیا تھا۔

۹ فروری ۱۹۶۸ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے پانی پت ہی میں انتقال ہو گیا۔ یہاں چند شعر ان کے مجموعے "جذبات کی دنیا" (دلی ۱۹۵۹) سے انتخاب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں:۔

کٹنے کو کٹ گئے ہیں ایام زندگی کے
ناقابلِ بیاں ہیں آلام زندگی کے

رو رو کے شب گزاری دن بھر رہے پریشاں
یہ غمزدوں نے دیکھے آرام زندگی کے

اے ہمنشین! مجھ سے کیا حال پوچھتا ہے
پُر درد ہیں فسانے، ناکام زندگی کے

سمجھا تھا باغِ عالم کو راحتوں کی جا ہے
جب تک نظر نہ آئے تھے، دام زندگی کے

امید تھی کہ جن سے آرام ہوگا حاصل
کچھ بھی نہ کام آئے، وہ کام زندگی کے

اشکوں سے اور آہوں سے تازہ کر رہا ہوں
کچھ واقعات پُر غم ناکام زندگی کے

ہوش و حواس جب سے کھوئے ہیں رنج و غم نے
پیغام موت کے ہیں، پیغام زندگی کے

کس کو ہوئی میسّر، اے آفتابؔ راحت
پُر بادۂ الم سے، ہیں جام زندگی کے

کبھی روتا ہے پہروں، اور کبھی فریاد کرتا ہے
حقیقت میں یہ اک تصویرِ غم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

نگاہِ مہر ڈالیں، یا چلائیں ظلم کے خنجر
دلِ مظلوم پر ان کا کرم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

کروں فریاد گر ہو حکم، ورنہ گھٹ کے مر جاؤں
محبت میں سرِ تسلیم خم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

قفس میں بند کر دے، یا مجھے آزاد رہنے دے
مری تقدیر میں سوزِ الم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

رہوں خاموش، تو مشکل؛ کروں فریاد، تو مشکل
مرے نازوں پلے دل پر ستم یوں بھی ہو اور یوں بھی

مزا جب ہو کہ قصّہ میرا، تو خود پاک کر ڈالے
مجھے مرنا، ترے سر کی قسم! یوں بھی ہو اور یوں بھی

کبھی فرقت کا کھٹکا ہے، کبھی غیروں کی اُلفت کا
مریضِ عشق کا آنکھوں میں دم یوں بھی ہو اور یوں بھی

نہ راحت مفلسی میں ہے، نہ دولت میں خوشی دیکھی
سروں پر فکر کی تیغِ دو دم، یوں بھی ہو اور یوں بھی

کبھی یہ نظم لکھتا ہے، کبھی یہ نثر لکھتا ہے
رواں اے آفتاب! اپنا قلم یوں بھی ہو اور یوں بھی

اپنی حالت کے بدلنے کا ہے گر تم کو یقیں
گردشِ دہر ہے تیار بدلنے کے لیے

چاہتا ہوں کہ کہوں حالِ محبت ان سے
دل یہ کہتا ہے کہ افسانۂ غم یاد نہیں

آدمی کے لیے اچھا نہیں غافل ہونا
وہ بھی کیا ہے جسے مرنے کی گھڑی یاد نہیں

محمد عبدالباقی

اردو کے ممتاز صحافی مولانا محمد عبدالباقی کا بروز جمعہ ۲۳ فروری ۱۹۶۸ء ساڑھے پانچ بجے شام دلّی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک زمانے سے اختلاجِ قلب کے مریض تھے۔ ۲۱ فروری کو مرض کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر انھیں ہمدرد نرسنگ ہوم (دلّی) میں داخل کیا گیا، جہاں دو دن بعد حرکت قلب بند ہو جانے سے رہ گرائے عالم جاودانی ہوئے۔ اگلے دن ۲۴ فروری کو جنازہ اٹھا۔ نمازِ جنازہ قاضی زین العابدین سجّاد استاد جامعۂ ملیّہ اسلامیہ نے پڑھائی اور انھیں جامعہ نگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا محمد عبدالباقی کوانتھ، ضلع شاہ آباد (بہار) کے ایک پٹھان خاندان میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ یہ جگہ شیر شاہ سوری کی جائے ولادت سہسرام سے کوئی دس بارہ میل دور پٹھانوں کی مشہور بستی ہے۔ ان کے والد عبدالسلام صاحب فوج میں ڈاکٹر تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور پہنچے اور سیدھے مولانا ظفر علی خاں کے روزنامہ زمیندار کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ یہاں

الگ ہوئے، تو صدیق حبیب اور محفوظ الحق (جامعی) کے تعاون سے روزنامہ "آزاد" نکالا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں اس شان اور اہتمام سے کوئی روزنامہ آج تک نہیں چھپا۔ افسوس کہ یہ چشم حوادث کا شکار ہو گیا! اس معیار کے اخبار کے اخراجات کے لیے جس قارون کے خزانے کی ضرورت تھی، وہ باقی صاحب اور ان کے دوستوں کے پاس تھا نہیں؛ چنانچہ چند ماہ بعد پرچہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بہار چلے گئے اور پٹنے سے "استقلال" جاری کیا، جو ہفتے میں دو بار چھپتا تھا۔ جب ۱۹۳۶ء میں کانگریس نے سری کرشن سنہا کی قیادت میں بہار میں پہلی وزارت بنائی، تو باقی صاحب اس میں مفصلات کے لیے پبلسٹی افسر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں جمیل مظہری اور رام دھاری سنگھ دنکر بھی اسی محکمے میں ملازم تھے۔ جب سری کرشن سنہا کی وزارت مستعفی ہوئی، تو یہ لاہور پہنچے۔ اتحاد پارٹی کے اکابر سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ خضر حیات خان ٹوانہ نے انھیں اپنے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کا ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر کر دیا (ڈائرکٹر نور احمد صاحب تھے)

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد وہ دلی آئے اور "پیام وطن" کے نام سے اپنا روزنامہ شائع کرنے لگے۔ یہ پرچہ کوئی تین چار برس جاری رہا۔ اس کے بند ہو جانے پر وہ ریاست کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن یہاں کی فضا راس نہ آئی، اور انھیں دلی واپس آنا پڑا۔ یہاں مختلف رسائل و جرائد میں مضمون لکھ کر بسر اوقات کے لیے کچھ پیدا کر لیتے تھے۔ آخری ایام میں اپنا ایک ہفت روزہ "کاروان ہند" شائع کرتے تھے، اور اس کے علاوہ متعدد دوسرے پرچوں میں بھی اجرت پر مضمون لکھتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ بلند پایہ صحافی تھے ——— وسیع معلومات، زور قلم،

قوتِ استدلال، ان کی تحریر کا طرّۂ امتیاز تھے۔ لیکن افسوس کہ عدم استقلال اور مزاج کے لاابالی پن نے کہیں جم کر کام نہ کرنے دیا، اسی لیے بیشتر زمانہ افلاس اور تکلیف میں بسر ہوا۔

صولت ٹونکی، محمود الحسن عرب

محمود الحسن نام تھا، لیکن چوں کہ قوم کے عرب تھے، اس لیے عام طور پر محمود الحسن عرب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے والد سیّد حامد عرب، نواب ابراہیم علی خاں بہادر کے عہد میں ٹونک وارد ہوئے۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی۔ نواب صاحب نے دو گاؤں "جاید اد اہل عرب" کے نام سے وقف کر رکھے تھے؛ ان سے عرب مہمانوں کو تحفے تحائف اور نذرانے دیے جاتے تھے۔ انھوں نے سیّد حامد کو 'معرفِ عرب' نامزد کرکے اس جایداد کا منصرم بنا دیا۔

یہیں ٹونک میں ۱۳۱۳ھ میں سیّد حامد کے ہاں محمود الحسن پیدا ہوئے، تو نواب وزیر الدولہ مرحوم کی صاحبِ دل اور نیک بہو (صاحبزادہ عبداللہ خان کی بیوی) رقیّہ بیگم نے نومولود کو اپنا متبنّیٰ بنا لیا۔ چنانچہ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی اور وہ شاہی خاندان کے صاحبزادگان کے ساتھ پروان چڑھے۔ تعلیم کا معیار بھی بلند رہا؛ مختلف اساتذہ سے جملہ درسیات

پر عبور اور ان میں پوری مہارت حاصل کی۔
نواب ابراہیم علی خان شاعر تھے، خلیل تخلص تھا۔ بعض اساتذۂ عہد ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ سلیمان خان اسد لکھنوی، احمد حسین بسمل خیرآبادی، افتخار حسین مضطر خیرآبادی، ظہیر دہلوی ان میں خاص طور پر مشہور ہیں۔ نواب صاحب کے اس ذوق کے باعث پوری فضا پر شعر و نغمہ چھائے ہوئے تھے۔ داغ کے مشہور تلامذہ صاحبزادہ احمد سعید خان عاشق اور کیف کی پرورش اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ صولت نے ہوش سنبھالا، تو وہ بھی اسی کیف و رنگ کی دنیا میں کھو گئے، اور شعر کہنے لگے، اس میں مشورہ عاشق اور کیف سے رہا۔ دونوں استاد ماہر فن اور قادر الکلام سخنور تھے۔ بہت جلد صولت بھی اس میدان کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو گئے۔ رہی سہی کسر مشق نے پوری کردی؛ اور ان کا شمار اپنے زمانے کے صفِ اول کے شاعروں میں ہونے لگا۔

بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ درباری تعلق کے باعث ان کے کلام میں قصائد اور مدحیہ قطعات وغیرہ کا بھی وافر حصہ ہے۔ ان کی عشقِ رسول میں ڈوبی ہوئی نعتیں مولود کی محفلوں میں بڑی مقبول ہیں۔ ٹونک کی ایک خاص صنفِ سخن چار بیتی ہے۔
صولت نے اس میں بھی طبعِ جدّت پسند کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ کچھ مزاحیہ کلام بھی ہے؛ لیکن افسوس کہ مزاج کی وارفتگی اور لاابالی پن نے عمر بھر کلام کی تدوین سے بے نیاز رکھا؛ آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ غیر مرتّب کلام ان کے ورثا کے پاس موجود ہے۔ کاش، کوئی اللہ کا بندہ محنت کر کے اس کا ایک نمائندہ انتخاب شائع کردے! اس طرح یہ ضائع

ہونے سے بچ جائیگا اور ان کی یادگار بھی قائم رہیگی۔
انھوں نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ صاحبزادہ افتخار علی خان ان کے شاگرد تھے، دو سو روپے مہینا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ نواب اسماعیل علی خان نے بھی سو روپے مہینا اپنے جیب خاص سے ان کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ جایداد اہل عرب، اور رقیہ بیگم کے ترکے سے بھی کچھ ملتا تھا۔ لیکن چوں کہ ذمے داریاں بہت تھیں، اس پر گرانی کا یہ عالم کہ اس نے بڑے بڑوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ تنگی ترشی سے بسر اوقات ہوتی تھی۔
۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کی صبح گلے کے کینسر کے عارضے سے انتقال ہوا۔ خیر یہ تو ایک بہانہ ہوگیا، ورنہ ہے یہ کہ جب ۱۹۶۷ء میں ان کا بڑا بیٹا پیارے میاں اللہ کو پیارا ہوا تو اسی دن سے وہ گھلنے لگے تھے۔ یہی غم جان لیوا ثابت ہوا۔ ٹونک کے مشہور شاہی قبرستان موتی باغ کے قطعۂ خاص میں دفن ہوئے۔ ہجری سال وفات (۱۳۸۷) ان کے نام مولانا محمود الحسن صولت ٹونکی سے برآمد ہوتا ہے۔ اولاد میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔
انتخاب کلام درج ذیل ہے:۔

عدو کی پاسداری کا تو دل سے شک نکل جاتا
کسی صورت سے لے لیتا ہمارا امتحاں قاتل

ہر اک اس کی ادا پر خود ہی اپنی جان دی ہم نے
حقیقت میں ہمیں قاتل ہیں اپنے، وہ کہاں قاتل!

ہمیں پھر شک رہیگا عمر بھر، اپنی محبت میں
خدا کے واسطے، لے لے ہمارا امتحاں قاتل

ہوا کیوں کر نہ تیرا خاتمہ بالخیر، اے صولت!
جز اک اللہ! دمِ آخر بھی تھا وردِ زباں "قاتل"

نتیجہ کیا، اگر انسان جیسی شکل پائی ہے
وہ ہو انسان، جو انسان کے کام آئے مشکل میں

وہ نکلا دل سے ارماں، جو نہ تھا دل سے نکلنے کا
جسے دل سے نکالا تھا، وہ ارماں رہ گیا دل میں

چلو یہ عمرِ فانی نے کے ہاتھوں ہاتھ لے آئیں
حیاتِ جاودانی لٹ رہی ہو کوئے قاتل میں

سب کچھ وہی کام آیا، قسمت میں جو لکھا تھا
مجھ کو تو کسی سے بھی شکوہ نہ گلا کوئی

یہ تم نے مسکرا کے، حجابِ بہار میں
سب گل کھلائے ہیں چمنِ روزگار میں

ہوتا نہیں ہے صدق سے انسان منفعل
صولتؔ ہمیں جو کہنا ہو کہہ دیں ہزار میں

کہاں کا ناخدا، کیسا سفینہ، موجِ دریا کیا
خدا پر رکھ نظر، اے سوئے ساحل دیکھنے والے

بام و درِ مطلعِ انوار نظر آتے ہیں
اُن کے آنے کے سے آثار نظر آتے ہیں

حسبِ دلخواہ نظارہ نہیں ہونے پاتا
یوں نظر آنے کو سو بار نظر آتے ہیں

اب بھی میں ان کو نہ پہچانوں تو میرا قصور
ورنہ وہ تو ہر طرف ہیں جلوہ گر میرے لیے

زلف و رخ اُن کے سلامت، کیا غمِ شام و سحر!
شام اک میرے لیے ہے، اک سحر میرے لیے

ناتوانی سے مری یہ بار اٹھ سکتا نہیں
کوہ ہے، صولتؔ! غمِ مرگِ جگر میرے لیے

رہتے ہیں آسمان و زمیں اس کی تاک میں
کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب اک بشر کے ساتھ

اے خضر! عشق کر کے گزار دو تو بات ہے
طولانیِ حیات، غمِ مختصر کے ساتھ

میں کب غمِ تنہائی سے مضطر نہ ہوا تھا
کس دن ترا چاہت، بتِ کافر! نہ ہوا تھا؟
کیوں تم نے اٹھائی ہے قیامت میں قیامت
شکوہ تو تمھارا سرِ محشر نہ ہوا تھا
اس درد میں یہ کیسی مصیبت ہے، الٰہی!
اس طرح تو جینا کبھی دوبھر نہ ہوا تھا

یہ سچ نہیں کہ مزا الفتِ بتاں میں نہیں
سکت ہی اتنی مگر قلبِ ناتواں میں نہیں
عجب یہ الفتِ اولاد کا کرشمہ ہے
جو دل کو چین، قفس میں ہو آشیاں میں نہیں
ز فرق تا بہ قدم سب ترے محاسن ہیں
کچھ اور ذکر کہیں میری داستاں میں نہیں
وہ نیر اور ہے کہ سر جس پہ خود بخود جھک جائے
کہیں یہ جذب و کشش اور آستاں میں نہیں

پریم شنکر فرحت دہلوی

یہ پرانے دلّی والے تھے۔ یہیں ۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو ایک متموّل تجارتی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ موہن لال گوئلہ کا (جو حیات ہیں) گھڑیوں کا کاروبار ہے۔ شاید اس خیال سے کہ بالآخر انھیں تجارت ہی کرنا ہے، تعلیم صرف انٹر تک پائی؛ لیکن اس کے باوجود انگریزی بہت اچھی جانتے تھے، جیسا کہ ان کے ٹیگور کی متعدد نظموں کے تراجم سے ظاہر ہے۔ فارسی سے بھی اچھی مزاولت تھی۔ اردو کے علاوہ ہندی سے بھی شغف تھا؛ ہری ونش بچّن ان کے محبوب شاعر تھے۔ اردو میں انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی اور اقبال کے کلام کے شیدائی تھے۔

اردو کا شوق بہت ابتدا میں پیدا ہوا۔ چندے لالہ دھرم پال گپتا وفاؔ سے مشورہ رہا؛ اب بہت دن سے بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی اور کامل نظامی دہلوی (تلمیذ سائل دہلوی مرحوم) سے اصلاح لیتے تھے۔ مجموعۂ کلام سازِ حیات کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔

آخری ایام میں ایک مثنوی (ساقی نامہ) لکھ رہے تھے، جو نامکمل رہ گئی۔
ان کے جسم میں موٹاپے کے اثرات تھے، جس سے قلب کا فعل کمزور ہونے لگا
تھا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو اچانک اپنے دوسرے سکونتی مکان میرٹھ میں حرکتِ قلب
بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ کاملؔ نظامی کے قطعۂ تاریخ کا آخری شعر ہے:

از سرِ آہ ہے ملی تاریخ یہ
"فرطِ غم سے سب ہیں دو پارہ جگر"
(۱۹۶۸ = ۱۹۶۷ + ۱)

اب چند شعر دیکھیے:۔

نصیب عظمتِ آدم کو لامکاں بھی نہیں
اور آج راس اسے پستیِ جہاں بھی نہیں

مزاجِ عشق کو مرغوب امتحاں بھی نہیں
مگر یہ بات محبت پہ کچھ گراں بھی نہیں

وفورِ شوق میں تعمیر خود کیا جس کو
سرِ نیاز کی قسمت وہ آستاں بھی نہیں

وہ صحن و روش، یہ شمس و قمر، یہ دشت و بیاباں کچھ بھی نہیں
جز اپنی حدِ پرواز نظر، اے دیدۂ حیراں! کچھ بھی نہیں

لطف اندوزِ نوائے سازِ عشرت ہو چکا محو اب ہوتا ہوں، کیفِ نغمۂ روپوش میں

ناداں سمجھ کے مجھ پہ زمانہ ہو خندہ زن یہ مل رہا ہے میری وفا کا صلا مجھے

حجابِ گل میں پنہاں کون ہے، جانِ چمن ایسا
یہ کس کا ذکر کرتی ہے ہر اک پتّی زباں ہو کر

رہِ وفا میں بہر گام اک صعوبت ہے
کبھی کبھی تو یقیں پر بھی سو گماں گزرے
ہر اک گماں نے جلایا مگر چراغِ یقیں
یہ حادثات مرے درک پر گراں گزرے

پرویز شاہدی، سیّد محمد اکرام حسین

ان کا اصلی نام سیّد محمد اکرام حسین تھا۔ ۱۹۱۰ء میں پٹنے (لودی کٹرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد احمد حسین (ف ۱۹۵۳ء) خاصے کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ اس لیے انھوں نے بیٹے کو ایک زمانے تک مدرسے نہیں بھیجا؛ تمام تعلیم نج کے طور پر خاص اساتذہ کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے درسِ نظامیہ کا عربی اور فارسی کا بیشتر نصاب پڑھا، جو بعد کو بہت کام آیا۔ اس کے بعد لامحالہ انگریزی کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۲۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے دسویں درجے کی سند لی۔ پھر پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا؛ اور یہاں سے یکے بعد دیگرے بی اے اور ایم اے (اردو اور فارسی) اور قانون (ایل ایل بی) کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی۔

شروع میں خیال تھا کہ وکالت کریں گے لیکن اسی زمانے میں ایک ناخوشگوار حادثہ پیش آیا، جسے خود انھوں نے "جذباتی صدمہ" سے تعبیر کیا ہے۔ واقعہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ایک خاتون سے محبت ہوگئی اور وہ اس سے شادی

کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے لڑکی کے والدین اس عقد کے خلاف تھے؛ ہمارے ہاں والدین بچوں کے جذبات اور خواہشات کا کم ہی خیال کرتے ہیں۔ قصّہ کوتاہ، ماں باپ نے لڑکی دوسری جگہ بیاہ دی۔ عنفوانِ شباب اور ایسا حادثہ، غریب کو بٹنے کے درودیوار سے وحشت ہونے لگی؛ انھوں نے ترکِ وطن کی ٹھانی اور کلکتے کی راہ لی۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

کلکتے میں انھوں نے بسراوقات کے لیے وکالت کی جگہ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ شروع میں بہت دن تک مختلف اسکولوں میں معمولی جگہ اور قلیل مشاہرے پر کام کرنا پڑا۔ لیکن آدمی تھے مستقل مزاج اور دھن کے پکے، ہمّت نہیں ہارے اور ڈٹے رہے۔ اسی دوران میں (۱۹۳۸ء) بی ٹی کی سند بھی لے لی، جس سے تعلیمی محکمے میں ترقی کا راستہ کھل گیا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک مدناپور کالج میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں سریندر ناتھ کالج، کلکتہ میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے؛ لیکن جلد ہی یہاں کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

۱۹۴۹ء میں وہ کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اس کی پاداش میں قید و بند تک نوبت پہنچی۔ ڈیڑھ سال کی نظربندی کے بعد ۱۹۵۱ء میں رہا ہوئے تو معلوم ہوا کہ اب وہ کالج کی ملازمت نہیں مل سکتی۔ مجبوراً ایک معمولی اور مفلسی کے شکار اسکول میں ہیڈ ماسٹری قبول کرلی۔ یہاں تنخواہ اتنی بھی نہیں تھی کہ اس سے روزمرّہ کے معمولی اخراجات ہی چل سکتے؛ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ حسبِ توقع، دو برس بعد اسکول نے دم توڑ دیا اور ان کی نوکری کے ساتھ بھی گئی۔ بارے، جلد بعد ہی سی ایم او ہائی اسکول، کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوگئے۔ اور اب گویا اطمینان کی سانس لینا نصیب ہوئی؛ یہاں وہ ۱۹۵۷ء

تک رہے۔

۱۹۵۸ء کے آغاز میں کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ کھلا، تو لکچرر کی جگہ پر ان کا تقرر ہو گیا؛ اپنی وفات تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔

مرورِ ایام سے وہ ناکام محبت کا زخم مندمل ہو گیا تھا۔ اب کچھ مادی آسائش بھی میسّر تھی، اس لیے انھوں نے نومبر ۱۹۵۸ء میں ایک بنگالی خاتون (فضیلت النسا بیگم) سے شادی کرلی۔ دونوں ہم مذاق تھے؛ وہ بھی ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ جسمانی یادگار ایک خُرد سال لڑکی چھوڑی۔

انھیں ایک زمانے سے دمے کا تکلیف دہ عارضہ لاحق تھا۔ آخری ایام میں بعض اور عوارض نے بھی آگھیرا تھا؛ بالخصوص کم خوابی اور بے چینی کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ علاج ہو رہا تھا کہ ۴ مئی ہفتے کے دن طبیعت یکایک زیادہ خراب ہو گئی؛ گیارہ بجے رات غشی کا دورہ پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر ہوش میں نہیں آئے اور اسی حالت میں اگلے دن اتوار ۵ مئی ۱۹۶۸ء کو سات بجے شام جاں بحق ہو گئے۔ پیر کی صبح کو جنازہ اٹھا اور گوبرا قبرستان (۱) میں سپردِ خاک ہوئے۔

پرویز کے والد سید احمد حسین شعر کہتے تھے؛ احمد اور رضو تخلص تھا۔ پرویز نے جب ہوش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد شعر و ادب کی باتیں ہی سنیں۔ چنانچہ یہ بھی بہت کم عمری میں شعر سے دلچسپی لینے لگے۔ جب سنِ تمیز کو پہنچے، تو مولانا عین الہدیٰ ثمر (تلمیذ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی) سے مشورہ کرنے لگے۔

شاہدی کا جزو اپنے دادا سید شاہد حسین کے نام کی مناسبت سے اضافہ کر لیا تھا۔ اگرچہ ان کی تعلیم و تربیت غزل کے دور اور ماحول میں ہوئی تھی، لیکن اپنے سیاسی رجحانات کے باعث انھوں نے غزل کے علاوہ نظم پر بھی

توجہ کی، اور اس میں اپنا منفرد مقام بنا لیا۔ وہ کل ہند انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "رقصِ حیات" چھپ چکا ہے (مکتبہ شاہراہ دلّی، ۱۹۵۷ء) دوسرا "تثلیثِ حیات" الٰہ آباد میں زیر طبع ہے۔ افسوس کہ یہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے شروع میں انھوں نے، جو پیش لفظ لکھا تھا، اس میں مختصراً اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اور اپنے نظریۂ شعری پر بھی نظر ڈالی ہے۔

وہ کمیونسٹ خیال کے آدمی تھے، لیکن نہ ان کے خیالات میں جارحانہ شدّت تھی، نہ ان کی وجہ سے ان کے کسی دوست کو کبھی کسی قسم کی شکایت پیدا ہوئی۔ ان کے تمام ملنے والے ان کی انسان دوستی اور وسیع القلبی، خلوص اور حسنِ نیّت کے قائل تھے؛ ان کا کلام بھی اس کا شاہد ہے؛

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اب چند شعر دیکھیے، جو ان کے دوسرے مجموعے "تثلیثِ حیات" سے ماخوذ ہیں:

جب تک شریکِ حال کسی کی نظر نہ تھی — تھی زندگی حسین، مگر اس قدر نہ تھی

وہ چشمِ سرمگیں، جو بظاہر ادھر نہ تھی — دل ہی سے ہم کلام تھی، اس کی خبر نہ تھی

کوئی دیر و حرم کو جا کے میخانے میں ڈال آئے

نہ حالِ شیخ اچھا ہے، نہ حالِ برہمن اچھا

زمانہ سازیِ اہلِ ہوس کی عمر دراز — کہ آپ محوِ وفا ہی کے امتحاں میں رہے

اذنِ شرکت ہی نہیں احساسِ یکجائی کو آج

محفلیں تو منتشر کتنی دلِ تنہا میں ہیں

---

۵ یہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ (الٰہ آباد ۱۹۶۸ء)

دل والوں کی خاموشی ہی، بادِ سماعت ہوتی ہے
بے آوازی کرب فضا ہے، تم بھی چپ ہو، ہم بھی چپ

بھیس بدلتی آوازیں ہیں، شام و سحر کہلاتی ہیں
وقت کا دم کیا ٹوٹ گیا ہے، تم بھی چپ ہو، ہم بھی چپ

سکتے تک اب آ پہنچا ہے، بڑھتے بڑھتے کربِ سکوت
ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے، تم بھی چپ ہو، ہم بھی چپ

شاید نگاہ پہنچے، اب وسعتِ زمیں تک
پلٹا تو ہے تصور تنگ آ کے آسماں سے

سب کے سب واعظ بنے ہیں، بادہ کش کوئی نہیں
میکدے میں اب وہ قدرِ لغزشِ پیہم کہاں

آنسوؤں میں غرق ہو جاتا ہے دل کا اضطراب
غم پرستوں کے مقدر میں شعورِ غم کہاں

ویرانیوں نے بڑھ کے لبالی ہیں بستیاں
اب کوہ و دشت میں کوئی ویرانہ کیوں رہے

ہے زندگی تعاونِ عقل و جنوں کا نام
دل سے سلوکِ ذہنِ رقیبانہ کیوں رہے

ہر رابیت نے کیے تیرے ہی بت کو سجدے
ہر بغاوت مجھے تیری ہی پرستار ملی

منزل بھی ملیگی رستے میں، تم راہگزر کی بات کرو
آغازِ سفر سے پہلے، کیوں انجامِ سفر کی بات کرو

ظالم نے لیا ہے شرما کر پھر گوشۂ داماں چٹکی میں
ہے وقت کہ تم بیباکی سے اب دیدۂ تر کی بات کرو

آیا ہے چمن میں موسمِ گل، آئی ہیں ہوائیں زنداں تک
دیوار کی باتیں ہو لینگی، اس وقت تو در کی بات کرو

ہے تیز ہوا، ہلتا ہے قفس، خطرے میں پڑی ہو ہر تیلی
فریادِ اسیری بند کرو، اب جنبشِ پر کی بات کرو

کیوں دار و رسن کے سائے میں، منصور کی باتیں کرتے ہو؟
رکھنا ہے جو اپنا سر اونچا، تو اپنے ہی سر کی بات کرو
کیوں اہلِ جنوں اربابِ خرد کی محفل میں خاموش رہیں
وہ اپنے ہنر کی بات کریں، تم اپنے ہنر کی بات کرو
کیا بربط و دف دم توڑ چکے، موت آ گئی کیا ہر نغمے کو!
تم مطربِ جام و مینا ہو، کیوں تیغ و سپر کی بات کرو

بے چہرگی

ہزار پوست استخواں،
ہزار لب فسردگی،
ہزار پردہ تشنگی،
ہزار حیلہ بے دلی،
ہزار عشوہ خودسری،
ہزار غمزہ عاجزی،
ہزار پیچ آگہی،
ہزار عقدہ ابلہی،
ہزار لہجہ خامشی
ہزار مرگ زندگی،
غرورِ برتری کے ساتھ اختلاجِ کمتری!
یہ پارہ پارہ آدمی،
یہ ریزہ ریزہ آدمی،

ہزار چہرہ آدمی
معاشیاتِ حرص کا ابلتا خلفشار ہے
مجسم انتشار ہے
نظامِ بے مہار کا عظیم شاہکار ہے
ہزار چہرہ آدمی
خود اپنا چہرہ ڈھونڈتا
رواں دواں،
ابھی یہاں،
ابھی وہاں،
نہ کوئی سمت ذہن میں،
نہ کوئی راہ سامنے!
فقط فریب کاریِ انا کی گرد اوڑھ کر
کبھی ادھر دوڑتا ادھر،

کبھی ہے کھا گتا ادھر!
ہو کون اس کا ہمسفر؟
خود اس کے چہروں کے ہجوم میں جو چہرہ
کھو گیا، دوبارہ وہ ملیگا کیا؟
تعاون آئینے کا بھی فریب ہی فریب ہے!
نظر لگائے غوطہ کیا کہ آئینہ اتھاہ ہو
خود اپنے چہروں کا ہجوم درطۂ نگاہ ہو!
نہ کوئی نقشِ منفرد،
نہ کوئی عکسِ معتبر

ہزار چہرہ آدمی
ہزار چہرگی لیے،
بھٹک رہا ہو بے ارادہ صرف اسی تلاش میں
کہ اس کو.....
چہرہ چاہیے۔
خود اپنا چہرہ چاہیے۔
وہ اصلی چہرہ چاہیے
بچھڑ کے جو سسک رہا ہے
چہروں ہی کی بھیڑ میں

بینک

یہ کنشت و کلیسا، یہ دیر و حرم
سب کے سب بینک ہیں کفر و دیں کی قسم!
حصہ داری سیاست کی ہے خم بہ خم
چک کی صورت یہاں روز بھُنتے ہیں ہم
روز بھُنتے ہو تم

کتنے افسانے بنا کر رکھ لیے تھے شوق نے
یوں نقاب الٹی خفیفت نے کہ حیراں کر دیا
کس قدر مضبوط نکلے تیرے دیوانے کے ہاتھ
شامِ غم کو جب نچوڑا، صبح تاباں کر دیا

ہے حیات اک شورشِ منزل آفرینی کی
آتی جاتی سانسوں کو زندگی نہیں کہتے

وقت گزرا جو بے خیالی میں
وہ مزے ہی خیال میں گزرا

جینے کے لیے تو ہوسِ خام بہت ہے
مرنے کے لیے پختگیِ شوق کی ہے شرط

پرویزؔ! صبح و شام کیے جا رہا ہوں میں
وعدہ نہیں ہے کوئی، مگر ان کا انتظار

شکایت کر رہے ہیں اب، سجدہ ہائے رائگاں مجھ سے
نہ دیکھا جائیگا اب، سوئے آستاں مجھ سے

فقیر سیّد وحید الدّین

جن اصحاب کو مہاراجا رنجیت سنگھ (۱۷۹۲ - ۱۸۳۹ء) کے حالات کے مطالعے کا اتفاق ہوا ہے، انھیں یاد ہوگا کہ ان کے دربار کی ایک نمایاں شخصیت فقیر سیّد عزیزالدین کی بھی تھی ۔ وہ کچھ مدّت مہاراجا کے وزیر بھی رہے ۔ سکھ دورِ سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی ان کے خاندان کی علم و ادب سے دلچسپی اور وضعداری قائم رہی ۔ فقیر سید وحید الدین اسی نامور خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔

فقیر سید وحید الدین کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی ۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں اپنے کئی دوستوں کی طرح انھوں نے بھی فوجی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس میں کرنیل کے عہدے تک ترقی کی ۔

انھیں اقبال سے عشق تھا؛ ان سے ذاتی تعلقات بھی ایک زمانے تک رہے ۔ چنانچہ انھوں نے اقبال کی زندگی سے متعلق تصاویر کا ایک مجموعہ (البم) اقبال ان پکچر' کے عنوان سے شائع کیا تھا ۔ اس کے بعد روزگارِ فقیر (دو حصے) کے نام سے ایک کتاب شائع کی، جو طباعت و کتابت کے پہلو سے بھی اردو کی چند بہترین

کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اس کا عنوان اقبال کی مشہور رباعی سے لیا گیا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید   نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے   دگر دانائے راز آید کہ ناید

اس کتاب میں انھوں نے اقبال کے حالات لکھے ہیں، جو خود ان کے علم میں تھے یا ان کے عزیز دوستوں کے۔ اگرچہ یہ کتاب کوئی مسلسل سوانح عمری نہیں ہے، لیکن اس میں بعض بے حد قیمتی معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔ کسی زمانے میں اقبال سے متعلق انھوں نے فیض کے تعاون سے ایک رنگین فلم بھی تیار کی تھی۔

فقیر سید وحید الدین نے حضرت رسول اسلام صلعم کی سوانح عمری (محسنِ اعظم) بھی لکھی تھی۔ یہ ان کی بہت مقبول کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اپنے ہمعصروں سے متعلق تاثرات اور یادداشتوں پر مشتمل ایک مجموعہ 'انجمن' کے نام سے شایع کیا تھا۔ اور بھی کچھ چھوٹی بڑی تحریریں ان سے یادگار ہیں۔

افسوس، ان کا بروز ہفتہ ۲۰ جولائی ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی شرافت اور وضعداری اور علم و ادب کی سرپرستی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد آگئی۔ ایک شخص تھے امین چند، سیلانی قسم کے انسان تھے۔ ۱۸۵۱-۱۸۵۲ء میں اس نے ملک کے بعض حصّوں کی سیاحت کی اور بعد کو اس کے کوائف کتابی شکل میں 'سفرنامہ منشی امین چند' کے عنوان سے ۱۸۵۹ء میں شائع کر دیے (مطبع کوہ نور، لاہور) اس میں وہ لکھتا ہے (ص ۴۳) کہ فقیر نور الدین اور فقیر عزیز الدین، دراصل قوم کے حجّام تھے۔ بظاہر یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے۔ خدا معلوم، اس کا ذریعۂ معلومات کیا تھا۔

شفا گوالیاری / سید محمد حسن

ان کے والد سید عوض علی طبابت کا پیشہ کرتے تھے۔ یہ خاندان دراصل قائم گنج (ضلع فرخ آباد۔ یوپی) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جدِ امجد نقلِ مکان کر کے گوالیار میں جا بسے تھے۔ سید محمد حسن یہیں گوالیار میں دوشنبہ ۱۲ رمضان ۱۳۳۰ھ (۲۶ اگست ۱۹۱۲ء) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "مظہر علی" تھا، جس سے ۱۳۳۰ برآمد ہوتے ہیں۔

سید عوض علی اچھے طبیب تھے، لیکن اس سے بھی زیادہ کٹر مسلمان تھے۔ وہ بیٹے کو عالمِ دین اور فقیہ شہر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ چار برس ہی کی عمر میں یہ ایک مولوی کے سپرد کر دیے گئے اور قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا؛ اس کے بعد فارسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اگر ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں ان کے والد کا (بعمر ۱۰۵ سال) انتقال نہیں ہو گیا ہوتا، تو یقین ہے کہ یہ عربی فارسی کی تکمیل کے بعد کسی دینی درسگاہ میں مدرس بن جاتے یا پھر کسی مسجد کے پیش امام۔ لیکن جب اس کم عمری میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، تو ان کے بہنوئی مولوی احمد زمان

نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم زیادہ باقاعدگی سے ہونے لگی۔ عربی ختم ہوگئی، اور یہ اردو فارسی کے ساتھ انگریزی اور مراٹھی بھی پڑھنے لگے۔ اب انھوں نے میونسپل اسکول، لشکر گوالیار میں داخلہ لے لیا، حتیٰ کہ یہاں سے دسویں درجے کی سند حاصل کر لی۔ چونکہ نجی حالات آگے تعلیم جاری رکھنے میں مانع تھے، اس لیے انھوں نے طبّی سند (H.A) حاصل کر لی۔ اور ریاست گوالیار کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ تقسیمِ ملک تک وہ گوالیار ہی میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب یہاں کی فضا مکدّر ہو گئی، تو ہجرت کر کے بھوپال چلے گئے۔ یہاں "شفا میڈیکل ہال" کے نام سے اپنا مختصر ذاتی مطب اور دواخانہ کھول لیا اور یوں عزت و آبرو سے بسر کرنے لگے۔

انھیں تفکراتِ دنیا اور خاصے بڑے کنبے کی پرورش کے بار نے پریشان حال رکھا۔ جسم بھی منحنی اور اکہرا تھا، اس پر تنفّس اور سُعال کے پرانے مریض تھے۔ آنتوں کی بیماری بھی لاحق تھی، اور اسی کے علاج کے لیے بھوپال کے ٹی بی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ سہ شنبہ ۲۳ جولائی ۱۹۶۸ء سات بجے شام اسی ہسپتال میں انتقال ہوا۔ جنازہ اگلے دن صبح اٹھا اور دوپہر کے قریب قبرستان کے باغ میں سپردِ خاک ہوئے۔ بسمل رتلامی نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا:

شستہ گو، پختہ گو، امیرِ سخن ۔ بزمِ سیماب کا مہِ طلعت
وقت آنا تھا یہ بھی، اے بسملؔ! ۔ "دردِ دل دے کے ہو شفا رخصت"
(۱۹۶۸)

مرحوم نے شاعری ۱۹۲۴ء میں شروع کی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، بہت جلد ان کا کلام پسند کیا جانے لگا، جس سے انھیں ۱۹۳۵ء میں ایک مختصر مجموعہ "گلدستۂ شفا" کے نام سے شائع کرنے کی جرأت ہوئی (شمسی پریس، گوالیار)۔ اس میں صرف ۳۲ غزلیں اور ۳۲ ہی صفحات ہیں۔ ابھی تک انھوں نے کسی استاد

سے مشورۂ سخن نہیں کیا تھا گو مشقِ سخن جاری تھی۔ بالآخر کئی دروازوں پر دستک دینے کے بعد ۱۹۴۰ء میں سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئے۔ پانچ سال بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں استاد نے نہ صرف فارغ الاصلاح قرار دے دیا، بلکہ دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ گوالیار کا ماحول جو کچھ تھا (اور اب بھی ہے) اس میں کسی علمی و ادبی یا شاعرانہ صلاحیتوں کے نمایاں ہونے اور ترقی کرنے کا موقع معدوم تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء میں وہ بھوپال منتقل ہوگئے، تو یہاں کا گرد و پیش سراسر ان کے ساز گار ثابت ہوا۔ شہر میں اچھے ادیبوں اور شاعروں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ذکی وارثی (ف ۱۹۵۰ء) اور محمد یوسف قیصر بھوپالی (ف ۱۹۶۸ء) جیسے اساتذہ یہاں موجود تھے۔ شفا بھی ان حضرات کے یہاں آنے جانے لگے؛ اور انھیں خود اعتراف تھا کہ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔

یہیں بھوپال میں انھوں نے اپنے متعدد مجموعے مرتّب کرکے شائع کیے: آیاتِ شفا (غزلیات: ۱۹۵۱ء)؛ نبضِ حیات (غزلیات، ۱۹۵۵ء)؛ شاخِ زیتون (رباعیات اور نظمیں)؛ رگِ حیات (نظمیں)؛ زخمِ گل (غزلیات، ۱۹۶۳ء) اب بحیثیت شاعر انھیں مسلّمہ مقام حاصل تھا۔ ان کی فنی معلومات بھی بہت وسیع تھیں؛ خاص طور پر عروض کی واقفیت بہت اچھی تھی۔ ان کا حلقۂ تلمذ کوئی ۴۰۰ شاگردوں پر مشتمل ہوگا۔

اتنی معنوی اولاد کے ساتھ مرحوم دنیوی لحاظ سے بھی خوش قسمت تھے؛ دو بیویوں سے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

اب کچھ کلام ملاحظہ کیجیے، جو ان کے مجموعے "نبضِ حیات" سے ماخوذ ہے:۔

بھروسا مشعلوں پر تا کجا، اے کارواں والو!
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا

جہاں سے تو ذرا پہچان لے، اپنی حقیقت کو
وہیں سے فرض ہو جاتا ہے تجھ پر، احترام اپنا

کیا ہوئی تیری نگاہِ مہر ساز؟ کیوں افق سے مانگتا ہے تو، سحر؟
عزمِ دل کی لَو بڑھائے تو کوئی رہ گزرِ خود، ہے چراغِ رہ گزر

نگاہ و دل کے پرتو سے کریں شام و سحر روشن
مہ و خورشید کی تابندگی تک بات کیوں پہنچے!
محبت کی کہانی ہو کہ نفرت کی حکایت ہو
کسی کی بھی سہی، لیکن کسی تک بات کیوں پہنچے

مجبور پہ مایوس پہ، یہ جبرِ مسلسل مجبور کے، مایوس کے، کیا دل نہیں ہوتا؟
اب اور کون سے گل رہ گئے ہیں کھلنے کو الٰہی! خیر ہو، کیوں مسکرائے دیوانے

زمیں سے گزرے ہیں، یا آسماں سے گزرے ہیں
جہاں کو ساتھ لیا ہے، جہاں سے گزرے ہیں
نہ پوچھیے، کششِ منزلِ غمِ جاناں
یہیں کے ہو گئے، جو بھی یہاں سے گزرے ہیں

وہ جب دیکھتے ہیں کبھی میری جانب
تو میں جانبِ آسماں دیکھتا ہوں

کہاں کی یاد، کس کا ذکر، اس کی بزم رنگیں ہیں
ہمارا نام بھی اب تو برائے نام آتا ہے
خدا شاہد کہ دل سے تو خدا کا نام لیتا ہوں
مگر لب پر جب آتا ہے، تمھارا نام آتا ہے

زندگی ہے اک مسلسل سوز، پیہم اضطراب
سعیِ حاصل سے قریب اور سعیِ لاحاصل سے دور

دل میں ہے عزمِ مسلسل، عزم میں پیہم تڑپ
ہیں وہی کچھ پاس منزل کے، جو ہیں منزل سے دور

حدِ عنواں سے آگے، آخر افسانے کہاں جاتے؟
تری محفل سے بڑھ کر، تیرے دیوانے کہاں جاتے

غمِ دوراں نے بڑھ کر، لو بڑھا دی شمعِ ہستی کی
غمِ جاناں کے یہ بھٹکے ہوئے، جانے کہاں جاتے

یہ رندوں کی ہے شانِ بے نیازی ساقیو! ورنہ
نہ جانے تم کہاں ہوتے، یہ میخانے کہاں جاتے

بھٹکتے پھر رہے ہیں مرنے والے جو بے منزل
یقیں کی راہ پر آجائیں، لے کر وہ گماں اپنا

ہر اک شکوہ بجا، لیکن ذرا اتنا تو سمجھا دو
نظر سے غیر کی کیوں دیکھتے ہو گلستاں اپنا

سہارا بیخودی کا کیا، جنوں کا آسرا لیتا
روا ہی کب ہے دخلِ ماسوا اصلِ محبت میں

میری ہی غمدیدہ آنکھیں، مجھ کو کرتیں مطمئن
ان کے لب پر میرے اشکوں کا جواب آیا تو کیا؟

داغِ ناکامی تو اب بھی، ہے جبیں سے منفعل
لاکھ ان کے آستاں سے کامیاب آیا تو کیا!

او توجہ کرنے والے! شکر یہ جب مٹ چکا
اب خیالِ پرسشِ خانہ خراب آیا تو کیا!

گلشن بدوش نظریں، لب پر حسیں ترانہ
ہر اک ادا ہے ان کی، الفت کا اک فسانہ
اب تک نگاہ میں ہے، پہلی نگاہ ان کی
ہنستی رہی محبت، لٹتا رہا زمانہ
کیا ہو بیاں کسی سے تعبیرِ حسن و الفت
شعلوں کی اک کہانی، شبنم کا اک فسانہ

عجب ہے فطرت انسانیت کہ انساں کو
یقیں کی حد میں بھی لاکھوں گماں گزرتے ہیں
وفا کی راہ میں ایسی بھی ایک منزل ہے
جہاں سے رک کے ذرا دو جہاں گزرتے ہیں
جو ان کی یاد سے خالی ہوں، ان کے ذکر سے دور
حیات پر وہی لمحے گراں گزرتے ہیں
دعائیں میں ستمِ دشمناں کو دیتا ہوں
نظر سے جب کرمِ دوستاں گزرتے ہیں

خوش بیاں تلخیِ گفتار تک آ پہنچے ہیں
سینۂ گل سے لبِ خار تک آ پہنچے ہیں

کس لیے دانستہ ہم کھائیں فریبِ حسن و عشق!
کیوں غلط تائیدِ ربطِ شعلہ و شبنم کریں!
ظلمتیں گھٹنے کا آخر، اور کب تک انتظار
لاؤ، باقی رات کو بڑھ کر سحر میں ضم کریں
جو برا کہتے ہیں عالم کو، انھیں یہ چاہیے
پہلے اپنے آپ کو شائستۂ عالم کریں

ذرّے ذرّے کا شعور و ذہن کو عرفان تھا

بے خبر تھے خود، جو ہم کو بے خبر سمجھا کیے

آج تک ہم نے فروغِ دل پہ نظریں ہی ٹکیں

مہر و مہ پہ منحصر اپنی سحر سمجھا کیے

ہے اسی کا نام، دل کا سوز، معراجِ حیات

آدمی کو جب خوشی میں غم نظر آنے لگے

آزادیٔ بہار تو اس وقت جانیے

صحنِ چمن میں خار بھی جب مسکرا سکے

اس ہی کو مسکرانے کا حق ہے حقیقتاً

آنکھوں میں جس کی اشک ہوں اور مسکرا سکے

ہیں وجہِ انفعال، خود اپنی سیاہیاں

یوں ورنہ شامِ غم پہ سحر مسکرا سکے!

اگر غم کی ہوئی یوں کارفرمائی، تو کیا ہوگا؟

رہی ہوتے ہوئے بھی ان کے تنہائی، تو کیا ہوگا!

جن سے گم ہو جائیں راہی، کچھ نشاں ایسے بھی ہیں

زندگی کے راستے میں، امتحاں ایسے بھی ہیں

ظلم ہیں جن کے کرم ہے، لطف ہیں جن کے ستم

مہرباں ایسے بھی ہیں، نامہرباں ایسے بھی ہیں

تو نے حالات کو مجبور کیا ہو خود ہی

کون کہتا ہو کہ مجبور تو حالات سے ہے!

کچھ خودی سے اور نہ مطلب بیخودی سے

ہے براہِ راست نسبت زندگی سے

ادھر تارے، ادھر کلیاں، ہیں مصروف گراں خوابی

اگر ایسے میں پیغامِ سحر آیا، تو کیا ہوگا!

چلے تو ہیں تلاشِ آستاں میں، اے شفاؔ! ہم بھی

مگر اپنا ہی پہلے سنگِ در آیا، تو کیا ہوگا!

جب اٹھی ہے چمک کوئی دل میں دور تک روشنی ہوگئی ہے

اے غمِ معتبر! ترے دم سے زندگی کام کی ہو گئی ہے

عالمِ رنج و حرماں نہ پوچھو ہر خوشی خواب سی ہو گئی ہے

لبوں پہ ان کے حیات آفریں ہنسی نہ رہی

گلوں میں روح، ستاروں میں روشنی نہ رہی

خدا شناسوں کی پہچان ہی کوئی نہ رہی

کہ سرکشی بھی باندازِ سرکشی نہ رہی

شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے

چراغ جلتے رہے، اور روشنی نہ رہی

بنائے ہم نے، شفاؔ! دوستی کے وہ ڈھانچے

کہ دشمنوں کو تمنائے دشمنی نہ رہی

امین حزین، خواجہ محمد مسیح پال

خواجہ محمد مسیح پال ۱۸۸۴ء میں سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ مشہور شاعر عبدالسمیع پال اثر صہبائی (ف ۱۹۶۳ء) ان کے برادرِ خرد تھے۔ ان کے والد خواجہ احمد دین پال عالمِ دینیات اور بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی تعلیم بھی عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ امین حزیں کو یہ فخر حاصل تھا کہ اقبال کی طرح انھوں نے بھی شمس العلماء سید میر حسن (ف ۱۹۲۹ء) سے عربی اور فارسی تعلیم پائی۔ اس کے بعد انگریزی کی طرف توجہ کی اور بالآخر بی اے کی سند مشن کالج، سیالکوٹ سے حاصل کی۔ ملازمت کا بیشتر زمانہ گلگت کی پولیٹیکل ایجنسی میں گزرا اور وہیں سے پنشن پائی۔ ان کی خدمات کا اعتراف انگریزی حکومت نے خطاب 'خان بہادر' سے کیا۔

اگرچہ شعر و سخن کی طرف میلان سید میر حسن کے تلمذ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا تھا، لیکن اس کا آغاز ۱۹۰۲ء میں ہوا، جب ان کی پہلی غزل لکھنؤ کے مشہور گلدستے 'پیامِ یار' میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے تمام

اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن زیادہ تر غزل اور نظم سے مزاولت رہی۔
ہماری پچھلی دو نسلیں اقبال سے متاثر ہوئی ہیں، اور ان میں سے بیشمار لوگوں نے
ان کے تتبع کی کوشش کی، لیکن کامیابی الاماشاء اللہ معدودے چند کو نصیب
ہوئی۔ ان چند خوش نصیبوں میں امین حزیں، کا نام سرفہرست ہے، جیساکہ ان کے
مجموعۂ کلام 'گلبانگ حیات' کے ہر صفحے سے عیاں ہے۔ اسرارِ حیات کی تفسیر و تعبیر
اخلاقیات اور الٰہیات سے شغف، عظمتِ آدم اور عمل کی برتری ان کے بھی
دل پسند موضوعِ سخن ہیں۔ ان کا ۱۴ اگست ۱۹۶۸ء کو سیالکوٹ میں انتقال
ہوا اور وہیں مشہور قبرستان "امام صاحب" میں سپردِ خاک ہوئے۔ اسی
قبرستان میں علامہ اقبال مرحوم کے والدِ بزرگوار شیخ نور محمد اور برادرِ اکبر شیخ
عطا محمد بھی آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

دردِ دل اصل میں نغما و لولۂ جوشِ نمو
جس سے یہ دانۂ ناچیز شجر ہو کے رہا

عشق میں جوشِ عبودیت دل دب نہ سکا
کہیں آنسو، کہیں نالہ، کہیں پر ہو کے رہا

میں نہ کہتا تھا کہ اے دیدۂ تر، ضبط سے کام
خونِ دل ہو کے رہا، خونِ جگر ہو کے رہا

لالے پڑے ہیں جان کے، جینے کا اہتمام کر
جن میں ہو کیفِ زندگی، بہرِ خدا وہ کام کر

مجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہو کائنات
بات یہ راز کی نہیں، اپنا خود احترام کر

پھونک دے نغمۂ جانسوز سے سامانِ قفس
بلبلِ تفتہ جگر! شکوۂ صیاد نہ کر

لطف جینے کا ہے جب ہی کہ دلِ مستِ خودی
آسماں تک سے یہ کہہ دے: مری امداد نہ کر

یاس میں پھوڑ کے سر مرتے ہیں کم ظرف، امین!

ظرفِ عالی ہے ترا، بیعتِ فرہاد نہ کر

تفکرات کی دنیا میں جستجوئے سکوں
اسی کے خون سے رنگیں ہو داستانِ حیات

علاج جس کا نہیں کوئی، ہو یہی وہ جنوں
محال ہو کہ جیوں، اور بیقرار نہ ہوں

افسانۂ حیات کو دہرا رہا ہوں میں
رستے کے اونچ نیچ سے واقف تو ہوں، مگر

یوں اپنی عمرِ رفتہ کو لوٹا رہا ہوں میں
ٹھوکر قدم قدم پہ مگر کھا رہا ہوں میں

نہ دے اس آگ کو نارِ خلیل سے نسبت

کہ جس کے سوز میں گلزار جاوداں نہیں

شکستِ ہمتِ عالی ہو، بیخودی کی تلاش

کہ کارخانہ ہے دنیا، شراب خانہ نہیں

بلبلِ سوختہ ساماں سے سنا ہو یہ سنے

عشق اک آتشِ بے شعلہ ہے، گلزار ہو حسن

صاف آتا ہے نظر، دیدۂ بینا کو یہی

عشق اقرارِ حقیقت ہے، اور اظہار ہو حسن

عشق بیچارہ ہی آگاہ نہیں ہے، ورنہ

روزِ میثاق سے خود اس کا طلبگار ہو حسن

اس حقیقت کو خدارا نظر انداز نہ کر
سرد ہو جاتا ہو وہ شعلہ، جو بیباک نہ ہو

اگر شمعِ حقیقت کی ضیا بار ی نہیں ہر سو

تخیل کو کہاں سے آ گئے آداب پروانہ؟

وہی اس بزمِ ہستی سے سرور اندوز ہوتے ہیں

نگاہیں جن کی ہوں بیباک اور اطوار مردانہ

اک برق ہے، ہجوم تقاضا لیے ہوئے — جانے، میں آگیا ہوں یہاں، کیا لیے ہوئے
اک تو کہ، بے حجاب نہ ہونا تری ادا — اک میں کہ شوق دید کی دنیا لیے ہوئے
اک تو کہ اپنے حسن کی ہے آپ ہی دلیل — اک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لیے ہوئے

یہ نہ ہوتا تو مر گئے ہوتے — اس دلِ بُردبار کے صدقے
وہ کریں مجھ سے احتسابِ وفا — ایسے روزِ شمار کے صدقے

غرقِ حیرت ہے چشمِ نجمِ سحر — آنکھ کی اشک باریاں، توبہ!
خاک سے رنگ و بو کا یہ طوفاں — وقت کی دستکاریاں، توبہ!

دریا کے تموّج میں دریا کی خودی پنہاں
گوہر کے تجمّل میں قطرے کی خودی پنہاں
ہر چند خودی سے ہے، ارضی کہ سماوی ہو
مہر و مہ و انجم میں ان کی ہے خودی پنہاں

نگاہِ شوق کے اعجاز کا نہ ہو منکر — خمِ شعور کا جامِ جہاں نما ہے یہی
تڑپ سے اس کی نہ ہو بیقرار، لے ناداں! — جہاں میں شور ہے جس کا، وہ ارتقا ہے یہی

خیالِ محض کجا، اور کجا عمل، ناداں! — سراب ہو نہیں سکتا، علاجِ تشنہ لبی
وہ ایک صیدِ زبوں ہے فلک کی نظروں میں — عزیز جس کو نہیں، شیوۂ جفا طلبی

ہر کام کو احساس سے نسبت ہے اضافی
اور شدّتِ احساس ہی کا نام ہے مشکل
جس شخص کا احساس نہیں عزم کے بس میں
ناکس ہے وہ، اُس کے لیے ہر کام ہے مشکل

پرتوِ مہرِ لامکاں ہے حسن — ایک تنویرِ جاوداں ہے حسن
ہستیِ کائنات ہے اس سے — رونقِ بزمِ انس و جاں ہے حسن

ہو اگر جستجو ، تو عام ہے حسن — سامنے دل کے صبح و شام ہے حسن
بو الہوس کی ، ایں! بلا جانے — اک حقیقت ہے جس کا نام ہے حسن

لا الہ الا اللہ

حریمِ نازِ خداوندِ ناز کی سوگند — نگاہِ پاک دلِ پاکباز کی سوگند
قسم ہے حسن کے اندازِ بے نیازی کی — جبینِ عشق سراپا نیاز کی سوگند
قسم ہے غزنوی بت شکن کے بازو کی — کمندِ زلفِ درازِ ایاز کی سوگند
قسم ہے مہر و مہ و انجمِ درخشاں کی — کرشمۂ فلکِ شیشہ باز کی سوگند
قسم ہے عکسِ رخِ مہر و ماہ طلعت کی — کمالِ صنعتِ آئینہ ساز کی سوگند
قسم ہے مطربِ ہستی کے ذوقِ نغمہ کی — اور اس کے درد بھرے تارِ ساز کی سوگند

ملی ہے جس کو مے لا الہ الا اللہ
وہ رندِ میکدہ مغضوب ہو نہیں سکتا

نجیب اشرف ندوی (سیّد)

ان کا وطن دیسنہ تھا، جو بہار شریف (بہار) سے سات میل مشرق کی طرف ایک بستی ہے۔ سیّد نجیب اشرف اور سیّد سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) یکجدی تھے۔ دونوں کے پردادا میر عظمت علی تھے۔ میر عظمت علی نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ بڑی بیگم سے حکیم میر محمدی ہوئے؛ اور چھوٹی سے ہاشم شیر۔ حکیم محمدی کے بیٹے حکیم ابوالحسن تھے، جو والد تھے سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے؛ اور ہاشم شیر کے بیٹے ڈاکٹر محمد مبین تھے۔ یہی نجیب اشرف ندوی کے والدِ مرحوم تھے۔

ڈاکٹر محمد مبین سرکاری ملازمت میں تھے اور اسی سلسلے میں ان کا بیشتر زمانہ سی پی (مدھیہ پردیش) میں گزرا۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر پنشن پائی اور اس کے بعد رائپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ان کا ۲۸ جولائی ۱۹۳۲ء کو انتقال ہوا۔

سیّد نجیب اشرف ۶ جون ۱۹۰۱ء کو آرموری (ضلع چاندہ۔ مدھیہ پردیش)

میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر والد سے پائی۔ اس کے بعد سرکاری اسکول میں بھیجے گئے۔ ایک تقریب میں شمولیت کے لیے ڈاکٹر محمد مبین خاندان سمیت اپنے وطن گئے تھے کہ وہاں سیّد سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی، جو اس زمانے میں دار العلوم ندوۃ العلما میں مدرّس تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے کہا کہ آپ نجیب اشرف کو تعلیم کے لیے دار العلوم بھیج دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ قبول کر لیا۔ چنانچہ نجیب اشرف ۱۹۰۵ء میں جب کہ ان کی عمر بمشکل آٹھ برس کی تھی، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دار العلوم ندوہ انتشار کا شکار ہو رہا تھا، جس کے نتیجے میں بالآخر مولانا شبلی ۱۹۱۳ء میں یہاں کی سکریٹری سے دستبردار ہوئے تھے۔ سیّد سلیمان بھی اس سے قبل ہی مولانا ابو الکلام آزاد کے مشہور ہفتہ وار اخبار الہلال کے ادارۂ تحریر میں شمولیت کی غرض سے کلکتے جا چکے تھے۔ ایسے میں نجیب اشرف بھی ندوہ چھوڑ کر پٹنے چلے گئے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہیں پٹنے میں انھوں نے دسویں درجے اور انٹر کے امتحان پاس کیے (۱۹۱۹ء) وہ بی اے کے درجوں میں زیرِ تعلیم تھے، جب ملک میں ترکِ موالات کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ بھی کالج چھوڑ، قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس میں انھیں متعدد سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے رحلت کی۔ اس کے بعد سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے اعظم گڑھ میں دار المصنفین کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے سیّد نجیب اشرف کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں رہنے سے انھیں تصنیف و تالیف سے رغبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانے میں انھوں نے مہاتما گاندھی کی بعض انگریزی

کتابوں کا ترجمہ کیا (سوراج اور رہنمائے صحت) اور ترک موالات دوسرے ممالک میں) جب سیاسی تحریک میں تعطل پیدا ہوگیا، تو انھوں نے دوبارہ اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ ان کے چھوٹے بھائی سید علی اشرف اس زمانے میں کلکتے میں تھے۔ ان کی تحریک پر یہ وہاں چلے گئے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۴ء میں بی اے کی اور ۱۹۲۶ء میں ایم اے کی سند حاصل کی؛ دونوں امتحانوں میں درجۂ اول پایا۔

تعلیم ختم کر لینے کے بعد وہ مستقلاً دارالمصنفین کے رفیق بن گئے؛ یہاں انھیں سو روپے ماہانہ کی قلیل رقم بطور وظیفہ ملتی تھی۔ اسی زمانے میں دارالمصنفین نے رقعاتِ عالمگیر کی ترتیب و تدوین ان کے سپرد کی تھی۔ یہ کام انھوں نے مؤرخِ شہیر سرجدو ناتھ سرکار کی نگرانی اور رہنمائی میں کیا تھا۔ اس سلسلے میں مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر اور رقعاتِ عالمگیر (جلد اول) شائع ہوئی تھی۔ افسوس کہ یہ مفید کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔ میں نے دوسری جلد کے مسودات مرحوم کے پاس دیکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں جوں کا توں شائع کر دینا چاہیے، ورنہ یہ بھی ضائع ہو جائیں گے۔ زمانۂ قیامِ اعظم گڑھ میں وہ معارف کی ترتیب میں بھی سید سلیمان مرحوم کا ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔

۱۹۳۰ء میں وہ گجرات کالج، احمد آباد میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ اگلے ہی برس ۱۹۳۱ء میں حکومتِ بمبئی نے اسماعیل یوسف کالج قائم کیا۔ اس پر سید نجیب اشرف گجرات کالج کی ملازمت ترک کر کے بمبئی آ گئے اور اس نئے کالج میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اسی ادارے میں رہے اور یہیں سے ۱۹۵۵ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

انھوں نے بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ مضافات کے علاقہ اندھیری

میں اپنا مکان تعمیر کر لیا تھا۔ وہ بمبئی کی تعلیمی، ثقافتی، سماجی زندگی کا جزوِ لاینفک تھے اور سب حلقوں میں (ندوی صاحب) کے علَم سے معروف تھے۔

جب وہ ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازمت سے الگ ہوئے، تو انجمنِ اسلام نے انھیں اپنے نئے ادارے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا۔ یہاں وہ اپنی وفات تک رہے۔ ادارے کا تماہی رسالہ نوائے ادب بھی انھیں کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

ان کی آخری شائع شدہ کتاب لغات گجری، تھی۔ انھوں نے تصنیفی کام زیادہ نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ تھی۔ وہ حکومت کی اور مختلف تعلیمی اداروں کی اتنی کمیٹیوں اور بورڈوں کے رکن اور مشیر تھے کہ لکھنے پڑھنے کے لیے ان کے پاس کوئی وقت بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح ان کی علمی صلاحیتیں گویا پوری طرح بروے کار نہ آسکیں۔ اس سے ہمارے بعض دوسرے اہلِ علم کو سبق لینا چاہیے، جو اپنا وقت غیر علمی کاموں میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔

جمعرات ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو دوپہر کے وقت بمبئی اسپتال میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن شب میں تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور دار لا قبرستان میں اپنی مرحومہ بیگم کے برابر دفن کیے گئے۔

میرے ان سے بیس برس کے تعلقات تھے۔ ان کے سے بلند اخلاق، وضعدار، بامروت، سیر چشم دوست اب کہاں ملینگے! اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہ رَاجِعُون

محمد مقتدیٰ خان شروانی

پڑھے لکھے حضرات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی پریس کی اردو مطبوعات پر ایک زمانے سے یہ چھپا ہوا پڑھتے آئے ہونگے : باہتمام محمد مقتدیٰ خان شروانی ۔ افسوس، ان مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خان شروانی کا ۲۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو علی گڈھ میں انتقال ہو گیا! انھوں نے اس مطبع کے اور بعد کو اپنے ذاتی مطبع شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڈھ کے ذریعے سے اردو کی طویل خدمت کی۔ وہ خود بھی مصنف اور مؤلف تھے۔ اگرچہ انھیں اس سے کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ ہم ان کے حالات قلمبند کر کے جہاں ایک طرف ان کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں، وہیں

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن

کے مصداق سمجھتے ہیں کہ ان کی خوبیاں اس قابل ہیں کہ ہمارے نوجوان ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

ہندستان کے مشہور شروانی پٹھان خاندان کی ایک شاخ بلوہ (ضلع علی گڈھ) میں مقیم ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ یوسف خان ساکن راجمبُو تھے۔ اس خاندان کے اکثر

افراد بلوسنہ سے نقل مکان کرکے دوسری جگہوں میں جا کر بس گئے۔ یوسف خان کی ساتویں پشت میں رشید خان (بن دلیل خان) تھے، یہ بلوسنہ ہی میں رہے۔ خدا نے ان کی اولاد میں بہت برکت دی۔ درحقیقت آج بلوسنہ کا خاندان شروانی انھیں کے اخلاف پر مشتمل ہے۔

انھیں رشید خان کی چوتھی پشت میں محمد مستجاب اللہ خان تھے۔ انھیں باپ سے جو کچھ ترکے میں ملا انھوں نے اس پر اپنی سلیقہ مندی سے اضافہ کیا، اور نیل سازی کی کوٹھی بھی قائم کی۔ ان نواح میں ان کے معاملات داد و ستد کی شہرت تھی۔ اردو میں شعر بھی کہتے اور اپنے نام کی مناسبت سے مقبول تخلص کرتے تھے۔ داغ سے اصلاح لیتے تھے۔ پیام یار کی پرانی جلدوں میں ان کا کلام ملتا ہے۔ کچھ نثری مضمون بھی ریاض الاخبار میں شائع ہوئے تھے۔ ملکی سیاست سے بھی دلچسپی تھی، کانگریس کے رکن تھے۔ ان کی دوربینی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آج سے ستّر برس پہلے ۱۸۹۵ء میں انھوں نے ایک ہندو پنڈت کو ملازم رکھ کر اپنی چھوٹی بیٹی (امتہ الغنی) کو ہندی پڑھائی۔ ۱۹۱۷ء میں رحلت کی۔

انھیں محمد مستجاب اللہ خاں کے اکلوتے بیٹے محمد مقتدیٰ خاں شروانی مرحوم تھے۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی ربیع الاول ۱۲۹۷ھ (فروری/مارچ ۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ محمد مقتدیٰ خاں ان کا تاریخی نام ہے، جس سے (۱۲۹۷) برآمد ہوتے ہیں، فارسی عربی کی تعلیم نجی طور پر ہوئی۔ باقاعدہ انگریزی تعلیم ڈھولنہ (ضلع علی گڑھ) کے اسکول سے شروع ہو کر ۱۸۹۹ء میں ایم اے او اسکول علی گڑھ تک پائی۔ یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ پنڈت اندرمن مرادآبادی علی گڑھ اسکول میں ان کے ہم جماعت تھے۔ وہ ان سے عربی اور یہ ان سے سنسکرت پڑھتے تھے۔ میرے خیال میں نہ انھیں عربی آئی، نہ انھیں سنسکرت۔

شروانی صاحب کو نہ خاندانی جاداد کی دیکھ بھال سے کوئی دلچسپی تھی، نہ زمینداری اور کاشتکاری سے۔ وہ شروع سے اخبار بینی کے رسیا تھے، اسی سے مضمون نویسی کا چسکا پڑا۔ یہی شوق انھیں لاہور لے گیا اور وہ ۱۹۰۲ء میں جب ان کی عمر بمشکل ۲۲-۲۳ برس کی تھی، منشی محبوب عالم کے

روزنامہ پیسہ اخبار کے ادارہ تحریر سے منسلک ہو گئے۔ اس اخبار کے علاوہ لاہور کے کئی دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کے مضمون چھپتے رہے۔ اس سے نہ صرف لکھنے کی مشق حاصل ہوئی، بلکہ انھیں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوا، اور بہت حد تک ان کی صلاحیتوں کا رجحان اور مستقبل کا پروگرام بھی طے ہو گیا۔

۱۹۰۹ء کے آخری مہینوں میں وہ لاہور سے علی گڑھ واپس آگئے۔ یہ وقار الملک (ف جنوری ۱۹۱۷ء) کی سکریٹری کا زمانہ تھا۔ مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی (ف جولائی ۱۹۲۸ء) نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے چھٹی لے لی تھی۔ اس پر محمد مقتدی خاں قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۱۱ء میں وہ مشہور خبر رساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس کی ملازمت اختیار کر کے اس کے مقامی نامہ نگار بن گئے۔ اس عہدے پر وہ چودہ برس کی طویل مدت (یعنی ۱۹۲۵ء تک) رہے۔

۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اب اس کا پریس (جہاں گزٹ چھپتا تھا) مسلم یونیورسٹی پریس کہلایا۔ محمد مقتدی خاں شروانی اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اب تک اس میں صرف لوہے کے چھاپے کا انتظام تھا؛ شروانی صاحب نے اس میں پتھر کے چھاپے کا اضافہ کیا۔

۱۹۱۴ء میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (ف جون ۱۹۲۶ء) نے کلیات امیر خسرو کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کی داغ بیل ڈالی تھی؛ اس سلسلے کی سرپرستی حضور نظام دکن میر عثمان علی خاں (ف فروری ۱۹۶۷ء) نے قبول فرمائی تھی۔ اس مجموعے کی مختلف کتابیں ترتیب و تدوین کے لیے متعدد اصحاب قلم میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ خمسۂ خسروی کی پہلی مثنوی مطلع الانوار کی تصحیح محمد مقتدی خاں شروانی ہی نے کی تھی۔ افسوس کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا اور صرف آٹھ جلدیں چھپ سکیں۔ اگر یہ منصوبہ پورا ہو جاتا، تو علم و ادب کی بہترین خدمت ہوتی۔ وما توفیقنا الا باللہ العظیم

یہاں غالباً ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔
یہ کتابیں بہت اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ بہترین کتابت، چکنا قیمتی کاغذ اور چھپائی مسلم یونیورسٹی پریس کی جس کے کرتا دھرتا شروانی صاحب خود تھے۔ سارا کام خود ان کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اور نتیجہ اتنا شاندار رہا کہ جس نے بھی یہ مجموعہ دیکھا، اش اش کر اٹھا۔ نواب عمادالملک مرحوم قدردانِ علم و فن تھے۔ یہ منصوبہ بنا ہی ان کی تجویز پر تھا اور انہی کی سفارش پر نظامِ دکن نے اس کی سرپرستی منظور فرمائی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں کتابیں چھپ کر آئیں، تو انھوں نے حضور نظام کی طرف سے شروانی صاحب کو نظام، عمادخسرو تمغہ دلوایا۔
طباعت میں مہارت کے باعث انھیں تین اور تمغے بھی ملے تھے: اول: سلیمان اشرف' المبین تمغہ (۱۹۲۹ء) پروفیسر مولانا سلیمان اشرف نے اپنی کتاب المبین کی حسن و خوبیِ طباعت پر دیا۔ دوم: سرور جنگ کارنامہ تمغہ (۱۹۳۳ء) نواب سرور الملک بہادر استاد نواب محبوب علی خان نظام دکن نے اپنی سوانح عمری کارنامۂ سروری لکھی تھی۔ یہ کتاب شروانی صاحب کی نگرانی میں بڑی آب و تاب سے چھپی۔ اس پر مصنف کے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ نے یہ تمغہ دیا۔ سوم: مزمل، سلیمان البشریٰ تمغہ (۱۹۲۸ء) مولانا عنایت رسول چریاکوٹی (ف جنوری ۱۹۰۳) اپنے عہد کے یگانہ عالم تھے۔ سرسید بھی ان سے گہرے تعلقات تھے۔ انھوں نے ۴۰ سال کی تحقیق اور تجسس کے بعد ایک کتاب بشریٰ تصنیف کی، جس میں توراۃ اور عہدنامۂ قدیم سے صداقتِ رسول صلعم و اسلام ثابت کی گئی تھی۔ سر شاہ محمد سلیمان کی جوان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ دلی خواہش تھی کہ کتاب چھپ جائے۔ چونکہ اس میں عبرانی کے بہت سے اقتباسات تھے، اس لیے کتاب کا ہندستان میں چھپنا بہت دشوار تھا، لیکن شروانی صاحب نے یہ مہم سر کر لی اور کتاب طبع کر دی۔ اسی پر نواب مزمل اللہ خان نے یہ تمغہ دیا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں علی گڈھ ایم اے او کالج کی پچاس سالہ جوبلی ہوئی۔ اس موقع پر اردو کانفرنس اور مسلم پریس کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھیں۔ جن کے صدر نواب صدر یار جنگ مرحوم (ف اگست ۱۹۵۰ء) مولوی بشیر الدین مدیر البشیر اٹاوہ (ف جون ۱۹۵۶ء) ان دونوں کانفرنسوں کی استقبالیہ مجلسوں کے صدر محمد مقتدیٰ خان شروانی تھے۔

۱۹۳۶ء میں کسی وجہ سے یونیورسٹی نے اپنا پریس فروخت کر دیا۔ شروانی صاحب کو اس کام کا جو تجربہ تھا اب اس سے مستفید ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ کوئی اور مطبع قائم کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے 'شروانی پرنٹنگ پریس' کے نام سے اپنا ذاتی مطبع جاری کر دیا' جو بدستور ان کی نگرانی میں اعلیٰ معیار کی کتابیں چھاپتا رہا۔

مرحوم کو اردو مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ بڑے زود نویس تھے، اور نظم و نثر دونوں پر یکساں قادر تھے شعر بھی کہتے اور اپنے نام (مقتدیٰ) کی رعایت سے کبھی کبھی 'رہبر' تخلص کرتے تھے۔ مزاج کے تلون کے باعث کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کب مدح سے قدح پر اتر آئیں۔ اس لیے یہ واقع ہے کہ سب ان سے خائف رہتے تھے۔

میری ان سے ملاقات نواب صدر یار جنگ مرحوم کی وساطت سے ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت لطف سے پیش آتے تھے۔ علی گڈھ جانا ہوتا تو حتی الامکان سلام کو ضرور حاضر ہوتا۔ ایک دن باتوں باتوں میں' نہ معلوم کیسے مشہور صوفی شاعر صاحب لمعات و عشاق نامہ حضرت فخر الدین عراقی ہمدانی (ف ۱۲۸۹ء) کا ذکر چل پڑا۔ ان کی ایک غزل بہت مشہور ہے جس کا مطلع ہے:

نخستین بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

میں نے کسی مناسبت سے یہ شعر پڑھا' تو غالباً قافیے کی وجہ سے ان کا ذہن میرے نام کی طرف منتقل ہو گیا؛ اس پر فوراً شعر کہا:

مے وحدت کہ اندر جام کردند
ز مالک رام، گویم، دام کردند

چھوٹی موٹی کوئی درجن بھر کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ مضامین کی بھی خاصی تعداد مختلف رسالوں میں منتشر پڑی ہے۔ مولوی سیّد احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ کے دوسرے ایڈیشن کی ترتیب و تدوین میں بھی وہ مصنف کے دستِ راست تھے، جس کا اعتراف مولوی سیّد احمد نے کیا ہے۔

شب جمعہ ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو بعمر ۸۸ سال (قمری ۹۱ سال) علی گڑھ میں انتقال کیا، اور وہیں قبرستانِ شاہ جمال میں سپردِ خاک ہوئے۔

حکیم احمد شجاع

لاہور کے مشہور حکیموں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ لاہور کا بازار حکیماں اسی خاندان سے منسوب ہے۔ احمد شجاع ۱۸۹۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اپنی ملازمت کے بیشتر زمانے میں پنجاب قانون ساز اسمبلی کے سکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ لاہور کے ماہانہ رسالے "ہزار داستان" کے اڈیٹر رہے، افسانے لکھے، فلم تک سے تعلق رہا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ساحر تخلص تھا۔

کسی زمانے میں قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ خدا معلوم، یہ مکمل ہوئی یا نہیں! اس سے متعلق ایک لطیفہ ہے!

کسی نے علامہ اقبال مرحوم کو بتایا کہ حکیم احمد شجاع تفسیر قرآن لکھ رہے ہیں، تو فرمایا کہ ہم آج تک حضرت حسینؓ کو سب سے بڑا مظلوم مانتے آئے ہیں، لیکن اب یہ رائے تبدیل کرنا پڑے گی! آج قرآن سب سے زیادہ مظلوم ہے کہ ہر کہ و مہ اس کی تفسیر لکھنے

لگا ہے۔

۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو اپنے ذاتی مکان (فیروزپور روڈ، لاہور) میں انتقال کیا؛ اور وہیں چوبرجی کے قریب اپنی خاندانی ہڑواڑ میں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

یوپی کے ضلع فرخ آباد میں پٹھانوں کی ایک بستی قائم گنج ہے، اور اس کے مضافات میں ایک مختصر گاؤں پتورہ نام کا ہے۔ اب تو ان لوگوں میں ماشاء اللہ کبھی کبھار کوئی پڑھا لکھا آدمی نظر آجاتا ہے، لیکن یہ ذکر پچھلی صدی کے آخری رُبع کا ہے۔ اس زمانے میں یہاں کے باشندوں کا دل پسند مشغلہ باہمی مار پیٹ اور مقدمہ بازی تھا۔ یہاں کا ہر ایک سپوت دعویدار تھا کہ،

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

اس لیے پڑھنا لکھنا ان حضرات کے نزدیک کوئی ذریعۂ عزت نہیں تھا جس کے لیے جان جوکھم میں ڈالی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہاں کے ایک نوجوان فدا حسین خان صاحب نے نیزے کی جگہ قلم ہاتھ میں لیا اور مقامی اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول میں داخلہ لے کر اردو فارسی پڑھنے لگے، تو ان کے ہم وطنوں نے انھیں بدعتی اور آبائی روایات سے باغی قرار دیا۔

فدا حسین خان صاحب حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں تجارت

کرینگے، لیکن حیدرآباد پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا، اور اس کی جگہ وکالت کی تعلیم حاصل کرنے لگے، اور پھر اسے بطور پیشہ اختیار کرلیا لیکن اس سے بھی بڑا اور اہم تر کام حیدرآباد لا رپورٹ Hyderabad Law Reporter کی تدوین و ترتیب اور اشاعت کا تھا۔ اس کی مانگ موجود تھی، چنانچہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس میں انھیں بہت کامیابی ہوئی۔ فروری ۱۸۹۷ء؁ میں خدا نے فدا حسین خاں صاحب کو تیسرا بیٹا دیا، تو انھوں نے اس کا ذاکر حسین خاں نام رکھا۔ یہی ہمارے ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں، جنھیں ان کے بے تکلف دوست اور چاہنے والے محبت سے "ذاکر صاحب" کہتے تھے۔ ذاکر صاحب کا بچپن حیدرآباد میں گزرا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابھی کم عمری کا زمانہ تھا کہ حضرت پیر حسن شاہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ان پیر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ چونکہ اس کا بالواسطہ طور پر ذاکر صاحب کی تعلیم و تربیت اور عام زندگی پر بھی اثر پڑا، اس لیے اس کا بیان سودمند ہوگا۔

پیر حسن شاہ صاحب کے مرشد، حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی تھے۔ پیر حسن شاہ کو اوائلِ عمر میں ہندوؤں سے سخت کد تھی۔ یہی نہیں کہ وہ انھیں اچھا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے برخلاف برملا بھلا تک سب کچھ کہہ جانے میں بھی انھیں دریغ نہیں تھا۔ حضرت شاہ طالب حسین کو بھی اس کا علم ہوا۔ چونکہ ان کا یہ رویّہ تصوّف کی صلحِ کل اور رواداری کی تعلیم کے خلاف تھا، انھوں نے مرید کی اصلاح

ے ایک مرتبہ میں نے مرحوم سے دریافت کیا کہ صحیح تاریخِ ولادت کیا ہو، تو فرمایا کہ سال یقیناً ۱۸۹۷ء ہے، مہینا غالباً فروری کا ہے تاریخ اور دن کا تعین اب ممکن نہیں، کیوں کہ سب خاندانی کاغذات اور یادداشتیں ضائع ہوگئیں۔

کا ایک انوکھا علاج تجویز کیا۔ فرمایا کہ سر پر ہندوؤں کی سی چوٹی رکھو اور پیشانی پر قشقہ لگاؤ اور اسی سج دھج سے پا پیادہ پشاور تک جاؤ۔ دورانِ سفر میں اگر کوئی ہندوؤں کا تیرتھ استھان آئے تو اس کی بھی زیارت کر لو۔ جاؤ اور پھر اسی طرح سے واپس آؤ۔ اس سے مقصود یہ تعلیم دینا تھی کہ کسی نے چوٹی رکھ لی، تو کیا! اور کسی نے داڑھی بڑھائی، تو کیا! ان ظواہر سے کسی کے ایمان اور اخلاق اور ارتقاء سے متعلق حکم نہیں لگایا جا سکتا؛ اصلی چیز باطن کی صفائی اور پاکیزگی ہے۔

حکیمِ مطلق نے جو سیروا فی الارض کا حکم دیا ہے، اس سے دوسرے فوائد کے علاوہ یہ تعلیم بھی منظور تھی کہ اس طرح انسان کو رنگا رنگ تجربے حاصل ہونگے اور اس کا دل اور نظر وسیع ہو جائینگے۔ ہمارے حکیم شاعر نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بارے اس سفر کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور جناب حسن شاہ قبلہ نے باقی عمر انسان دوستی اور محبت کی تعلیم عام کرنے میں بسر کر دی، جو ہر مذہب اور ضابطۂ اخلاق کی علّتِ غائی ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ڈاکٹر صاحب کے دادا غلام حسین خان صاحب عرف چھمّن خاں مرحوم سے متعلق بھی بیان ہوا ہے۔ انھیں فقراء اور اہل اللہ سے بہت عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنے رہنے کے لیے پختہ حویلی تعمیر کرنا شروع کی۔ ایک دن نہیں معلوم، کس بات پر، وہ کام کرنے والے مزدوروں سے بہت سختی سے پیش آئے اور انھیں گالیاں دیں۔ جب ان کے مرشد تک یہ بات پہنچی، تو انھوں نے فرمایا

چھمن خان! اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری اولاد اس حویلی میں خیر و عافیت سے بسر کرے اور پھلے پھولے، تو اس بد زبانی کا کفّارہ ادا کرو، اور وہ اس طرح سے کہ متھرا جاکر وہاں چندے فلاں ہندو سادھو کی صحبت میں رہو اور ان سے پریم کرنے اور کرودھ پر قابو پانے کا گیان حاصل کرو۔ جب یہ سیکھ جاؤ، تو واپس آکر باقی عمارت مکمل کر لینا۔ ارادتمند چھمن خان نے تعمیلِ ارشاد میں متھرا کی راہ لی اور کچھ مدّت اس پریم نگری میں اس سادھو کی خدمت میں رہے اور پھر واپس آکر ادھورا مکان پورا کیا۔

یہی رواداری کی تعلیم نوجوان ذاکر حسین خان کے ورثے اور حصّے میں آئی۔ پیر حسن شاہ صاحب کو کتابیں جمع کرنے اور مطالعے کا بھی بہت شوق تھا، وہ جہاں جہاں گردش کرتے تھے ہی، جہاں جاتے، وہاں سے کتابیں بٹور بٹور کر ساتھ لاتے۔ ان میں سے لامحالہ بعض انھیں مستعار لینا پڑتیں، جو وہ اس وعدے پر لاتے کہ انھیں لوٹاکر واپس کر دینگے۔ چنانچہ جب وہ لدے پھندے حیدرآباد پہنچتے، تو ذاکر صاحب کو حکم ہوتا کہ ان کو نقل کر لو۔ یہ سلسلہ ان کے حیدرآباد کے قیام اور پھر اٹاوہ اسکول تک جاری رہا۔ ذاکر صاحب بہت خوشخط تھے۔ یہ اسی ابتدائی زمانے میں ان کتابوں کے نقل کرنے کی مشق کا نتیجہ تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول بھیج دیے گئے۔ یہاں انھوں نے دسویں درجے تک پڑھا؛ اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ ایف ایس سی کا امتحان انھوں نے یہیں ایم اے او کالج سے دیا۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اسے بطور پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اب بی ایس سی کے لیے انھوں نے کرسچین کالج، لکھنؤ کا انتخاب کیا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ یہاں وہ سخت بیمار پڑ گئے اور انھیں

کالج چھوڑنا پڑا۔ تندرستی بحال ہو جانے پر دوبارہ علی گڑھ کالج میں آگئے، جہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ ۱۹۲۰ء میں ایم اے کے آخری سال میں تھے، جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ ہمارے صفِ اول کے سیاسی رہنماؤں (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ) نے علی گڑھ کا رخ کیا اور طلبہ کو ترغیب دی کہ وہ کالج سے ترک موالات کریں۔ بڑی ردّوکد کے بعد طلبہ کی ایک معقول تعداد نے ان اکابر کے حکم پر لبیک کہی اور کالج سے نکل آئے۔

ان نوجوانوں کے سرخیل ذاکر صاحب تھے۔ علی گڑھ کالج کے کرتا دھرتا اس زمانے میں ڈاکٹر (سر) ضیاء الدین مرحوم تھے، جن سے بڑا انگریزوں کا اور انگریزیت کا مدّاح اس اجوبہ زارِ ہندستان میں بھی شاید ہی کوئی اور ہوا ہو۔ ذاکر صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی انھی صفاتِ عالیہ کے باعث ان کے سفر کی مخالف سمت کو اپنی منزلِ مقصود قرار دے لیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب یہ اکابرِ قوم علی گڑھ میں جمع ہوئے اور انھوں نے ہم سے کالج چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا، تو میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی حیص بیص میں تھا کہ ایک دن ڈاکٹر صاحب موصوف نے بلا بھیجا۔ حاضر ہوا۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ ارشاد فرمایا: دیکھو، ناتجربہ کاری میں کوئی غلط اقدام نہ کر بیٹھنا۔ یہاں کالج میں رہو گے، تو خدا چاہے، سال بھر کے اندر ہی ڈپٹی کلکٹری مل جائیگی۔ اس کے بعد زندگی بھر مزے اڑاؤ گے۔

فرمایا: ڈاکٹر صاحب کی اس بزرگانہ نصیحت نے مجھے اتنے دن کی الجھن سے نجات دلادی۔ میں جو فیصلہ کرنے میں اتنی دشواری محسوس کر رہا تھا، وہ اب خود بخود رفع ہو گئی۔ ان کے وہاں سے واپس آکر میں نے کالج چھوڑ دیا۔

یہ تھی بنیاد جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی۔
۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء جمعہ کا دن ہمارے ملک کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ اس دن علی گڑھ کے چند نوجوان طالب علموں نے یہ فیصلہ کیا کہ آج سے ہم حکومت کے دست نگر نہیں ہونگے، آج سے ذریعۂ تعلیم کوئی بدلیسی زبان نہیں، بلکہ ہماری مادری زبان ہوگی؛ آج سے تعلیم کا مقصد میکالے کے الفاظ میں حکومت کے کارندے نہیں، بلکہ، ملک و ملت کے مخلص خادم، پیدا کرنا ہوگا۔
ذاکر صاحب دو برس تک جامعۂ ملیہ میں معاشیات پڑھاتے رہے، لیکن علی گڑھ چھوڑنے سے ان کی اپنی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ اس کی تکمیل کے لیے وہ بالآخر ۱۹۲۳ء میں جرمنی چلے گئے جہاں سے تین برس بعد ۱۹۲۶ء میں وہ برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ (معاشیات) کی سند لے کر واپس آئے۔
ہم میں سے بہت لوگوں نے اردو دیوان غالب کا برلن اڈیشن دیکھا ہوگا، لیکن اس کے چھپنے کی داستان شاید سب کو معلوم نہ ہو۔
جس زمانے میں ذاکر صاحب برلن میں تھے، انہی دنوں پروفیسر محمد مجیب بھی وہیں تھے۔ یہ وہاں خاص طور پر چھاپے خانے سے متعلقہ امور کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے تھے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین بھی یہیں تعلیم پا رہے تھے۔ یہ دونوں حضرات تو خیر کچھ پڑھنے لکھنے کو گئے تھے اور اس میں لگے رہتے، لیکن ذاکر صاحب کو علی گڑھ میں جو لپکا قلندری اور کھلنڈرے پن کا پڑ چکا تھا، اس سے مجبور، یہ بالعموم طرح طرح کے منصوبے بازی اور اسکیم سازی میں مشغول رہتے۔ یہاں برلن میں ایک چھاپہ خانہ کاویانی پریس کے نام سے قائم تھا، جس کے مالک ایک ایرانی صاحب، تقی زادہ نامی تھے۔ ذاکر صاحب نے تجویز پیش کی کہ اردو کی بعض کتابیں صحت اور صفائی سے چھاپی جائیں۔ تقی زادہ بھی اس پر تیار ہو گئے۔ پہلا قرعہ غالب کے

اردو دیوان پر پڑا۔ اس کے مصارف کے لیے ذاکر صاحب نے ان دونوں۔ مجیب صاحب اور عابد صاحب۔ کی جیبیں خالی کروالیں۔ یہ دیوان چھوٹے جیبی کتابی سائز پر چھپا ہے۔ اعلیٰ کاغذ، خوبصورت ٹائپ، بیل دار جدول، دو رنگی چھپائی، نفیس مضبوط جلد۔ غرض ہر ایک چیز خوب سے خوب تر ہے۔ اس کے ساتھ غالب کی ایک موقلم کی تصویر بھی ہے۔

اس اڈیشن کی دو خصوصیتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں؛

پہلی یہ کہ اس کی کمپوزنگ کا بیشتر کام خود ذاکر صاحب نے کیا تھا۔ یہ اس زمانے میں ساتھ ساتھ حرف جوڑنے (کمپوزنگ) کا کام بھی سیکھ رہے تھے۔ اتفاق سے ان ایام میں شہر میں یہ کام کرنے والے بھی کافی نہیں تھے۔ اس لیے تاخیر کا اندیشہ تھا۔ شاید اس طرح مصارف میں کچھ بچت بھی منظور ہو، چنانچہ انھوں نے دیوان اردو میں اس کام کا زیادہ حصّہ خود کیا؛ کچھ حصّہ مجیب صاحب کا بھی جوڑا ہوا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھ جو تصویر شامل ہے، یہ اصلی نہیں ہے، بلکہ لائپزگ کے رہنے والے ایک جرمن مصوّر کی بنائی ہوئی ہے۔ ہوا یہ کہ جب دیوان چھپنا طے ہوا، تو تجویز ہوئی کہ اس میں غالبؔ کی تصویر بھی ہو۔ موجودہ تصویروں میں سے کوئی انھیں پسند نہ آئی۔ اردوئے معلّیٰ اور یادگارِ غالبؔ میں غالب کے حُلیے اور لباس سے متعلق اچھی خاصی تفصیل موجود ہے۔ دیوان فارسی کے ساتھ لیتھو کی تصویر بھی چھپی ہے۔ یہ سب باتیں اس مصوّر کو بتائی گئیں اور انھوں نے اپنے ذہن سے یہ تصویر بنادی۔ خدا کی شان، آج یہی تصویر سب سے زیادہ دیکھنے میں آتی ہے!

برسبیلِ تذکرہ، یہ بھی یاد رہے کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اچھے خاصے شاعر بھی تھے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے؛ شیداؔ تخلص تھا۔ دیوان غالبؔ کے بعد ذاکر صاحب نے اسی چھاپے خانے سے دیوان شیداؔ بھی اسی اہتمام

سے شائع کیا تھا۔ اس کی کمپوزنگ سرتا سر مجیب صاحب کا کارنامہ ہے۔
جرمنی سے واپس آنے کے بعد ذاکر صاحب کی زندگی کا سب سے اہم دور شروع ہوا۔ ان کی غیر حاضری ہی میں جامعۂ ملیہ کی جماعتیں اور دفتر علی گڑھ سے دلی منتقل ہو چکے تھے۔ ذاکر صاحب اب شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مقرر ہوئے۔ خوش قسمتی سے انھیں ساتھ کام کرنے والے ایسے کارکن مل گئے، جنھیں ان پر کامل اعتماد تھا اور جو خود بھی پورے اعتماد کے قابل تھے۔ ان میں پروفیسر محمد مجیب (موجودہ شیخ الجامعہ) ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا اسلم جے راج پوری، مولانا خواجہ عبدالحی، سعید انصاری، حافظ فیاض احمد، حامد علی خاں، وغیرہم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔
جامعۂ ملیہ کی مالی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کا بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ خود بھی بہت کچھ دیتے رہتے تھے اور ان کے ذریعے سے فتوح بھی ملتی رہتی تھیں۔
جب دسمبر ۱۹۲۷ء میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، تو اب جامعۂ ملیہ کا بار ڈاکٹر انصاری مرحوم کے کندھوں پر آ پڑا۔ یہ بڑا سختی کا دور تھا۔ آمدنی کم، بلکہ مفقود اور قرض کی مصیبت اس پر مستزاد۔ امنا (ٹرسٹیوں) کی کثرت نے یہ رائے دی کہ چونکہ جامعہ کو چلانے کے لیے ضروری مالی انتظام نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بند کر دی جائے۔
ذاکر صاحب کی ایک خصوصیت جو مرورِ زمانہ سے ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی، ان کا خطرے میں بے دھڑک کود پڑنے کا انداز تھا۔ کوئی نازک مرحلہ ہو یا مشکل مقام ہو، مصیبت کا احتمال ہی نہیں، یقین ہو۔ اس سے ان کے اندر کا پٹھان جو یوں تصوف اور تعلیم کی چادر تانے سویا رہتا، جاگ اٹھتا۔ یہ ان کے لیے

چیلنج کا حکم رکھتا، اور یہ بات ان کی شانِ مردانگی کے منافی تھی کہ وہ یہ بیڑا اٹھانے سے انکار کر دیں۔ اب بھی یہی ہوا۔ جب ٹرسٹیوں نے جامعہ کے بند کر دینے کا فیصلہ کیا، تو ذاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا:

ہم جامعہ کو بند نہیں ہونے دینگے، اور جیسے بھی بن پڑا، اسے چلائینگے۔ گیارہ اساتذہ اور کارکنوں نے عہد کیا کہ ہم بیس برس تک ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ مشاہرہ طلب نہیں کرینگے۔ لیکن ان بے چاروں کو یہ ڈیڑھ سو بھی کب دیا گیا، بلکہ بعض اوقات مہینوں کسی کو ایک حبہ تک نہیں ملا۔

غرض اس کے بعد ان لوگوں کو کلیتہً اپنے زورِ بازو پر تکیہ کرنا پڑا۔ ملک کے دردمند اور صاحبِ احساس طبقے نے جب بھی اور جو کچھ بھی ان کی جھولی میں ڈال دیا، انھوں نے اُسے صبر و شکر سے قبول کیا۔ ان غریبوں نے یہ ایام کس تنگی ترشی سے گزارے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیجیے۔ ۱۹۴۳ء یا شاید ۱۹۴۴ء میں نظام حیدر آباد کی حکومت نے جامعۂ ملیہ کو پانچ لاکھ کا گرانقدر شاہانہ عطیہ دیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی راوی ہیں کہ جب ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی، تو میں نے اس کامیابی پر انھیں مبارک باد دی۔ خوش ہو کر کہا: رشید صاحب، آج گیارہ برس میں پہلی مرتبہ جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دے سکا ہوں۔

ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جس تندہی اور یکسوئی، صبر اور استقلال، ایثار، اور خودداری سے یہ فرض بنا ہا، اس کی شاہد ساری دنیا ہے۔ خدا نے بھی ان قربانیوں کو نوازا، اور شرف قبولیت بخشا۔ ملک آزاد ہو گیا اور آج جامعۂ ملیہ اسلامیہ ملک کی تعلیمی جد و جہد میں ہر پہلو سے صف اوّل میں ہے۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔ لیکن چونکہ آزادی اور ملک کی تقسیم توام آئیں۔ اس لیے مدتوں ملک میں انتشار اور بد امنی کا دور دورہ رہا۔ خاص طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے، اور اس کی ہستی تک معرضِ خطر میں آگئی۔ حکومتِ وقت نے دیکھا کہ اگر اس وقت کوئی تجربہ کار اور معتبر شخصیت یونیورسٹی کا نظم و نسق ہاتھ میں نہیں لیتی، تو یہ سرسید کا لگایا ہوا پودا صرصرِ حوادث کا شکار ہو جائیگا۔ آخر نگاہِ انتخاب ذاکر صاحب پر آن ٹھہری۔ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم وزیرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے بلوا بھیجا اور ان سے کہا کہ یونیورسٹی کو بچانے کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ وائس چانسلر بن کر وہاں چلے جائیں۔ یہ عذر کرنے لگے۔ اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور جامعہ ملیہ کی ذمہ داریوں کا بھی ذکر کیا۔ اس پر مرحوم نے نفسیاتی ہتھیار استعمال کیا۔ کہنے لگے: اچھا اگر آپ نہیں جانا چاہتے، تو ہمیں مجبوراً فلاں صاحب کو بھیجنا پڑیگا۔ یہ صاحب مرفوع القلم ہو چکے تھے۔ ایسے چیلنج پر ذاکر صاحب بھلا کیونکر طرح دے جاتے۔ ان کے نام کا سننا تھا کہ انھوں نے فوراً پیشکش قبول کر لی اور علی گڑھ چلے گئے۔

یہ نومبر ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ یہاں یہ ۱۹۵۶ء تک رہے۔ ان آٹھ برس میں انھوں نے یونیورسٹی کی ساکھ پھر سے قائم کر دی، جو آزادی سے پہلے کے دو تین برس میں ملیامیٹ ہو گئی تھی۔ وہ پودا جو بادِ سموم کے جھونکوں سے مرجھایا جا رہا تھا، ذاکر صاحب کی آبیاری اور نگرانی کے صدقے پھر سے لہلہا اٹھا اور اس میں نئے سرے سے پھل پھول آنے لگے۔

۱۹۵۷ء میں وہ بہار کے گورنر مقرر ہوئے! اور جب چار برس بعد اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے تو ۱۳ مئی ۱۹۶۲ء کو جمہوریۂ ہند کے نائب صدر بنا دیے گئے ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارتِ جمہوریہ ہند کی میعاد ختم ہوئی۔ نیا انتخاب ہوا، تو قوم نے ملک کے اس سب سے بڑے عہدے کے لیے ذاکر صاحب کو منتخب کیا۔ یہ انتخاب چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ افسوس کہ قوم ان کی خدمات سے اس پوری مدت کے لیے بہرہ مند نہ ہو سکی!

۳ مئی ۱۹۶۹ء صبح گیارہ بجے ان پر دل کا دورہ پڑا اور چند منٹ کے اندر جان بحق ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وہ اپنی محبوب جامعۂ ملیہ کے درمیان ایک خاص احاطے میں سپرد خاک کیے گئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ذاکر صاحب کو اپنی تعلیمی اور انتظامی ذمہ داریوں نے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت نہیں دی۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف معاشیات کے موضوع پر تھی۔ انھوں نے تعلیم سے متعلق بھی اپنے تجربات اور خیالات قلمبند کیے ہیں۔ کسی زمانے میں انھوں نے "رقیۂ ریحانہ" کے نام سے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ اس وقت تک ان کی مندرجہ ذیل چیزیں شائع ہو چکی ہیں!

۱۔ مبادیِ معاشیات (ایڈون کینن کی کتاب کا ترجمہ، ۱۹۲۲ء)

۲ ریاست (افلاطون کی کتاب Republic کا ترجمہ ۱۹۳۲ء)
(نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ ۱۹۶۷ء)

۳۔ معاشیات: مقصد و منہاج (۱۹۳۲ء)

۴ معاشیاتِ قومی List کی کتاب National Economy کا ترجمہ

۵ ذکرِ حسین (محرم کی تقریر)

۶۔ حالی، محبِ وطن (یوم حالی کی تقریر)
۷۔ تعلیمی خطبات
۸۔ جامعہ کیا ہے؟
۹۔ شکشا (ہندی)

۱۰ Educational Reconstruction in India

۱۱ The Dynamic University

(۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ تک کے مختلف یونیورسٹیوں کے خطبات صدارت ۱۹۶۵ء)

۱۲۔ ہندستان میں تعلیم کی ازسرِ نو تنظیم (ڈیٹیل خطبات کا اردو ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۹۶۲)

۱۳۔ دیانت (ڈراما)

۱۴۔ ابّو خاں کی بکری (بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ)

۱۵ Die Borachaft des Mahatma Gandhi
(جرمن ۱۹۲۴ء)

۱۶ خرگوش اور کچھوا (۱۹۷۱ء)

تحریر میں ذاکر صاحب کا نظریہ یہ تھا کہ تصنیف بول چال کی زبان میں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خیالات کی گہرائی، زبان و بیان کی سلاست اور سادگی، لب و لہجے کی صداقت اور خلوص ان کی ہر تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر آپ کو ان کی کسی تحریر میں مشکل الفاظ یا فارسی کی ثقیل ترکیبیں ملیں تو یقین کیجیے کہ یہ انھوں نے بہت ہی جلدی میں لکھی ہے اور اس پر انھیں نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا۔ ہر پڑھے لکھے آدمی کی طرح کبھی کبھی تفنناً شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ دو شعر سنیے:

مانا ہجومِ درد بھی ہے جزوِ زندگی — پُر کیف زندگی نہ سہی، زندگی تو ہے
للہ اس کے ذکر سے نفرت نہ کیجیے — ذاکر شکستہ حال سہی، آدمی تو ہے

شاد، نریش کمار

اردو کا یہ جوانا مرگ شاعر ۱۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں یحییٰ پور (اڑمڑ ٹانڈہ) ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوا۔ ان کے والد نوہر یارام درد (تلمیذ جوش ملسیانی) بھی اپنے زمانے میں پنجاب کے ادبی حلقوں میں خاصے معروف تھے۔ شاد نے شاعری کو یاد رثے میں پائی۔ لیکن دوسری بلا شراب نوشی بھی اسی کے ساتھ آئی۔ درد بلانوش تھے اور اسی نے انھیں کہیں کا نہ رکھا ـــــ گھربار کی خبر نہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال۔ شاد نے جوں توں کر کے دسویں درجے تک کی تعلیم تو مکمل کرلی، لیکن کچھ تو عسیر الحالی کے باعث اور کچھ اپنے لاابالی پن سے اسے جاری نہ رکھ سکے اور کم عمری ہی میں انھیں ملازمت اور تلاشِ روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا۔ چنانچہ راولپنڈی، جالندھر، لاہور میں مختلف اداروں میں کام کرتے رہے۔

تقسیم ملک کے بعد زبوں حالی میں اور اضافہ ہوا۔ وہ بے سروسامانی میں جان بچا کر دلی آئے۔ بعض دوستوں کی مدد سے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت ملی،

لیکن بس اتنا ہی کہ جان و تن کا رشتہ برقرار رہ سکے۔

اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ شاعری میں وہ بھٹکتے نہیں تھے۔ خیالات میں پختگی، بیان میں شگفتگی، زبان میں چستی اور ان سب پر مستزاد ہلکا سا تیکھاپن اور طنز۔ لیکن افسوس کہ شراب نوشی نے ان کی جملہ صلاحیتوں کو برباد کر دیا۔ وہ کئی مرتبہ موت کے دروازے سے لوٹ کر آئے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کو اچانک ان کے والد بزرگوار صاحب لاپتا ہو گئے۔ خدا معلوم، انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نے اچک لیا، گھر سے بھلے چنگے نکلے، اور واپس نہ آئے۔ شاد نے ان کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، لیکن بے سود؛ ان کا سراغ ملنا تھا نہ ملا۔ شاد نے غم غلط کرنے کو شراب میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ یوں گھریلو زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ آخری شام ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء وہ گھر آئے، تو یہاں کا ماحول معمول سے زیادہ ناقابلِ برداشت پایا۔ ان کی سکونت دریائے جمنا کے کنارے کی بستی تیمار پور میں تھی۔ دس گیارہ بجے شب گھر سے نکلے اور رات بھر غائب رہے۔ اگلی صبح ان کی لاش دریا سے ملی۔

انھوں نے بہت کچھ لکھا:

(۱) نظم میں: بتکدہ؛ فریاد؛ دستک؛ للکار؛ آہٹیں؛ قاشیں؛ آیاتِ جنوں؛ پھوار؛ سنگم؛ میرا منتخب کلام؛ میرا کلامِ نو بہ نو؛ دو آتشہ (حافظ کا ترجمہ)؛ وجدان۔

(۲) نثر میں: ڈارلنگ؛ ناکھ تلے؛ سرخ حاشیے؛ سرقہ اور توارد؛ مطالعے؛ جان پہچان، غالب اور اس کی شاعری؛ انداز غالب (شرح)؛ محاورات غالب؛ آواز غالب؛ پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری؛ پانچ مقبول طنز و مزاح نگار؛ شام نگر میں سینما آیا؛ چینی بلبل؛ سمندری شہزادی۔ آخری تینوں کتابیں بچوں

کے لیے ہیں

شادؔ نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا۔ شروع میں کچھ غزلیں اپنے والد درونکودری کو یہ کہہ کر دکھلائیں کہ یہ میرے ایک دوست کا کلام ہے؛ وہ ڈرتے تھے کہ اگر والد کو معلوم ہوا کہ میں شعر کہتا ہوں، تو خفا ہوں گے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا، تو انھوں نے ناراضی کی جگہ خوشی کا اظہار کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ منشی تلوک چند محروم سے مشورہ کرتے رہے۔ اس کے بعد جناب جوشؔ ملسیانی سے اصلاح لی، اور تقسیم کے بعد دلّی پہنچے، تو چند غزلیں جوشؔ ملیح آبادی کو بھی دکھائیں۔ شادؔ کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور اردو کے منظوم سرمایے میں مقامِ بلند کا مستحق ہے۔

کچھ مختصر کلام بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

خلوصِ مہر و محبت کی جلوہ گاہ تو ہیں　　　نہیں ہیں منزلِ مقصود، سنگِ راہ تو ہیں
اگر ثواب کے قابل نہیں ہیں ہم نہ سہی　　　خدا کے فضل سے شائستۂ گناہ تو ہیں

حسن ہے، یا چھلکتا ساغرِ مے　　　چال ہے، یا لطیف گیت کی لَے
آنچ آتی ہے جسم سے ایسے　　　جیسے مندر میں عود جلتا ہے

زندگی کے حسیں گلستاں میں　　　ہر تبسم ہے مرا داغدارِ الم
جب نچوڑا ہے خندۂ گل کو　　　اس سے ٹپکا ہے گریۂ شبنم

دہر میں ہم وفا شعاروں کو　　　دوستی کے بھرم نے مار دیا
دشمنوں سے تو بچ گئے، لیکن　　　دوستوں کے کرم نے مار دیا

مری حیات کی پستی میں بھی بلندی تھی　　　زمیں پہ گر کے قدم میں نئے آسماں کے لیے

اسیر طائر ہیں سخت بزدل، فضول بھرتے ہیں سرد آہیں
قفس کو بھی ساتھ لے اڑیں یہ، اگر قفس سے نجات چاہیں

مرے تخیّل کا ما حصل ہیں، مرے تصوّر کی زندگی ہیں
دراز گیسو، حسین آنکھیں، جمیل چہرہ، گداز باہیں
خوشی کے نغموں میں کارفرما، بشر کی بے چارگی کے نوحے
ہر اک تبسّم کی تہ میں آنسو، ہر ایک حسرت کی تہ میں آہیں
رہ طلب میں جو تھک کے بیٹھے مری نظر میں وہ بوالہوس ہے
پناہ کی اس میں جستجو کیا، کہاں ہیں اس میں پناہ گاہیں!

جن گلیوں میں تو نے مجھ سے کچھ جھوٹے اقرار کیے تھے
اب بھی بحالِ افسردہ میں ان گلیوں میں گھوم رہا ہوں

تیرے غم میں غمِ حیات بھی ہے مجھ میں جینے کی کوئی بات بھی ہے

رنج سے خوگر نہ تھے، واقف نہ تھے آلام سے
کیا وہ دن تھے، جب گزرتی تھی بڑے آرام سے
صبح تک کیا جانے، کیا گزرے مریضِ عشق پر
ٹمٹماتا ہے چراغِ زندگی جب شام سے
ایک ہم ہیں یاد کرتے ہیں انھیں صبح و مسا
ایک وہ ہیں، جن کو نفرت ہے ہمارے نام سے
صبحِ عشرت میں کہیں شامِ الم پنہاں نہ ہو
ڈر رہا ہے دل، فریبِ گردشِ ایّام سے

اللہ ری بیخودی کہ ترے پاس بیٹھ کر تیرا ہی انتظار کیا ہے کبھی کبھی

دیر و حرم سے دور، وجود و عدم سے دور
لے جا رہی ہے مجھ کو تری رہگزر کہاں؟

ایک شب گزری تھی تیرے گیسوؤں کی چھاؤں میں
عمر بھر بیخوابیاں میرا مقدّر ہو گئیں

آپ ہی کا یہ فیض ہے، ورنہ
زندگی اس قدر اداس نہ تھی

آپ دل کے قریب ہیں، پھر بھی
آنکھ دیدار کو ترستی ہے

بادہ و جام پر نہیں موقوف
تشنگی میں بھی ایک مستی ہے

شادؔ جس کو خوشی سمجھتے ہو
وہ بھی صہبائے غم کی مستی ہے

کٹ تو گئی ہے ہجر کی رات
کیسے کٹی ؟ یہ اور ہے بات

اک تخیّل ہے جو محتاجِ بیاں رہتا ہے
ہائے وہ حسن جو بے نام و نشاں رہتا ہے

زندگی گوش بر آواز ہوئی ہے جب سے
ہر نفس پر تری آہٹ کا گماں رہتا ہے

نگاہِ اہلِ محبّت کا فیض ہے ورنہ
تری نظر کو بھی کیا علم تھا کہ تو کیا ہے؟

جو بن پڑے تو بھٹک، جادۂ محبت میں
سفر ہو سہل، تو پھر لطفِ جستجو کیا ہے؟

ہمیں نگاہِ تمسخر سے دیکھنے والو!
یہ حادثات جو تم پر گزر گئے ہوتے!

یہ ناخدا جو نہ ہوتے تو شادؔ ہم اب تک
بفیضِ موجِ بلا پار اتر گئے ہوتے

کون سلگتے آنسو روکے، آگ کے کھڑے کون چبائے
اے ہم کو سمجھانے والے! کوئی تجھے کیوں کر سمجھائے

برکھا برسے، نغمے گونجیں، شیشے سے شیشہ ٹکرائے
کون اس وقت انجام کی سوچے، کون خرد کے پھیر میں آئے

جیون کے اندھیارے پتھ پر، جس نے تیرا ساتھ دیا تھا
دیکھ کہیں وہ کومل آشا، آنسو بن کر ٹوٹ نہ جائے

اس دنیا کے رہنے والے، اپنا اپنا غم کھاتے ہیں
کون پرایا روگ خریدے، کون پرایا دکھ اپنائے!

ہائے، مری مایوس امیدیں، وائے مرے ناکام ارادے
مرنے کی تدبیر نہ سوجھی، جینے کے انداز نہ آئے

اس دنیا کے غمخانے میں، غم سے اتنی فرصت کب ہے!
کون ستاروں کا منھ چومے، کون بہاروں میں لہرائے!

ضبط بھی کبتک ہو سکتا ہے، صبر کی بھی اک حد ہوتی ہے
پل بھر چین نہ پانے والا، کب تک اپنا روگ چھپائے!

شادؔ وہی آوارہ شاعر، جس نے تجھ سے پیار کیا تھا
نگر نگر میں گھوم رہا ہے، ارمانوں کی لاش اٹھائے!

کہاں کہاں نہیں موجود میرے نقشِ قدم!
کہاں کہاں نہیں ٹوٹا مرا دلِ حسّاس!
کہاں کہاں نہیں تڑپی نگاہِ درد شناس!
کہاں کہاں نہیں چھلکے، یہ دیدۂ پُرنم!
کہیں بھی ڈھل نہ سکی میرے رخ سے گردِ ملال
کہیں بھی مل نہ سکا کوئی جادۂ منزل
کہیں بھی رُک نہ سکا میں مسافرِ غمِ دل
یہی ہوا میری ساری مسافرت کا مآل
گیا جہاں بھی، پلٹ کر میں سوگوار آیا
کسی جگہ بھی تو تسکین جستجو نہ ہوئی
کہیں بھی تو نہ ملا، تجھ سے گفتگو نہ ہوئی

پکارنے کو تجھے ہر طرف پکار آیا
جواب میں وہی آواز بازگشت آئی
کہاں ہوئی مری فریاد کی پذیرائی!

ہر تمنّا پہ بے حسی ہوتی — ہر مسرت بجھی بجھی ہوتی
موت ہوتی اگر نہ دنیا میں — زندگی موت بن گئی ہوتی

زندگی کی ستم ظریفی کو — واقعہ ہے کہ کم سمجھتے ہیں
وہ بھی روٹھی ہوئی مسرّت ہے — جس کو ہم لوگ غم سمجھتے ہیں

تابش ہے مہر میں، نہ تجلی ہے ماہ میں — تیری نگاہ جب سے ہے میری نگاہ میں
دل میں ہو شوقِ دید کا عالم تو دید نی — گو دیکھنے کی تاب نہیں ہو نگاہ میں
اے شادؔ رہبروں کے رویے کو دیکھ کر — آنا پڑا ہے راہزنوں کی پناہ میں

کچھ میکشی کو اس نے بھی رسوا کیا، مگر — کچھ میکشی بھی شادؔ کو بدنام کر گئی

رسوائیوں پہ بھی مجھے کرنا پڑا ہے فخر — یارانِ نیک نام کے اطوار دیکھ کر
جیسے مری نگاہ نے دیکھا نہ ہو کبھی — محسوس یہ ہوا تجھے ہر بار دیکھ کر

کچھ تلخیٔ شراب نے مجھ کو کیا ہلاک — کچھ تلخیٔ شعور کا مارا ہوا ہوں میں

آج تک وہ نظر نہیں بھولی — تم نے دیکھا تھا ایک بار مجھے

یہ چاندنی، یہ گھنی خامشی، یہ تنہائی — دلِ شکستہ کی ہر چوٹ پھر ابھر آئی

مہربانی میں تغافل کی ادا ہے تو سہی — کچھ نہ کچھ آپ کا دل ہم سے خفا ہے تو سہی

موسم دلکش، ساقی گلگرد، صحنِ گلستاں، بادۂ رنگیں
اس ماحول میں رہ کر بھی میں شادؔ بہت مغموم رہا ہوں

زندگی سوز سے عبارت ہے — یہ کسی ساز کی نقیب نہیں
کس قدر بدنصیب انساں ہیں — کوئی غم بھی جنھیں نصیب نہیں

سمٹے تو بن گئے کسی مہوش کے نقشِ پا
پھیلے تو ہم قضا و قدر تک پہنچ گئے

گو ہر قدم پہ دیر و حرم کے تھے پیچ و خم
ہم پھر بھی تیری رہگزر تک پہنچ گئے

دل نے بنا دیا ہے محبت کا دل مجھے
ہر واردات شوق مری واردات ہو

فسردہ دیکھ کے تم کو خیال آتا ہے
فسردگی میں بھی کم دلکشی نہیں ہوتی

غمِ حبیب کا جب تک نہ حسن شامل ہو
غمِ جہاں میں کبھی دلکشی نہیں ہوتی

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

آپ سے یوں تو اور بھی ہوں گے
آپ کی بات آپ ہی کی ہے

عقل سے صرف ذہن روشن تھا
عشق نے دل میں روشنی کی ہے

کسی رخ پہ جب گردِ غم دیکھتے ہیں
تو اپنی ہی تصویر ہم دیکھتے ہیں

کسی کی نگاہوں کی بیگانگی میں
ہمیں جانتے ہیں، جو ہم دیکھتے ہیں

کریں کیا غمِ زندگی کی شکایت
یہی غم تو ہے زندگی کا بہانہ

شاید یہ سوزِ غم نہیں دل میں
پھول کی گود میں شرارا ہے

اے غمِ زندگی! اداس نہ ہو
آ، تجھے ہم گلے لگاتے ہیں

مجھ سے ملنے سے پیشتر وہ نظر
آئینے سے بھی روشناس نہ تھی

سکوں کسی کو نہیں، مجھ کو مضطرب ہی ملا
کوئی قفس کے لیے کوئی آشیاں کے لیے

ناطق گلاؤٹھوی، سید ابوالحسن

کہا جاتا ہے کہ نواب مرزا خان داغؔ کے ہزاروں شاگرد تھے، جن کے نام ایک رجسٹر میں تاریخ تلمذ کی ترتیب سے درج تھے۔ اس بیان کی صحت سے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں ہے کہ جب داغؔ کا ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا ہے، تو ان کے بلامبالغہ سینکڑوں شاگرد ان کا سلسلہ قائم رکھنے کو موجود تھے۔ ۶۵ برس بڑا لمبا زمانہ ہے، آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ اب کئی برس سے صرف دو حضرات رہ گئے تھے: جوشؔ ملسیانی اور ناطقؔ گلاؤٹھوی۔ گزشتہ مئی میں ناطق بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب صرف ایک حضرت جوشؔ کی ذات اپنے استاد کی یادگار رہ گئی ہے۔ خدا ان کا حامی و ناصر رہے!

سید ابوالحسن ناطقؔ گلاؤٹھوی ۱۱ر نومبر ۱۸۸۶ء کو کامٹی میں پیدا ہوئے، جو ناگپور کے قریب اچھا خاصا بڑا قصبہ ہے۔ ان کے بزرگ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندستان آئے تھے۔ ان کے دادا سید غلام غوث وکالت پیشہ تھے اور اسی سلسلے میں مدتوں میرٹھ میں مقیم رہے۔ پھر خاندان نے گلاؤٹھی (ضلع میرٹھ) میں سکونت اختیار کر لی؛

یہاں ان کی کافی بڑی جاداد اور زمینداری تھی۔ ناطق کے والد سید ظہور الدین نے تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ وہ وسیع پیمانے پر لکڑی کا کاروبار کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں وہ کامٹی میں سکونت پذیر تھے، چنانچہ ناطق یہیں پیدا ہوئے۔ سید ظہور الدین کا ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔

ناطق کی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر شروع ہوئی۔ قدرتاً فارسی عربی پر خاص توجہ رہی، اور انھوں نے اس کی تکمیل دار العلوم دیوبند میں کی۔ آخری دورۂ حدیث شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے پڑھا۔ وہیں طب بھی ان کے برادر خرد حکیم احمد حسن (عرف حکیم بڈن) سے حاصل کی۔ بعد کے زمانے میں روزمرّہ کے کام کاج کے لائق انگریزی سے بھی اپنے طور پر واقفیت حاصل کر لی تھی۔ بلکہ ان کے کلام میں بعض انگریزی شعرا مثلاً شیلی، لانگ فیلو وغیرہ کی نظموں کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔

سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی، ناطق کے خالہ زاد بھائی تھے۔ انھیں کی ترغیب پر انھوں نے کمسنی کے زمانے میں شاعری شروع کی، لیکن ان سے مشورہ نہیں کیا۔ اس کے لیے انھوں نے بیان یزدانی مرحوم (ف ۱۹۰۰ء) کا انتخاب کیا، جو اساتذۂ وقت میں بھی درجۂ خاص کے حامل تھے۔ لیکن چند ہی ماہ بعد بیان فوت ہو گئے۔ اسی زمانے میں امیر مینائی بھی چل بسے۔ اتفاق کی بات کہ کہیں سے داغ کے دو دیوان، گلزار داغ اور آفتاب داغ ——— ان کے ہاتھ لگ گئے۔ انھیں دیکھا، تو یہ داغ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تھوڑے دن بعد خط و کتابت کے ذریعے ان کا تلمذ اختیار کر لیا۔ بعض اصحاب نے انھیں جلال لکھنوی کا شاگرد بھی کہا ہے یہ درست نہیں، وہ شاگرد داغ ہی کے تھے، یا دو چار غزلوں کی حد تک بیان یزدانی کے بھی کہہ لیجیے۔ بالآخر انھوں نے مشق اور غور و فکر سے خود درجۂ اُستادی حاصل

کرلیا تھا چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں ان کے شاگرد زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔
تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے ملک کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ یہ گویا ان کا ورثہ
تھا۔ ان کے ایک چچا سید عنایت اللہ کو ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں
انگریزوں نے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ ناطق مرحوم کانگریس اور خلافت کی تحریکوں
میں کامے، درمے، قدمے بڑھ چڑھ کر شریک ہوئے۔ چوں کہ گھر کے کھاتے پیتے تھے، اس
لیے معاش کی طرف سے کوئی تشویش نہیں تھی۔ وہ مسلسل ۳۰ سال تک ناگپور میونسپل
کمیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مرکزی اسمبلی کے بھی رکن منتخب ہوئے تھے۔ لیکن
روز بروز مالی حالت کمزور ہوتی گئی، اور قوٰی کے اضمحلال کے ساتھ وہ سیاسی
سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکے، اور بالآخر خانہ نشین ہو گئے۔

ان کا کلام مخزن (دور اول) اور پیسہ اخبار (لاہور) میں ملتا ہے۔ اپنے زمانے کے دوسرے
مختلف رسائل و جرائد میں بھی ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔ ان کی غزلیات کا دیوان آج تک
شائع نہیں ہوا۔ چند نظموں کا مجموعہ "نطقِ ناطق" کے عنوان سے گلدستہ "جلوۂ یار"
(میرٹھ) کے شمارہ مارچ ۱۹۱۳ء کے ساتھ بطور ضمیمہ چھپا تھا۔ چند سال ہوئے، ایک
طویل مکتوب جس میں فنی معلومات ہیں (کلیل میں غلیل) اور تنقیدی موضوعات سے
متعلق چند خطوط اور مضامین "سبعہ سیّارہ" کے نام سے شائع ہوئے تھے (ناگپور
۱۹۶۰ء)۔ غالب کے دیوان کی شرح کنز المطالب اگرچہ ۱۹۲۶ء میں لکھی تھی، لیکن شائع
ابھی پار سال (لکھنؤ فروری ۱۹۶۸ء میں) ہوئی۔ جس شخص نے ستّر سال مشقِ سخن کی ہو،
اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے کلام کی مقدار کتنی ہو گی۔ دیوان کے علاوہ کچھ اور
تصنیفات بھی غیر مطبوعہ رہ گئیں، جن کے مسودے ان کے بعض شاگردوں کے
پاس ہیں۔

مرحوم بہت کم آمیز تھے، بلکہ بہت حد تک زود رنج اور اظہارِ رائے میں بیباک بھی۔

اسی لیے ان کے احباب کا حلقہ وسیع نہ ہو سکا۔ افسوس کہ ان کا آخری زمانہ بہت عُسرت اور کس مپرسی کی حالت میں کٹا۔ اولادیں چھ بچے ہوئے۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں، لیکن وہ سب داغِ مفارقت دے گئے۔ چار کا تو کمسنی ہی میں انتقال ہو گیا، ایک لڑکا اور ایک لڑکی گھربار والے ہو کر مرے۔ ان صدماتِ ذہنی و جسمانی نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ چھ ماہ بسترِ مرض پر پڑے پڑے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔ اعضا بیکار ہو گئے اور حافظہ بھی رخصت ہو گیا۔ نقل و حرکت تک سے معذور ہو چکے تھے۔ آخر وہ دن بھی آگیا، جو اٹل ہے۔ انھیں بہت دن سے سُلسِل بول کا عارضہ تھا، لیکن خدا کی شان، دسمبر گزشتہ میں اس کے بالعکس حبسِ بول کی شکایت پیدا ہو گئی۔ اسی کے علاج کے لیے انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا۔ جب افاقہ ہوا، تو گھر پر آگئے، اور یہاں علاج ہوتا رہا لیکن اب کمزور بعید ہو گئے تھے۔ ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کی شام سے حالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور زبان بند ہو گئی۔ آدھی رات کے وقت آخری ہچکی آئی۔ یوں وہ شب ۲۶/۲۷ مئی ۱۹۶۹ء (۱۰ ربیع الاول ۱۳۸۹ھ) کو ناگپور میں مالکِ حقیقی کے بلاوے پر وہاں جا پہنچے، جہاں ہم سب آگے پیچھے جانے والے ہیں۔

صبح ہوتے ہوتے اس حادثے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ سوگ میں کارپوریشن کے دفتر بند کر دیے گئے، جس کے وہ ۳۰ برس تک رکن رہے تھے۔ سہ پہر کو جنازہ ان کی قیامگاہ سے اٹھا اور سرِ شام انھیں قبرستان مومن پورہ (ناگپور) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

ایک قلمی بیاض سے انتخاب کردہ چند اشعار ملاحظہ ہوں؛ یہ جناب محمد عبدالحلیم، ناگپور کی مملوکہ ہے، جو ان کے مخلص نیازمندوں میں سے ہیں؛

پھولوں کا رنگ، روپ، پرندوں کے چہچہے　　کس کو خبر ہے، سب کدھر آئے، کدھر گئے

ہم کو تو رُت نہ آئی کسی گُل کے وصل کی ۔ اب کے بھی دن بہار کے یوں ہیں گزر گئے

آج میخانے میں برکت ہی سہی ۔ میکشو! آؤ، عبادت ہی سہی

آپ، اور جنسِ دل کے خریدار! جی نہیں ۔ پہچانتا ہوں، صورتِ اہلِ نظر کو میں

تابشِ رخسارِ نور آرائے شمعِ بزمِ عیش ۔ آتشِ گُل، کار فرمائے شرارِ نغمہ ہے

ہمنوائی دیکھ، آئینِ ہم آہنگی نہ پوچھ ۔ نَے تشغل نالہ و مطرب بکارِ نغمہ ہے

مستیِ یزداں پرستی کے لیے، اللہ بس ۔ یاں دفورِ کیف وجہِ اختصارِ نغمہ ہے

آج کل نغمے یہ ہے: ناطق! مدارِ شاعری ۔ شاعری پر، پہلے کہتے تھے، مدارِ نغمہ ہے

کس کو مہرباں کہیے، کون مہرباں اپنا! ۔ وقت کی یہ باتیں ہیں، وقت اب کہاں اپنا

اے خدا! گلہ سن لے اپنی بے نیازی کا ۔ آج حال کہتا ہے، ایک بے زباں اپنا

نامراد دنیا میں رہ کے خوب بھر پائے ۔ چل نکل چلیں اے دل! کچھ نہیں یہاں اپنا

یہی اندازِ حوادث ہے، تو دن ہوگا، نہ رات

یہی دن رات اگر ہیں، تو وہ دن دور نہیں

دوسروں کو کیا کہیے، دوسری ہے دنیا ہی

ایک ایک اپنے کو، ہم نے دوسرا پایا

کم سمجھ میں آتے ہیں اب تو، اس کے گل بوٹے

ہم نے نقشِ ہستی کو کچھ مٹا مٹا پایا

رکھتا ہے تلخکام، غمِ لذتِ جہاں ۔ کیا کیجیے کہ لطف نہیں کچھ گناہ کا

ہیں حاصلِ نظر ہوں، تمنائے دید میں ۔ لیتا ہوں کام ہر بنِ مُو سے نگاہ کا

ہنگامۂ حیات سے لینا تو کچھ نہیں ۔ ہاں، دیکھتے چلو، کہ تماشا ہے راہ کا

کہیں کس سے، پتے کی بات کہتا ہی نہیں کوئی

سنیں کس کی یہاں جس نے کہی، اپنی کہی تم سے

اے جنوں! باعثِ بدحالیِ صحرا کیا ہے؟
یہ مرا گھر تو نہیں تھا کہ جو ویراں ہوتا

آ ہی جاتا ہے بُرے وقت میں اپنوں کو خیال
کوئی ہوتا جو ہمارا بھی تو پرساں ہوتا

کھیل ہی ہستیِ موہوم، مگر ہے دلچسپ
جو یہاں بیٹھ گیا آ کے، وہ مشکل سے اٹھا

ہمسفر! ہو کوئی افتاد تو پیش آنے کو
کہ قدم آج اٹھا ہوا منزل سے اٹھا

جی چرانے کی نہیں شرط، دلِ زار! یہاں
زخم اٹھانے ہی کی ٹھہری ہے تو پھر دل سے اٹھا

یہ مقامِ حسن کب تھا کہ وفا شعار ہوتا
کوئی کارِ خیر ہوتا، تو گناہ گار ہوتا

ترا تیرِ نیم کش، ہو مرے شوق کی ترازو
اسے کون تول دیتا جو جگر کے پار ہوتا

اسے پا بہ گل نہ رکھتا جو خیالِ تیرہ بختی
جسے ذرّہ کہہ رہے ہو، وہی اک شرار ہوتا

تھی جہاں میری مصیبت خاطرِ مشکل پسند
کونسی آسانیاں کہہ دوں کہ آساں ہو گئیں

جل اٹھے تیری نگاہِ کرم سے سینے کے داغ
میں نے جو شمعیں بجھا دی تھیں فروزاں ہو گئیں

تھا جنوں پرور مرا ذوقِ تن آرائی مجھے
بے سر و سامانیاں خود ساز و ساماں ہو گئیں

ہو گئی دیوانگی تکمیلِ اسبابِ خرد
گالیاں مجذوب کی اسرارِ عرفاں ہو گئیں

ہماری داستاں کے ساتھ رودادِ جہاں کیوں ہو
جہاں ہم ہوں، ہمی تم ہوں، زمیں کیوں، آسماں کیوں ہو

بھروسہ عالمِ اسباب پر کس نے بتایا ہے
چمن کے چار تنکوں میں قریبِ آشیاں کیوں ہو

افسردہ خاطری دلِ محزوں کو لے مری
بجھتے ہوئے چراغ نے گھر کو جلا دیا

اٹھ گئے ہم درمیاں سے، اٹھ گیا ہم سے حجاب
رہ گئے ہم اس کے ہو کر، رہ گیا پردا، نہ ہم

دولتِ دل کیا ہے، جا کر اہلِ دل سے پوچھیے
مال تھا اپنا بھی کچھ، جانے مگر رکھنا نہ ہم

رنجِ رسوائی نہیں، دنیا ہے رسوائی کا گھر
ہیں سبھی رُسوا، تو یوں سمجھو، نہ تم رُسوا نہ ہم

فائدہ کیا، رہتی دنیا تک اگر کوئی رہا
یہ تو ظاہر ہے کہ رہنے کے لیے، دنیا، نہ ہم

کھا گئی اہلِ ہوس کی وضع، اہلِ عشق کو
بات کس کی رہ گئی کوئی، عدو سچّا، نہ ہم

ہم کہاں ہونگے دعاؤں میں اثر ہونے تک
کچھ نہ کچھ ہو تو رہیگا، مگر ہونے تک؟

خود ہو کے کچھ، خدا سے بھی، مردِ خدا! نہ مانگ
رسمِ دعا یہ ہے کہ دعا لے، دعا نہ مانگ

میں اپنی بے زری کی ندامت کو کیا کہوں!
تو اور شرمسار نہ کر، اے گدا! نہ مانگ

اس خاکدانِ دہر میں، گھُٹتا اگر ہے دم
مقدور ہو، تو آگ لگا دے، ہوا نہ مانگ

رسمِ طلب میں کیا ہے، سمجھ کر اُٹھا قدم
آ، تجھ کو ہم بتائیں کہ کیا مانگ، کیا نہ مانگ

خوگر ہو درد کا کہ یہی ہے علاجِ درد
یہ کس کے بس کا روگ ہے، اس کی دوا نہ مانگ

ملتی نہیں مراد، تو ناطق! خیال چھوڑ
میری صلاح یہ ہے کہ تو روٹھ جا، نہ مانگ

الم مظفر نگری، محمد اسحٰق (مولانا)

قوم کے افغان تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ حسین خاں پٹرانہ (ضلع مظفر نگر) کے رہنے والے تھے۔ یہ دیہات ان نواح میں افغانوں کی مشہور بستی ہے، اور یہاں کے کھنڈرات افغانوں کی گذشتہ عظمت کی داستان زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں۔ الم کے والد مولانا خان اللہ دیا شاہ صاحب، سید مظہر علی شاہ ایرانی سے بیعت کرنے کے بعد تارکِ دنیا ہو گئے تھے۔ جس پر ان کے نام میں لفظ "شاہ" کا اضافہ دال ہے۔

خان اللہ دیا شاہ صاحب کے ایک پیر بھائی تھے، سید صفدر علی ایرانی، علومِ متداولہ پر ان کی نظر وسیع اور قدرت مسلّمہ تھی۔ چنانچہ الم جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو سید صفدر علی نے ان کی بسم اللہ کرائی۔ انھوں نے دینیات میں قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ، اور ادبِ عربی کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد علمِ نجوم کی طرف توجہ ہوئی، تو اس میں بھی دستگاہ کامل حاصل کی۔ جب عربی فارسی پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا، تو پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹیوں سے السنہ شرقیہ کے مختلف امتحانوں کی اسناد حاصل کیں۔ ساری عمر مدرسی میں گزاری۔ پہلے چند ے ایڈورڈ ڈنج کا

میں رہے اور ۱۹۴۳ء میں وہاں سے مستعفی ہو کر اسلامیہ ہائی اسکول، مظفر آباد میں آگئے، یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

نجوم سے متعلق ان کی معلومات کی وسعت کا اندازہ ان مضامین سے ہوتا ہے، جو ان کے قلم سے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ مومن کے بعد اردو شعراء کے حلقے میں الم سے بڑا منجم کم ہی ہوا ہوگا۔ اس کی شہادت ان کا تیار کردہ حضرت رسولِ کریم صلعم کا زائچہ ہے، جس میں انھوں نے حیاتِ مبارکہ سے متعلق تفصیلی احکام لگائے ہیں۔ علمِ نجوم سے متعلق انھوں نے ایک مفصّل کتاب بھی لکھی تھی، یہ غیر مطبوعہ رہ گئی۔

وہ سیماب اکبر آبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں تھے، اور خود استاد کو ان کے علم اور استعداد پر فخر تھا۔ نظم میں ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں: سلسبیل، کوثر و تسنیم سدرہ و طوبیٰ، معرکۂ کربلا (تاریخ وادب ۱۹۶۳ء لاہور) گیتا منظوم، موخر الذکر ہی پر یوپی حکومت کی طرف سے ان کے لیے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ علیم اختر مظفر نگری انھی کے شاگرد ہیں، اگرچہ خود انھی کے ایما پر شروع میں انھوں نے سیماب مرحوم سے بھی اپنی چند غزلوں پر اصلاح لی تھی۔ اپنی شعر گوئی کے آغاز میں پروفیسر راجندر ناتھ شیدا نے بھی ان سے مشورہ کیا تھا۔ جب سیماب کی صحت زندگی کے آخری ایام میں بہت سقیم ہو گئی، تو انھوں نے اپنے نو مشق شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے فارغ الاصلاح تلامذہ سے رجوع کریں، الم بھی ان اصحاب میں شامل تھے۔ اسی زمانے میں الطاف مشہدی اور احمد ندیم قاسمی نے الم سے بھی مشورہ کیا۔ گورنمنٹ کالج جہلم (مغربی پاکستان) کے پرنسپل سید صفدر حسین صفدر نے بھی شروع میں الم سے اصلاح لی تھی۔

انھیں پراسٹیٹ گلینڈ کی تکلیف تھی۔ اس کے لیے عملِ جرّاحی ہوا، لیکن ناکام رہا اور اسی سے ان کا ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء کو مظفر نگر میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت عمر تقریباً ستّر سال کی تھی۔ مظفر نگر ہی میں ان کے ذاتی مکان (فردوس منزل) کے شمال کی طرف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

شورشِ ہستی کے ضامن، حسن کے جلوے بھی تھے
عشق تنہا باعثِ ہنگامۂ محفل نہ تھا

گرا ہے خاک پہ مژگاں سے، دیکھو وہ آنسو
کہ جس کا منزلِ دل میں قیام ہو نہ سکا

ازل کے دن سے بیاں کر رہا ہوں میں پھر بھی
فسانۂ غمِ ہستی تمام ہو نہ سکا

نوازشیں تو بہت کیں نگاہِ ساقی نے
مگر ہمیں سے کبھی شغلِ جام ہو نہ سکا

اَلم ہمیشہ رہا مقتدیِ پیرِ مغاں
جبھی تو اہلِ حرم کا امام ہو نہ سکا

چشم زدن میں کہہ دیا زندگیِ جہاں کا راز
دیکھا کبھی تو نے بے خبر! رقصِ شرر نے کیا کیا!

سینکڑوں عالم بہ فیضِ عشق ہیں پیشِ نظر
پھر بھی تیری بزمِ نگاہِ ناز میں تنہا ہوں میں

میں نے سیکھے ہیں نکاتِ فنِ الم! سیماب سے
جانتے ہیں سب کہ مرزا داغ کا بیٹا ہوں میں

حقیقت آشنائے گلستاں فصلِ بہاراں میں
ہجومِ رنگ و بو کو برق کا شانہ سمجھتے ہیں

کسی دن جس کے شعلے خرمنِ ہستی کو پھونکیں گے
اسی بجلی کو ہم شمعِ طرب خانہ سمجھتے ہیں

چھپا لیتے ہیں ہر زخمِ جگر کو فصلِ گل میں بھی
چمن میں پھول نشانِ غمِ پنہاں سمجھتے ہیں

کچھ ایسی بھی آزادیاں ہیں کہ، جن کی فضاؤں میں پھیلا ہے دامِ اسیری
بڑے پُرخطر ہیں وہ گوشے چمن کے، جو کنجِ قفس کی حدوں سے ملے ہیں

کسی گلشن میں یا صحرا میں، جا بیٹھیںگے دیوانے
پئے تسکینِ وحشت آپ ہی کی انجمن کیوں ہو

مجھے احساں نہیں منظور، اس دستورِ گلشن کا
فروزاں آتشِ گل سے مری شاخِ چمن کیوں ہو

ہر رگِ دل میں کھٹکتے ہیں، الم، او دیکھاں
درد کے ساتھ، نگاہِ غلط انداز بھی ہے

کسی بہارِ گذشتہ کی یادگار تو ہے
ہمارا باغِ تمنا خزاں رسیدہ سہی

وہ بھی ایک جلوۂ بے پردہ کی نمود
اہلِ نگاہ پردہ حائل کہیں جسے

لیے ساغر میں ہر گل بادۂ گلفام آتا ہے
بہار آتی ہے یا گلشن میں دورِ جام آتا ہے

کم ہیں سامانِ طرب میرے لیے، کم ہی سہی
چنگ و نغمہ نہ سہی، نالہ و ماتم ہی سہی

ہے تو اک سلسلۂ دعوتِ مژگاں قائم
خونفشانیِ رگِ زخمِ جگر کم ہی سہی

حوصلے دل کے بڑھانے کے لیے شامِ فراق
ہمنشیں! تذکرۂ گیسوئے برہم ہی سہی

سینے میں کھٹکتی رہتی ہے، نشتر کی طرح، الفت کی خلش
یہ پھانس یوں ہی رفتہ رفتہ پیوستِ جگر ہو جاتی ہے

خرابِ عیشِ زمانہ! تجھے خبر ہی نہیں
جو زندگی کو سنبھالے، وہ قوتِ غم ہے

فیضِ ساقی سے نہیں محروم، بادہ کش کوئی
میکدے میں مل ہی جاتی ہے، اگرچہ کم سہی

کھینچ کے ساقی! جو دل سے آتی ہے، وہ کچھ اور ہے
تیرے شیشے میں جوابِ کوثر و زمزم سہی

امتحاں گاہِ وفا میں، ہے یہ کیسی خامشی
اب حریفِ غم نہیں ہوتا کوئی، تو ہم سہی

ازل سے ان کے سنگِ در کو بھی جس کی تمنا ہے
لیے ہے ایک وہ سجدہ، ابھی ذوقِ جبیں میرا

پھولوں کو دیکھیے، نہ ستاروں کو دیکھیے
ان میں کسی کے شوخ اشاروں کو دیکھیے

چلیے تو سیر لالہ و گل کو بہار میں
اک دن تو اپنے سینہ فگاروں کو دیکھیے

اللہ رے! یہ بارشِ مستی رنگ و بو
کس کا شباب ہے یہ بہاروں کو دیکھیے

عشقِ بتاں کو بہرِ خدا چھوڑیے، الم!
کب تک جہاں میں جھر نگاروں کو دیکھیے

دعوتِ جوش

(۱)

شمعِ حیاتِ شوق، اب جلوہ طراز ہی نہیں
محفلِ سوز و ساز میں، کیف و گداز ہی نہیں

وقت نہیں ہے ساز گار نازونیاز کے لیے
ختم ہے ذوقِ غزنوی، زلفِ ایاز ہی نہیں

کوئی نہیں ہے مشغلہ، دستِ جنوں کے واسطے
جیبِ خرد، ہے خود ہی چاک، دامنِ ناز ہی نہیں

آمدِ نو بہار سے دل کو تسلیاں ہوں کیا!
بادِ صبا کی جنبشیں لالہ طراز ہی نہیں

اس لیے بڑھ گئی ہیں اور، اہلِ نظر کی حیرتیں
بزمِ سکندری میں آج، آئینہ ساز ہی نہیں

شدتِ دردِ غم کے بعد، دل کو سکوں کہاں نصیب
جوشِ نیاز کا جواب، گرمیِ ناز ہی نہیں

زعمِ غلط کا ہے اسیر، جس کو بھی دیکھتا ہوں میں
شیخ ہو یا کہ برہمن، واقفِ راز ہی نہیں

(۲)

باعثِ انقلاب، ہے گردشِ چرخِ چنبری
باقی رہی نہ حسن کی طرزِ ادا میں دلبری

چھایا ہوا ہے رنگ یاس، عید کی صبح و شام پر
گیت میں سازِ عیش کے گونج رہی ہے زرگری

اس کی خبر نہیں ابھی، مسلمِ خفتہ بخت کو
حسنِ عمل سے زندگی پائی ہے، اوجِ سروری

عید ہے ان کی، جو کہ ہیں خُلق و وفا سے بہرہ ور　　جن کے کمالِ عجز سے، دبتی ہے شانِ قیصری
خلقِ خدا کی خدمتیں کرتے ہیں، جو کہ وقت پر　　وہی تو ہیں مقلّدِ رسم و رہِ پیمبری

ان کی جبیں ہے سجدہ ریز، عشق کی بارگاہ میں
ان کی خودی کو مل گیا، عزِّ وقارِ بوذری

(۳)

آکہ جگائیں خواب سے، جذبۂ کامیاب کو　　عزمِ جواں سے موڑ دیں باز وئے انقلاب کو
ظلمتِ زندگی ہو دُور، جس کی تجلّیات سے　　ایسا جمال بخش دیں گرمیِ آفتاب کو
ذرّوں کی نبض سست ہیں، جاگ اٹھے حیاتِ شوق　　نغموں کا جوش لے اڑے، نغمہ گرِ رباب کو
فطرتِ سازِ عشق میں، ایسی نوا ہو موجزن　　ضبط و سکوں کی راحتیں دے جو ہر اضطراب کو
مرکزِ اہلِ ہوش کی جا کے بلندیوں سے دُور　　مطلعِ عید پر ہم آج، لائیں اس آفتاب کو

جس نے صفا کے اوج سے، ہو کے طلوع وقت پر
لفظ و بیاں میں رکھ دیا مقصد الکتاب کو

انتباہ

باغباں جب تک کہ ہے بیگانۂ رازِ چمن
ہو نہیں سکتا کسی صورت میں دمسازِ چمن

جس کنارے میں نہیں محفوظ اعجازِ خودی
وہ حریفِ موجِ طوفاں ہو نہیں سکتا کبھی

وہ جنونِ شوق جو ہمرازِ سوزِ دل نہیں
شورشِ آوارگی ہے رونقِ محفل نہیں

سازِ بے سوز وفا کے گیت کو سمجھیگا کون
جلوۂ بے فیض کی تنویر کو دیکھیگا کون

دیکھ ان کی سمت بھی، اے مالکِ سرو و سمن!
جن کی جولانگاہ، ہے مدت سے پہنائے چمن

ہر وفادارِ گلستاں مستحقِ داد ہے
قدرِ آزادی ہے لازم، تو اگر آزاد ہے

ہو اخوت کا پجاری، تو ہے گر مردِ وفا
ورنہ سن لے، قادرِ مطلق کا ہے یہ فیصلہ

جس سے وابستہ نہیں انسانیت کا احترام
خود بخود ہو جائیگا اک دن فنا وہ انتظام

اظر کاکوروی، بشیر احمد علوی

ن کے والد مرحوم امیر احمد علوی بھی مشہور اور کامیاب لکھنے والے تھے، گویا تصنیف و
الیف کا شوق اور ملکہ ورثے میں پایا۔

ھوں نے اپنی سوانح عمری ”آشفتہ سری میری“ میں لکھا ہے کہ میری ولادت ننھیال
رگڈھی، کاکوری) میں ۲۶ محرم ۱۳۲۰ھ (۵ مئی ۱۹۰۲ء) کو ہوئی۔ تعلیم علی گڑھ کالج
ور یونیورسٹی میں پائی۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی کتابوں اور تحریروں میں
علی گڑھ کا ذکر بھی بہت ہے اور تعریف بھی! در اصل انھیں اپنی مادرِ علمی سے عشق
تھا اور اسی نے ان کی علی گڑھ شہر، یہاں کے ماحول، اور باشندوں سے دلچسپی اور
محبت کو المضاعف کر دیا۔

وہ نظم و نثر دونوں پر قادر تھے۔ جب تک توانا درست رہے، قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔
جب صحت کمزور ہو گئی اور بینائی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا، تو دوسروں سے لکھواتے؟
خود بولتے جاتے اور کوئی شخص اسے قلمبند کر دیتا۔ معلومات اور مطالعہ اتنا وسیع
تھا کہ وہ کسی موضوع میں بند نہیں تھے۔ اگر مضمون علمی اور تحقیقی ہوتا، جب بھی

وہ حافظے کی مدد سے اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات لکھوا دیتے اور کسی حوالے کی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

آخر عمر میں مذہب سے بہت شغف ہو گیا تھا۔ صوم و صلوٰۃ، اوراد و انفال کے بہت پابند ہو گئے تھے۔ نجوم و جفر میں بھی خوب دستگاہ تھی۔ اور یہ بھی انھیں اپنے والد سے وراثۃً ملی۔ اکثر حکم ایسا درست ہوتا کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ لوگوں کو تعویذ بھی دیتے تھے اور ہر طرح کا مشورہ بھی۔

خوش اخلاق، خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے، دعوتیں کھلانے کے بیحد شوقین۔ حال آنکہ آخری زمانے میں مالی حالات بہت سقیم ہو گئی تھی، جب بھی ان کی ضیافتیں کرنے کی عادت نہ گئی۔

بد قسمتی سے کینسر کا جان لیوا مرض لاحق ہو گیا، لیکن ان کے صبر و شکر کے قربان جائیے کہ کبھی اُف تک نہیں کی، ورنہ دیکھا گیا ہے کہ اس عارضے کے مریض درد سے چیخیں مارا کرتے ہیں۔

اسی میں ۷ جولائی ۱۹۶۹ء صبح کے وقت لکھنؤ میں جاں بحق ہو گئے۔ لاش کاکوری گئی اور وہیں تکیہ شریف کے قبرستان میں آخری خواب گاہ نصیب ہوئی۔

ثمر بسوانی نے تاریخ کہی:۔

جہانِ علم و فن مفارقت سے غم فزا ہے آج	کوئی رو رہا ہے، کوئی ہاتھ مل رہا ہے آج
بپا ہوا ہے حشر ایک رحلتِ مشیر سے	ہائے، کیا ثمر! وہ محسنِ ادب اٹھا ہے آج

(۱۳۸۹)

جسمانی یادگار چار بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ ان میں سے دو لڑکے انگلستان میں ہیں اور ایک پاکستان میں، چوتھے جناب احمد ابراہیم علوی روزنامہ قومی آواز میں ملازم ہیں۔

تینوں لڑکیاں بھی اپنے گھر بار والی اور خوش و خرم ہیں ۔ ان کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے ۔ ان میں سے چند زیادہ اہم یہ ہیں:

(۱) ناول: چندر کلا؛ سنہرا حلقہ؛ ستاروں سے آگے ۔ (۲) تنقید: حالی کا نظریۂ شاعری؛ تنقیدی شعور؛ جائزے، مطالعۂ حالی؛ مطالعۂ شبلی؛ مطالعۂ انیس ۔ (۳) تذکرہ: اردو کے ہندو ادیب ۔ (۴) اسلامیات: ولی اللٰہی تحریک وغیرہ ۔

عندلیب شادانی، وجاہت حسین

سنبھل (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے ایک صاحب اشتیاق حسین تھے۔ وہ چمڑے اور جوتوں کی بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ اصلاً صدیقی شیخ تھے۔ ان کا نکاح کوچۂ قاضی، رامپور کے پٹھانوں میں ہوا، اور اپنی سسرال کے رواج کے مطابق انھوں نے بحیثیت خانہ داماد اپنی زندگی رامپور میں بسر کر دی۔ یہیں ان کے ہاں وجاہت حسین (عندلیب شادانی) پیدا ہوئے۔ ان کی دسویں درجے کی سرکاری سند پر تاریخ ولادت یکم مارچ ۱۹۰۴ء ثبت ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، وہ اس سے بہت بڑے تھے۔ سرکاری ملازمت میں اس طرح کی غلط بیانیاں ہو جاتی ہیں۔ ان کا سال ولادت غالباً ۱۸۹۷ء تھا۔ مدرسۂ عالیہ رامپور میں تعلیم ہوئی، جہاں ان دنوں سید اولاد حسین شادان بلگرامی کی بدولت چشمۂ فیض جاری تھا۔ انھیں کے فیضان کا نتیجہ تھا کہ عندلیب نے "شادانی" کی نسبت اختیار کی اور وہ بھی ایسی کہ جزوِ علم ہو گئی۔

مدرسۂ عالیہ کی تعلیم کے دوران میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحاناتِ منشی عالم (فارسی)

اور مولوی عالم (عربی) کی اسناد حاصل کیں۔ دسویں درجے میں تھے کہ ایک بدعنوانی کے باعث مدرسے سے نکال دیے گئے۔ اب یہ لاہور چلے گئے۔ یہاں انھوں نے بی اے تک کے امتحانات پرائیوٹ حیثیت میں پاس کیے (۱۹۲۵ء) انھوں نے ملازمت بہت کم عمری میں شروع کی۔ عربی فارسی کی تعلیم تو مکمل کر ہی چکے تھے اور اس زمانے میں پنجاب میں ہر تعلیمی درسگاہ میں یہ زبانیں پڑھائی جاتی تھیں، اس لیے مدرسی کی ملازمت کے حصول میں چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ پہلے ۱۹۲۱ء میں چند ماہ خالصہ ہائی اسکول گُرُدوالہ (ضلع ہوشیار پور) میں رہے، اور اس کے بعد اسلامیہ اسکول بریلی چلے آئے۔ ۱۹۲۴ء میں اسی حیثیت سے ایچیسن کالج لاہور میں ملازمت مل گئی، جہاں والیانِ ریاست اور امرا کے بچوں کی تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ اسی زمانے میں ان کی نواب دوجانہ (ضلع رہتک) سے شناسائی ہوگئی اور وہ انھیں اپنے ولی عہد کا اتالیق بنا کر اپنے ہاں لے گئے۔ دوجانہ میں کوئی دو برس رہے اور ۱۹۲۶ء میں وہاں سے دلی آگئے جہاں ہندو کالج میں اردو فارسی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

دوجانہ کے قیام کے زمانے سے متعلق ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے:

غالب کے احباب میں محمد تفضل اللہ خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کے فارسی اور اردو کے مجموعوں میں ان کے نام کے خطوط شامل ہیں۔ منشی تفضل اللہ خاں نے غالب کے دیوان فارسی کا ایک نسخہ اپنے لیے ۱۲۷۰ھ میں لکھوایا تھا۔ بعد کو یہ نسخہ کسی طرح دوجانہ ریاست کے کتاب خانے میں پہنچ گیا، اور جس زمانے میں عندلیب شادانی وہاں گئے ہیں، وہیں موجود تھا۔ اپنے منصب کے باعث پورا کتابخانہ ان کے تصرف میں تھا۔ انھوں نے یہ خطی نسخہ دیکھا، تو ان کا جی للچا گیا۔ اس کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر بھی تھی۔ بعد کو ان سے یہ تصویر پریذیڈنسی کالج، کلکتہ

کے فارسی کے پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے لی، وہ غالباً اس کا عکس تیار کروانا چاہتے تھے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس کے جلد بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ وصیت کر گئے تھے کہ میرا ذخیرۂ کتب وغیرہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ان کتابوں کے ساتھ یہ تصویر بھی پٹنہ پہنچ گئی اور آج بھی وہاں موجود ہے۔ شادانی مرحوم جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوگئے، تو انھوں نے دیوان کا خطی نسخہ یونیورسٹی کتاب خانے کی نذر کر دیا۔ اس طرح گویا یہ بھی محفوظ ہو گیا۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔

۱۹۲۸ء میں شادانی صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ یہیں سے وہ ۱۹۳۱ء میں لندن گئے، جہاں سے انھوں نے ہندستان کے مسلمان مورخ کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی۔ انھوں نے مسلمان مؤرخوں کی فارسی تصنیفات، انشا، اسلوب وغیرہ پر بحث کی ہے، ان کی تاریخی حیثیت سے اعتنا نہیں کیا۔ گویا موضوع فارسی زبان تک محدود رہا؛ تاریخ سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ وہ مئی ۱۹۶۹ء تک شعبۂ فارسی و عربی سے متعلق رہے ــــ اور اسی مہینے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ اب وہ نقلِ مکان کر کے رامپور آنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ خالقِ حقیقی کا بلاوا آ گیا۔ ان پر دل کا دورہ پڑا جس پر اسپتال میں داخل ہو گئے۔ یہیں ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو عصر سے کچھ پہلے راہ گرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔

انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ جو کچھ انھوں نے پیچھے چھوڑا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ کے اہل تھے۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ایک زمانے میں وہ پریم پجاری کے فرضی نام سے افسانے بھی لکھتے رہے۔ مطبوعہ

سرمایہ یہ ہے :

نظم : نشاطِ رفتہ (غزلیات و منظومات) (لاہور ۱۹۵۱ء)

تحقیق: تحقیقات (۷ تحقیقی مضامین)

تنقید : اردو غزلگوئی اور دورِ حاضر (یہ مضامین پہلے سلسلہ وار ماہنامہ ساقی، دہلی میں چھپے تھے)؛ پیامِ اقبال (خطبۂ صدارت یومِ اقبال ۔ ۱۹۵۰ء)،

افسانہ : سچی کہانیاں ؛ دبنیش

ناول: چھوٹا خدا ۔ (دو طویل افسانے: چھوٹا خدا اور بے روزگار)

دورانِ قیامِ لاہور انھوں نے بعض نصابی کتابوں کے ترجمے بھی تیار کیے تھے مثلاً انشای ابوالفضل (دفترِ اول)؛ چہار مقالۂ نظامی سمرقندی (مقالۂ اول)؛ رباعیاتِ باباطاہر عریان، قصائدِ قاآنی؛ نقشِ بدیع، جدید فارسی زبان کا لغت بھی اسی زمانے کی تالیف ہے ۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۸ء میں ایک روزنامہ ''مشرقی پاکستان'' جاری کیا تھا ۔ چار سال بعد ماہنامہ ''خاور'' نکالا؛ لیکن دونوں مالی مشکلات کا شکار ہو گئے ۔ ان کے اٹھ جانے سے مشرقی پاکستان میں بزمِ اردو کی ایک ایسی شمعِ فروزاں گل ہو گئی جس نے زندگی بھر اپنی علم کی روشنی سے دلوں کو منوّر کیا تھا ۔

پہلے نشاطِ رفتہ کے چند شعر سنیے :

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھیں کی یاد میری زندگی ہے

بیقرار رہتا ہوں اور کچھ نہیں معلوم
دل میں اک تمنّا ہے، یہ خبر نہیں، کیا ہے

محبت میں بھی سب کا حال ایسا تو نہیں ہوتا
کہ دل آتش کدہ بن جائے، آنکھوں سے لہو برسے

جب کسی سے کوئی پیمانِ وفا کرتا ہے
کانپ اٹھتا ہوں کہ میرا ہی سا انجام نہ ہو

جز ترے، کوئی مرے پاس کہاں ہوتا ہے!
اپنے سایے پہ بھی تیرا ہی گماں ہوتا ہے

رات اک بزم میں تھے جور و جفا کے شکوے
دل بھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

چاندنی، اور اداس تنہائی — تم ہو کس حال میں، خدا جانے!

تم پاس ہو، اور دل کا یہ عالم، توبہ! — یہ حال تو جب دور تھے، جب بھی نہ ہوا تھا

چاندنی، سبزہ، لبِ جو، لوگ محوِ اختلاط — تم اگر ہمراہ ہوتیں، ہم بھی ہنستے بولتے

چاندنی افسردہ، گل بے رنگ و بو، نغمے اداس

اک ترے جانے سے، کیا بتلاؤں، کیا کیا ہو گیا

ہائے، کیا گزرے گی اس بربادِ الفت پر، جسے

دردِ دل کہنا ہو، اور یارا نہ ہو تقریر کا

بنتی کبھی نہ حسن و محبت کی داستاں — ناکامیوں نے بات کا افسانہ کر دیا

زمانے کی طرح، اے کاش! وہ بھی بیوفا ہوتا

کہ اب اس کی وفائیں یاد آ کر خوں رلاتی ہیں

اللہ رے، دیوانگیِ شوق کا عالم — وعدہ نہیں، اور جانبِ در دیکھ رہا ہوں

ایک شعلہ ہے کہ سینے میں لپکتا ہے مدام — شاید اتنا ہی محبت کا صلہ ہوتا ہے

بہت مختصر تھے محبت کے لمحے — مگر پھر بھی ہر لمحہ اک زندگی تھا

ناداں سہی، پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم

خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیونکر جئیں گے ہم!

جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے، تقدیر جو دکھائے

دل آج بے حد گھبرا رہا ہے — اے دوست! ان کا کچھ تذکرہ کر

دل کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے — جی چاہتا ہے رونے کو اکثر

دل کا یہ حال کیا ہے غمِ تنہائی نے — کہ ملے صحبتِ دشمن، تو بہل جاتا ہے

اب کچھ ایسا کلام ملاحظہ ہو، جو ان کے مطبوعہ مجموعۂ نظم کے بعد کا کہا ہوا ہے:- یہاں

پوری پوری غزلیں اس لیے دی جارہی ہیں، تاکہ ایک تو یہ محفوظ ہو جائیں؛ دوسرے اس لیے بھی کہ اس طرح ان کا رنگِ سخن پورے طور پر سامنے آجائیگا :-

بڑھ کے جب گیسوئے شب تا بکمر آتے ہیں
اور پھرے مری یادوں کے نگھر آتے ہیں

دوستو! تم پہ بھی گزرا ہے کبھی یہ عالم؟
نیند آتی نہیں اور خواب نظر آتے ہیں

کھل اٹھے پھول، ستاروں کی ضیا تیز ہوئی
دل دھڑکتا ہے کہ شاید وہ ادھر آتے ہیں

چاند پھر لوٹ کے اس بام تک آئے کہ نہ آئے
وہم کیا کیا مجھے ہنگامِ سحر آتے ہیں

پیکرِ ناز کبھی ہو، کبھی تصویرِ نیاز
دلربائی کے تمھیں کتنے ہنر آتے ہیں

پھر نے چھین لیا ماہ سے اپنا پر تو
کتنے ویراں در و دیوار نظر آتے ہیں

یک بیک رات کچھ اس طرح تری یاد آئی
جیسے آوارۂ وطن لوٹ کے گھر آتے ہیں

اب بھی آجاؤ کہ آنکھوں میں ضیا باقی ہے
اب بھی کچھ زیست کے آثار نظر آتے ہیں

کششِ ثقل سے بڑھ کر ہے محبت کی کشش
آسماں سے مہ و خورشید اتر آتے ہیں

ہم اسیروں کے لیے یوں بھی قیامت ہے بہار
چاندنی ہو تو یہ زخم اور ابھر آتے ہیں

اس نے بھیجا ہے مجھے میری محبت کا خراج
جا بجا خط میں ستارے سے نظر آتے ہیں

خاک میں مل گیا میرا حسنِ گماں، خود فریبی کا اب کوئی پہلو کہاں
عہد و پیماں ترے کاغذی پھول ہیں، رنگ ہی رنگ ہے ان میں خوشبو کہاں

خواب کیوں کر کہوں، میں تو بیدار تھا اور اگر سچ ہے یہ سب تو کیونکر ہوا
اب تو آتا نہیں خود مجھے بھی یقیں، اس کے گیسو کہاں میرے بازو کہاں

کون بد ذوق تھا جس نے تشبیہ دی چاند سے اس کے روئے دلآرام کو
چاند کے پاس وہ چشمِ جادو کہاں، چاند کے پاس وہ لعلِ دلجو کہاں

وہ غرورِ جوانی کی باتیں گئیں، وہ محبت کی بیدار راتیں گئیں
وقت کا سیل سب کو بہالے گیا، اب نگاہِ تمنا میں جادو کہاں

لیلۃ القدر کل میری تنہائی تھی، آسمانوں سے جنت اتر آئی تھی
آج لیکن کسے اعتبار آئیگا، بالشِ نازِ ابِر بازو کہاں

کامرو دیس بھی چھان مارا، مگر سحرِ افسوں کا پایا نہ کوئی اثر
تیری آنکھوں میں ہے موہنی، فتنہ گر! ورنہ بنگال میں اور جادو کہاں

اپنے دامن سے پونچھے وہ آنسو مرے بس یہی درد الفت کی معراج ہو
نقش بر آب ہے یہ تمنا مگر، اُس کا دامن کہاں میرے آنسو کہاں

ان میں صہبائے الفت چھلکتی ہوئی، اُن میں وحشت ہی وحشت جھلکتی ہوئی
کیفِ الفت سے وحشت کو نسبت ہی کیا، تیری آنکھیں کہاں، چشمِ آہو کہاں

شبنمِ غم کی تراوش، کبھی ایسی تو نہ تھی
مری تمنا کی بالش، کبھی ایسی تو نہ تھی

دل میں کھبتی تھیں بہت چاند کی کرنیں لیکن
چاند کے قرب کی خواہش، کبھی ایسی تو نہ تھی

جذبِ اخلاص کا اعجاز ہے، یا موجِ سراب
مرے اندوہ کی پرسش، کبھی ایسی تو نہ تھی

ترے جلوے تو وہی ہیں مگر، اے ماہِ تمام!
دل میں جذبات کی شورش، کبھی ایسی تو نہ تھی

سجدے کرتی تھی نظر چاند کو پہلے بھی، مگر
آرزو مندیِ پرستش، کبھی ایسی تو نہ تھی

تو نے پہلے بھی مجھے روشنیاں دی تھیں، مگر
دل پہ انوار کی بارش، کبھی ایسی تو نہ تھی

نہ ٹھہر سکتی ہیں نظریں، نہ پلٹ سکتی ہیں
شعلۂ حسن میں تابش، کبھی ایسی تو نہ تھی

سیمن اندامی و گل پیرہنی، قہر پہ قہر
حشر بن جانے کی خواہش، کبھی ایسی تو نہ تھی

اب جو پایا ہے ترا پیار، تو جی ڈرتا ہے
سحر و شام کی گردش، کبھی ایسی تو نہ تھی

شوق کی رات ہے، ناز کی رات ہے
اور تقدیر سے چاندنی رات ہے

نغمہ ہے چاندنی، بادہ ہے چاندنی
آج طوفانِ جذبات کی رات ہے

غمکدہ پھر شبستانِ عشرت بنا
چاند نکلا تو پھر چاندنی رات ہے

اک پہیلی ہے، بُوجھو تو جانیں، کہ ہاں
آج کیوں اس قدر موہنی رات ہے!

خود ہی گِن لو مری زیست کی ساعتیں
آج تم سے ملے کون سی رات ہے؟

صبح ہوتے ہی، پھر ہم کہاں، تم کہاں
بزمِ انجم، فقط رات کی رات ہے

رہ چکے، آؤ، ہنس بول لیں دو گھڑی
جو نہ آئیگی پھر، یہ وہی رات ہے

دردِ دل کہتے سنتے سحر ہو گئی
کیا خبر تھی کہ، یہ آخری رات ہے

شمع گُل ہو گئی، چاند بھی چھپ گیا
دل سنبھلتا نہیں، اور ابھی رات ہے

پھول ہی پھول تھے، اشک ہی اشک ہیں
رات کل بھی تھی، اور آج بھی رات ہے

وہ ضیائے تبسم کی صبحیں کہاں
زندگی اب فقط رات ہی رات ہے

ہائے کیونکر یہ منظر دکھاؤں تمھیں
میری پلکوں پہ تاروں بھری رات ہے

کتنی سنسان و ویران و اندوہ گیں
یہ وہی کل کی ہنستی ہوئی رات ہے

اگلی سی کہاں وہ رونقِ بزمِ سخن!
حسرت ہیں، نہ اصغر ہیں، نہ فانی باقی
کل ہم بھی نہ ہونگے، اے عزیزانِ وطن!
رہ جائیگی بس ایک کہانی باقی

بیخود، عباس علی خان

ان کا خاندان پٹھانوں کا تھا لیکن ان لوگوں نے مدت سے لڑائی بھڑائی کا مشغلہ ترک کرکے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے والد رمضان علی خان بھی مدرسی پیشہ تھے۔ بیخود ۲ جولائی ۱۹۰۶ء کو قصبہ قاضی کی سرائے (ضلع فیض آباد یو پی) میں پیدا ہوئے۔ بچپن وطن ہی میں گزرا۔ سن بمشکل بارہ برس کا ہوگا کہ ۱۹۱۸ء میں بعمر بارہ برس، اپنے دادا کی معیت میں کلکتے چلے گئے، جو تلاش روزگار میں وہاں گئے تھے۔ ابتدائی درجوں کی تعلیم وطن میں مکمل ہو چکی تھی! اب مڈل کے بعد سے آخر تک پوری تعلیم کلکتے میں پائی۔ دسویں درجے میں امتیاز حاصل کرنے کے نتیجے میں دو سال کے لیے "امیر کبیر وظیفہ" ملا۔ ۱۹۳۰ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ سے بی اے کا امتحان پاس کیا، تو فارسی (آنرز) میں نہ صرف درجۂ اول پایا، بلکہ صوبے بھر میں اول آئے۔ یہی صورت دو سال بعد ایم اے میں رہی۔

ایسے کامیاب تعلیمی دور کے بعد ملازمت کی کیا کمی تھی! چنانچہ فوراً ہی کلکتہ مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ چندے بعد اپنی مادر علمی اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج)

ہیں چلے گئے۔ سب سے آخر میں پریزیڈنسی کالج، کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے
رہے، زندگی کا آخری زمانہ یہیں گذرا۔
بڑے یار باش اور مجلسی آدمی تھے، دوستوں کے درمیان، جن کا حلقہ بہت وسیع تھا،
خوب چہکتے تھے۔ ابتدائی زمانہ بہت عسرالحالی اور تنگی ترشی میں بسر ہوا تھا، اس لیے
طبیعت بہت جُزرس ہوگئی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کلکتہ جیسے گراں شہر میں انھوں نے
اپنی سلیقہ مندی سے ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں حج بھی کیا تھا۔
بہت دن سے تنفس کا عارضہ تھا۔ ۲؍ اگست ۱۹۶۹ء صبح کے وقت اس کا شدید دورہ
پڑا۔ علاج کے لیے رحمت بائی اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ لیکن وہاں بھی کوئی افاقہ
نہیں ہوا۔ اسی دن آدھی رات سے کچھ پہلے ساڑھے گیارہ بجے انتقال ہو گیا۔ اگلے
دن (۷؍ اگست) سہ پہر کو جنازہ اٹھا۔ تلجلا روڈ کے گوبرا قبرستان (۱) میں دفن ہوئے۔
پرویز شاہدی بھی یہیں مدفون ہیں۔ بیخود کی قبر ان کے بالکل ہی قریب بلکہ عین
اس کے پائین کوئی گز بھر کے فاصلے پر ہے۔ وصیت کی تھی کہ میری قبر کچی رکھی جائے۔
چنانچہ تعمیلِ ارشاد میں یہی کیا گیا۔ اس سے قوی اندیشہ ہے کہ مرورِ زمانہ سے اس کا
نام و نشان تک مٹ جائیگا۔ لیکن یہ بھی وہم اور خام خیالی ہے ــــــــــ
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے۔ ان کے خواجہ تاش جمیل مظہری نے ایک رباعی میں
ہجری تاریخ کہی ہے:

بزمِ احباب کی وہ زینت نہ رہا	وہ وارثِ مسندِ صدارت نہ رہا
بیرونقیِ بزم پہ مرگِ بیخود	کہتی ہے کہ "جانشینِ وحشت نہ رہا"

(۱۳۸۹ھ)

اگرچہ انھوں نے تفنناً چند نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ہے یہ کہ وہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کی
دو کتابیں چھپ چکی ہیں (۱) مطالعۂ قدرت (کلکتہ ۱۹۳۵ء) یہ درسی کتاب ہے جس میں

بچوں کے لیے مختلف معلوماتی مضامین ہیں (۲) جامِ بیخودی (کلکتہ ۱۹۴۶ء) کلام کا مجموعہ ہے۔ بعد کا کوئی ربع صدی کا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ کچھ نثری مضامین بھی ہیں جو مختلف رسائل میں منتشر پڑے ہیں۔ مطبوعہ کلام میں غزلیات، منظومات، نعتیہ کلام اور جارج پنجم کی مدح میں قصیدہ تک ہے۔

کلام پر رضا علی وحشت مرحوم (ف جولائی ۱۹۵۶ء) سے اصلاح لی۔ اور انھیں سے غالب سے عقیدت بھی ورثے میں پائی، کلامِ غالب کے عاشق تھے۔ لکھتے ہیں،

کلامِ حضرتِ وحشت پسند ہے، بیخود!
کمالِ حضرتِ غالب کو مانتا ہوں میں

جس طرح وحشت سے بہت لوگوں نے فیض پایا، اسی طرح بیخود کے طفیل اس شمع سے کئی اور شمعیں روشن ہوئیں کلکتے میں ان کے شاگردوں کا اچھا بڑا حلقہ موجود ہے خدا نے انھیں قابل اور نیک جسمانی اولاد سے بھی نوازا۔ چار صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ انھوں نے سب کو معقول تعلیم دلائی۔ سب سے بڑے لڑکے جناب اختر حسن خاں، ایم ایس سی، سینٹ زیویر کالج، کلکتہ میں سائنس پڑھاتے ہیں۔

پہلے چند شعر ملاحظہ ہوں، جو جامِ بیخودی سے بعد کا کلام ہے:

کسی سے عشق کرنا اور اس کو باخبر کرنا
ہے اپنے مطلب دشوار کو دشوار تر کرنا

نزع کی سختی بڑھی، ان کو پشیماں دیکھ کر
موت مشکل ہو گئی، جینے کا ساماں دیکھ کر

بدل سکا نہ زمانے کے ساتھ ہی، افسوس!
بدل گئی ہے نگہ اس لیے زمانے کی

الگ ہوا خضر سے یہ کہہ کر
میں اپنی منزل پہ جا رہا ہوں

آپ کہیے، مگر خیال رہے
بات پھر لوٹ کر نہیں آتی

کون کس کا ہے، کون سنتا ہے
کس سے کس کا گلہ کرے کوئی

موت وہ مانگے جو لذت کش بیداد نہیں
ناخنِ غم کا بدل، تیشۂ فرہاد نہیں

آئینہ بن گئے تری بزم کی زینت تو ہوا کچھ تو کام آیا، مجھے دیکھ کے حیراں ہونا

تعجب کیا، اگر مجھ کو محبت پھر جواں کر دے جھلک ہے حسنِ یوسف کی، زلیخا کی جوانی میں

دل آنسو کی دو بوندوں سے کچھ ہلکا سا ہو جاتا ہے

اب اس سے زیادہ اور اُجالا ٹوٹے تارے کیا کرتے!

نہ سنگِ میل، نہ نقشِ قدم، اندھیرا ہے تری تلاش نے گم کر دیا کہاں مجھ کو!

چمک کر رنگ پر آنا، یکایک پھر اجڑ جانا تمنّا کی ہیں تصویریں، یہ آنے کی وہ جانے کی

کوشش ہے عبث، تدبیر غلط، فطرت کا بدلنا نا ممکن

جو ہوتا ہے، وہ ہونا تھا؛ جو ہوگا، اس کو ہونا ہے

آخر میں چند شعر اور دیکھیے، جو ان کے مطبوعہ مجموعے جامِ بیخودی سے ماخوذ ہیں:

بیخود پڑا تھا در پہ، تو پوچھی نہ بات بھی اب حال پوچھتے ہیں غریب الدّیار کا

ہر بوالہوس پہ حیف، ستم ہو گیا روا جنسِ وفا کو آپ نے ارزاں بنا دیا

بیخود! ہمارے دل میں بھی کیا کیا خیال تھے سب کو فلک نے خوابِ پریشاں بنا دیا

یہ شانِ بے نیازی ہے، خدا معلوم ہوتا ہے

خدا معلوم، کیا ہوتا، اگر وہ بت خدا ہوتا!

اگرچہ عہدِ وفا کا نہ اعتبار آیا بہت ہے یہ بھی کہ دل کو تو کچھ قرار آیا

بیخود کہاں ہیں اگلی بہاریں جنوں کی جب تھا تنگ ہم سے پیرہن اور پیرہن سے ہم

جب آئے منزلِ الفت، اٹھا کے پھینک دے بوجھ حکمت کا

کہ لذّت ہے محبّت کی، فریبِ حسن کھانے میں

نکاتِ علم و فن سارے یہاں اوہامِ باطل ہیں

نہیں کچھ فائدہ ان مسئلوں پر سر کھپانے میں

بصد سرمایۂ دانش، جھکا دے سر کو قدموں پر

بصد پندارِ خودداری، تو رسوا ہو زمانے میں

بتکدے سے چھوٹ کر ایسا ہوا بے خانماں — جیسے زیرِ آسماں میرا خدا کوئی نہیں

جان کر بیخود ہوا خود دشمن اپنی جان کا — پھر گلہ کیوں دوستوں سے ہے مرا کوئی نہیں

مرے خیال نے خلوت کو کر دیا محفل — تری نگاہ نے خلوت بنا یا محفل کو

کہاں سے آئی یہ حیرت نگاہ بیخود میں — کہ اس کو دیکھ کے سکتہ ہے اہلِ محفل کو

وہ مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں — کیا کم ہے یہ زمیں بھی، اگر آسماں نہ ہو

ان کو منظور خود نمائی تھی — چھیڑ تھی ایک لن ترانی بھی

ہم ان کو مہرباں پاکر، کہیں کیا آرزو دل کی — نگاہِ برق سے ظاہر ہے جو قسمت ہے حاصل کی

فقط اک پاسِ ذوقِ جستجو ہے، کیا کروں بیخود! — دگرنہ عافیت معلوم ہے مجھ کو بھی منزل کی

جام گردش میں ہو، اور دور کبھی مجھ تک پہنچے — کبھی ایسی بھی تو اک گردشِ دوراں ہو جائے

بیخودی سرحدِ ادراک وجنوں ہے، بیخود! — دو قدم اور کہ طے عالم امکاں ہو جائے

چمن میں برق ہے، گلچیں ہے، اور ہے صیّاد — قفس میں پھر بھی تڑپتا ہے دل چمن کے لیے

راضی بہ رضا تھا تو، لیکن جب پوچھا تھا، کچھ کہنا تھا

بیخود! یہ تری خاموشی میں اک شکوہ پایا جاتا ہے

شکوۂ جور وجفا کیونکر کریں اہلِ وفا — آپ کے مہر ووفا کی یاد اب تک دل میں ہے

کوششِ پیہم کا حاصل التفاتِ برق ہے — فکرِ حاصل ہے عبث، وہ سعیِ لاحاصل میں ہے

نہ پھر نگاہیں بتوں سے، تو خدا کو مان لیا — مجھے خوف ہے خدا کا، تجھے خوف ہے خدا سے

ہماری ہستی نمود اس کی، جو وہ ہے جوہر، تو عرض ہیں ہم

نہ تھے جو ہم، تو خدا کہاں تھا، نہیں جو ہم، تو خدا نہیں ہے

(ابو سعید) محمد مخدوم محی الدین

سلسلۂ نسب مشہور صحابی رسولؐ حضرت ابو سعید خدریؓ تک پہنچتا ہے۔ بزرگوں کا وطن اعظم گوڑھ (یوپی) تھا۔ یہ خاندان سلطنتِ مغلیہ سے وابستہ رہا۔ اسی سلسلے میں ان کے جدِ اعلیٰ اورنگ زیب عالمگیر کی مہم دکن میں ان کے ساتھ چلے گئے اور پھر وہیں حیدر آباد کے ہو کر رہ گئے۔ مخدوم کے والد غوث محی الدین تعلقۂ اندول میں تحصیل کے محرر تھے! گرچہ مخدوم کی تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن غالباً صحیح تاریخ ۴ فروری ۱۹۰۸ء (یکم محرم ۱۳۲۶ھ) ہے بہ مشکل سے چار سال کے ہونگے کہ والد کا عین جوانی میں بعمر ۲۹، ۳۰ سال انتقال ہو گیا اور ان کی کفالت اور تعلیم و تربیت ان کے چچا بشیر الدین نے اپنے ذمّے لے لی۔

گھر کا ماحول ٹھیٹ مذہبی تھا۔ اس لیے نہ صرف تعلیم کا قرآن اور عربی سے آغاز ہوا بلکہ نماز روزے کی پابندی، اور روزانہ ختمِ خواجگان اور مسجد کی جاروب کشی اس کا لازمی جزو قرار پائے۔ غالباً بعد کے زمانے میں مذہب سے بُعد اور اشتراکی خیالات سے قرب اسی ابتدائی ماحول کا ردِ عمل تھا۔

مخدوم نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند لی اور اس کے بعد وہیں سٹی کالج میں اردو پڑھانے لگے۔ لیکن جلد ہی اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان کی دلچسپی اشتراکی خیالات اور اسی وجہ سے ٹریڈ یونین تحریک سے تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض کانفرنسوں میں شرکت کے لیے یورپ کا سفر بھی کیا، اور چندے وہاں مقیم بھی رہے۔

۱۹۵۶ء میں عام انتخابات کے موقع پر وہ آندھرا پردیش اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، اپنی وفات تک وہ اس کے رکن رہے۔

وہ بعض جلسوں میں شرکت کے لیے دلّی آئے ہوئے تھے کہ بدقسمتی سے ۲۴ اگست ۱۹۶۹ء صبح کو ان پر دل کا دورہ پڑا۔ فوراً ارون اسپتال بھیج دیے گئے۔ وہاں حالت کچھ سدھر رہی تھی کہ اگلے دن مرض کا دوبارہ حملہ ہوا، اسبکے یہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ۲۵ اگست کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے جاں بحق ہوئے۔ ۲۶ اگست کو لاش ہوائی جہاز سے حیدرآباد منتقل ہوئی، جہاں اسی دن رات کو نام پلی کے نواح میں قدیمی قبرستان، درگاہ شاہ خاموش میں سپردِ خاک ہوئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں چیخوف کے ڈرامے (Cherty Otchard) کو اردو میں "پھول بن" کے نام سے منتقل کیا تھا اور اس کے نام و مقام تبدیل کر کے اسے بالکل حیدرآبادی فضا کے مطابق کر لیا تھا۔

ان کی زندگی میں کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے: سرخ سویرا (۱۹۴۴ء) گلِ تر (۱۹۶۱ء) اور بساطِ رقص (۱۹۶۶ء) آخری مجموعے میں مجموعۂ اول (سرخ سویرا) کی تمام نظمیں شامل ہیں۔ مخدوم کا کلام اگرچہ اشتراکیت اور سیاست سے بہت متاثر ہے، لیکن ان کے خلوص نے اس میں ایسا رنگ و روغن بھر دیا ہے کہ انھیں قبولِ عام کا درجہ حاصل ہو گیا۔

ان کی وفات کے بعد ان کے مجموعے 'بساطِ رقص' پر ساہتیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۹ء کا پانچ ہزار

انعام دیا، یہ ان کی بیوی کو ادا کیا گیا تھا۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو، جو بساطِ رقص سے ماخوذ ہے:

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو　　چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

بات کیا تھی، ذکر کس کا تھا کہ ہنگامِ نشاط　　مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

جہاں بھی بیٹھے ہو، جس جا بھی رات مے پی ہے
انھیں کی آنکھوں کے قصّے، انھیں کے پیار کی بات

یہ زرد زرد اجالے، یہ رات رات کا درد
یہی تو رہ گئی اب جانِ بیقرار کی بات

تمام عمر چلی ہے، تمام عمر چلے
الٰہی! ختم نہ ہو یارِ غمگسار کی بات

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی　　اٹھا ہوں خواب میں اک خوابِ تمام لیے

وہ جو چھپ جاتے تھے، کعبوں میں صنمخانوں میں　　ان کو لا لا کے بٹھایا گیا ایوانوں میں

فصلِ گل ہوتی تھی، کیا جشنِ جنوں ہوتا تھا　　آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے　　گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

آج تو طنزِ محبت کا اثر باقی ہے　　قہقہے گونجتے پھرتے ہیں بیابانوں میں

وصل ہے ان کی ادا، ہجر ہے ان کا انداز　　کون سا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدوم!
تذکرے رستوں میں، چرچے ہیں پریخانوں میں

شاعر

کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی، کچھ نور چرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا، کچھ کیف اڑایا بہاروں سے

پھولوں سے مہک، شاخوں سے لچک، اور مینڈھوں سے ٹھنڈک
جنگل کی کنواری کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرمایہ

بدمست جوانی سے چھینی، کچھ بےفکری، کچھ الّھڑ پن
پھر حسنِ جنوں پرور نے دی آشفتہ سری، دل کی دھڑکن

بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چُن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے اک اپنا گیت بناتا ہوں

فردوسِ خیالی میں بیٹھا، اک بُت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

خوش نہ تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئیگا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئیگا

نظریں نیچی کیے، شرمائے ہوئے آئیگا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئیگا

آگئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غمخانہ میں شہنائی سی

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو، آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی، اب جانے لگی

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے انگڑائی لی
او صبا! تو بھی جو آئی، تو اکیلی آئی

میرے محبوب! مری نیند اڑانے والے
میرے مسجود! مری روح پہ چھانے والے

آبھی جا! تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آبھی جا! تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

اقبال

اس اندھیرے میں یہ کون آتشِ نوا گانے لگا!
جانبِ مشرق اجالا سا نظر آنے لگا

موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں، چھٹنے لگیں
ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں، چھٹنے لگیں

اک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا
آسماں کے نور پیکر نوجوانوں تک گیا

عالمِ بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے

پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا
زندگی کے موڑ پر گاتا ہوا پایا گیا

وہ نقیبِ زندگی، شام و سحر گاتا گیا
کُو بکو، کوچہ بکوچہ، در بدر گاتا گیا

گیت سننے کے لیے، خلقِ خدا آنے لگی
گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی

"نغمۂ جبریل ہے، انسان کا گانا نہیں
صُورِ اسرافیل ہے، دنیا نے پہچانا نہیں"

"عرش کی قندیل ہے، اک آسمانی آگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے"

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے، دور سے آئی ہے، مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئیگا
رات ٹوٹیگی، اجالوں کا پیام آئیگا

آج کی رات نہ جا

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی، زنجیر بھی، جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے، حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی، آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی درد بھی ہے، زندگی دلدار بھی ہے

آج کی رات نہ جا

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب، کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے، تیری محبّت کی نظر

آج کی رات نہ جا

بھاگ متی

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے، کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام دفا آتا ہے

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی، رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

دھن کی گھنگھور گھٹائیں ہیں، نہ ہُن کے بادل
سونے چاندی کے گلی کوچے، نہ ہیروں کے محل
آج بھی جسم کے انبار، ہیں بازاروں میں
خواجۂ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے، محبت کا نشاں باقی ہے
دلبری باقی ہے، دلدادیِ جاں باقی ہے

سر فہرستِ نگارانِ جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے، تری چشمِ نگراں باقی ہے

نہرو

ہزار رنگ ملے، اک سُبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غُبار، مشتِ بہار
ہوا ہے وادیِ جنّت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دُور جستجو بن کر

راز چاندپوری، محمد صادق

۲۵ مارچ ۱۸۹۲ء کو چاندپور (ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ خاندان میں پیشۂ سپہگری پشتوں سے چلا آتا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد حالات دگرگوں ہو گئے، اور ان کے والد حافظ محمد جعفر کو کمر کھول، ملازمت کو ذریعۂ معاش بنانا پڑا۔ راز جب تعلیم مکمل کر چکے، تو انھوں نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں جب ان کا تبادلہ کانپور ہوا، تو یہ وہاں کے مشہور ماہنامہ "زمانہ" کی ترتیب میں منشی دیانرائن نگم (ف ۱۹۴۲ء) کے معاون بن گئے۔ یہ سلسلہ کم و بیش چار برس تک قائم رہا اور اس کے بعد ان کے جبلپور چلے جانے کے باعث منقطع ہو گیا۔

کلام پر اصلاح سیماب اکبرآبادی سے لی اور اس میں شک نہیں کہ خود استادی کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ نظم کے علاوہ نثر سے بھی دلچسپی تھی، افسانے بھی لکھتے تھے۔ مطبوعہ کتابوں میں زیادہ اہم یہ ہیں:۔

زرّیں افسانے؛ دنیائے راز (منظومات)؛ نوائے راز (غزلیات)؛ سیماب اکبرآبادی (سوانح)؛ داستانے چند (یادداشتیں)

غیر مطبوعہ کتابوں میں صحیفۂ راز (منظومات) اور حدیثِ راز (رباعیات) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ٹالسٹائی کے ایک ناول کا بھی ترجمہ بعنوان 'ماشا' کیا تھا؛ یہ بھی نہیں چھپ سکا۔ بچوں کی جوانا مرگی اور خاص کر رفیقۂ حیات کی دائمی مفارقت کے باعث ان کے آخری ایام بہت افسردگی اور دل گرفتگی اور گوشہ نشینی میں بسر ہوئے۔ اسی عالم میں ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

اب چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔ جو ان کے مجموعۂ کلام نوائے راز (الہ آباد ۱۹۶۱ء) سے منتخب ہیں:

راز سے مل کے آپ خوش ہونگے
آدمی ہے۔ بڑی محبت کا

جینے کا مزہ جب ہے، جینے سے ہو کچھ حاصل
یوں لاکھ جیے کوئی، تو جینے سے کیا ہو گا

محبت، اور پھر اُس کی محبت، آہ کیا کہیے!
تڑپ اٹھتا ہے دل، جب نام سنتا ہوں محبت کا

وہ بتکدہ تھا، غلط؛ خیر، بتکدہ ہی سہی
مری نگاہ میں تو اُس کا آستانہ تھا

سو طریقے ہیں پرستش کے، اگر ذوق ہو کچھ
کیا بڑی بات ہے کوئی اسے سجدا کرنا؟

مشکلیں آساں ہوں؛ یہ آساں بھی ہے، دشوار بھی
مطمئن ہوں کیا نظامِ بزمِ امکاں دیکھ کر

جانتا ہوں، مگر بشرطِ ادب
ہوں خطاوار بےخطا ہو کر

رکھ نظر میں حدودِ حسنِ عمل
کامیابی کا ہے یہی اک راز

جس طرف اٹھ گئی نگاہِ شوق
وقفِ سجدہ ہوئی جبینِ نیاز

دل نہیں پہلو میں، دردِ دل نہیں
آہ! اب جینے کا کچھ حاصل نہیں

چین ملتا ہی نہیں دہر میں دیوانے کو — دیکھنے آتی ہے دنیا مرے ویرانے کو

اک خانماں خراب کی دولت کہیں جسے — وہ دردِ دل میں ہے کہ محبت کہیں جسے
رعنائیٔ خیال کے قربان جائیے! — صورت ہے وہ نظر میں حقیقت کہیں جسے
دردِ فراقِ یار کی مجبوریاں، بجا! — اتنا تو ہو نہ شور، قیامت کہیں جسے
دے سکتا ہو، تو دے مجھے دادِ ستمکشی — یا وہ سلوک کر کہ عداوت کہیں جسے
لذت کشِ نظارہ ہے تیری نظر، تو کیا! — اتنی تو بیخودی نہ ہو کہ حیرت کہیں جسے
باقی کہاں ہے رازؔ! زمانے میں آجکل — وہ حسنِ دل نواز، محبت کہیں جسے

اک وقت میں دو باتیں، کیونکر نہ ہو دشواری
دنیا کی طلب کوشی، عقبیٰ کی طلب گاری

اللہ اللہ، یہ بیچارگیٔ اہلِ ہنر! — اہلِ الفت کا جہاں میں نہیں پرساں کوئی
زندگی ہو گئی کیا بزمِ جہاں سے رخصت؟ — نظر آتا نہیں اب سوختہ ساماں کوئی

ناکامِ محبت ہوں میں، اے رازؔ تو کیا غم؟ — یہ بات بھی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی

جو دم ہے غنیمت ہے خراباتِ جہاں میں — پابندِ نفس گردشِ ایام نہیں ہے

حاصل نہ ہوگا کچھ بھی اخفائے راز سے — آئینۂ حالِ دل ہے جبینِ نیاز سے
موقع بھی مل ہی جائیگا پھر عرضِ حال کا — حاصل تو کر نیاز ذرا چشمِ ناز سے
ہے جستجوئے سرِ حقیقت ابھی فضول — واقف نہیں تو اپنی حقیقت کے راز سے
اے خوش نوائے بزمِ محبت! اٹھا رباب — بھر دے دلوں کو آتشِ سوز و گداز سے
وہ نغمہ چھیڑ، وجد میں آجائیں اہلِ دل — گونج اٹھے بزمِ ناز نوا ہائے راز سے
للہ، ایک جام مے جاں نواز کا! — ہاں، ایک جامِ میکدۂ سوز و ساز سے
اعجازِ چشمِ لطف کا احسان ہے یہ، رازؔ! — سوزِ دروں بدل دیا دم بھر میں ساز سے

کیا زمانہ ہے، اے معاذ اللہ! — قلبِ میکش ہے مخزنِ اذکار

زندگی ہے، نہ اب وہ زندہ دلی   زاہدِ خشک ہے ہر اک میخوار
رازِ دل کس سے کہوں میں حالِ دل   برہمن غیر، شیخ دنیا دار

قدم آگے بڑھا، اے مردِ میداں! دیکھتا کیا ہے
فریبِ رہبری دیتی ہے دنیا، خود نما ہو کر
یہ برہمن ہے، یہ شیخِ حرم، یہ پیرِ مغاں   یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی میفروش نہیں!

مفتی انتظام اللہ شہابی

قصبۂ گوپامئو (ضلع سیتاپور) کے ایک علمی خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ شیخ آدم بن محمد نبیرۂ حضرت شہاب الدین سہروردی اوچہ سے ۸۰۰ھ میں گوپامئو آئے۔ سب سے پہلے عہدِ بابری میں ان کے ایک بزرگ عہدۂ افتا سے سرفراز ہوئے اور اس کے بعد اور کئی حضرات بھی مفتی مقرر ہوئے۔ جب سے خاندان کے افراد کے نام میں لفظ مفتی کا جزو عَلَم کی طرح سے اضافہ ہو گیا۔
فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب میں اس خاندان کے ایک فرد شیخ وجیہ الدین بھی شامل تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کے دادا مفتی انعام اللہ تحصیل علم کے بعد کلکتہ گئے اور وہاں مسٹر کولبروک کے بیٹے کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ جب کولبروک دلی میں ریذیڈنٹ مقرر ہوا، تو یہ ریذیڈنٹی میں سررشتہ دار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اسی زمانے میں اکبر شاہ کی طرف سے انھیں خاقی کا خطاب عطا ہوا۔ غالب کے دوستوں

میں منشی غلام غوث خان بیخبر بھی تھے، یہ انھیں مفتی انعام اللہ کے داماد تھے۔ مفتی انعام اللہ بالآخر ریاست ٹونک میں مہتمم بندوبست مقرر ہوئے تھے، وہیں سے بیمار ہوکر آگرے آئے اور یہاں ۱۲ شوال ۱۲۷۸ھ کو انتقال کیا۔

مفتی انتظام اللہ صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے۔ انتظام اللہ کی تعلیم سراسر فارسی اور عربی تک محدود رہی، لیکن آخری زمانے میں اپنے طور پر اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ مختلف کتابوں سے استفادہ کرسکتے تھے۔ متوسطات تک دینیات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد نقشہ نویسی اور انجینئرنگ سیکھی، لیکن ملازمت کی بجائے تجارت میں لگ گئے؛ مدتوں اپنے بہنوئی ارشاد حسین کی شراکت میں جانوروں (شیر، ہاتھی وغیرہ) کی خرید و فروخت کرتے رہے۔ یہ مشغلہ دس سال یعنی ۱۹۲۵ء تک رہا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق شروع سے تھا۔ اور انتظامی قابلیت بھی اچھی تھی، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں بائبل سوسائٹی کے طرز پر دائرۂ معارفِ قرآنیہ قائم کیا اور اسی کی طرف سے قرآن، حدیث، سیرتِ رسول وغیرہ سے متعلق کئی چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے۔

۱۹۴۵ء میں وہ یہاں دلی آگئے اور دنیا کتاب گھر (ناشرین) کے ہاں سوا سو روپے مشاہرے پر ملازمت کرلی۔ یہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں ندوۃ المصنفین سے بھی تعلق پیدا ہوگیا۔ اس ادارے کے لیے انھوں نے سلاطین ہند اور تاریخ ملت کے کئی حصے مرتب کیے۔ برہان (ماہنامہ) کی ترتیب میں بھی کچھ دنوں شریک رہے۔

۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں متعدد علمی و ادبی اداروں سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ آخر تک لکھتے رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب "داعیِ اسلام" ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی، اور آخری "قافیہ سنجانِ اکبرآباد" ۱۹۶۸ء میں۔ ان ۵۴ برس میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ "مشاہیرِ اکبرآباد" میں انھوں نے اپنی ۱۲۹ کتابوں کی نشاندہی

کی ہے۔ ان میں سے بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ ان کے موضوعات بھی بہت متنوع ہیں۔
ان کی سب سے بڑی کمزوری حالات اور حوالے وضع کرنا تھی۔ اس کے لیے وہ بے تکلف
کسی کتاب کا حوالہ دے دیتے، اور لکھ دیتے کہ یہ قلمی کتاب ہمارے خاندان گوپامئو
کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ حالانکہ نہ وہ واقعہ ہی درست ہوتا، نہ اس نام کی
کوئی کتاب ہی عالم وجود میں ہوتی، اور نہ گوپامئو میں کوئی کتاب خانہ ہی تھا۔ لوگ ان پر
اعتراض کرتے، لیکن یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی اپنی حرکت سے پشیمان ہوا، نہ اس نے اپنی
یہ افسوسناک اور گمراہ کن روش ترک کی۔ معترضوں سے کہہ دیتے: میاں، تم اعتراض
کرتے رہو۔ میں اپنا کام کرتا ہوں، بعد کے لوگ درست کر لینگے؛ لیکن اس سے کسی
نہ کسی طرح سے "یارخاں" کا نام تو آجاتا ہے (یہ ان کا تکیہ کلام تھا اور اس سے ان کا
اشارہ اپنی طرف ہوتا تھا) خود میں ایک مرتبہ بہت پریشان ہوا۔ انھوں نے اپنی ایک
تحریر میں ایک قلمی کتاب کا حوالہ دیا اور لکھ دیا کہ یہ خطی نسخہ ارکاٹ کے کتابخانے میں
محفوظ ہے۔ چونکہ موضوع سے مجھے دلچسپی تھی، میں نے اپنے بعض مدراسی دوستوں سے
استمداد کی۔ مہینوں کی تگ و دو کے بعد راز کھلا کہ سب جعل تھا۔ انا للہ وانا الیہ
راجعون۔ پیر کے دن ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء ساڑھے چھ بجے شام کراچی میں انتقال ہوا۔

علی عباس حسینی (سید)

سید علی عباس حسینی ۳ فروری ۱۸۹۷ء کو ضلع غازیپور کے ایک گاؤں پارہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں بی اے کی سند لے کر انھوں نے ایل ٹی میں داخلہ لیا اور جب ۱۹۲۱ء میں یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو مدرسی کا پیشہ اختیار کیا اور محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں پرائیویٹ امتحان سے ایم اے کی سند لی۔ ساری عمر درس و تدریس میں گزری اور تقریباً ۳۴ برس کی ملازمت کے بعد ۱۹۵۴ء میں پرنسپلی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں انگریزی زبان کے افسانوی ادب کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اسی کے زیرِ اثر خود بھی افسانہ نویسی کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ 'پژمردہ کلیاں' تھا، جو انھوں نے ۱۹۱۷ء میں لکھا۔ لیکن ان کا سب سے پہلا مطبوعہ افسانہ 'جذبِ کامل' ہے جو کانپور کے مشہور رسالے 'زمانہ' میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'رفیقِ تنہائی' شائع ہوا تو اس پر ہندستانی اکادمی، الہ آباد نے انعام دیا تھا۔

انھیں اپنی تصنیفات پر چار مرتبہ انعام ملا۔ ایک تو یہی ہندستانی اکادمی کی طرف سے؛ دو مرتبہ پرسکار یوجنا سمتی کی طرف سے اور ایک بار ایک امریکی اخبار کی طرف سے، جس نے مختلف ملکوں کے افسانوں کے مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ اسی سلسلے میں اتر پردیش حکومت کے اس پانچ ہزار کے خاص انعام کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، جو ان کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں مارچ ۱۹۶۸ء میں دیا گیا تھا۔

دورانِ ملازمت میں انھوں نے درسی نصاب کے سلسلے بھی تیار کیے تھے۔ ایک تو کامن لینگویج ریڈرس کے عنوان سے؛ یہ تقریباً ۱۴ برس تک یوپی کے مختلف اضلاع میں رائج رہا۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں درجوں کے لیے اردو کورس اور پھر ہائی اسکول کے لیے۔ اس وقت بھی ان کی کتاب گلستانِ نثر و نظم" کشمیر میں ہائر سکنڈری درجوں میں پڑھائی جارہی ہے۔ انھیں ترجمے پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ والڈن کا ترجمہ بہت مدت ہوئی، کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ یادگاری لیکچر بعنوان One World and India جو شہرہ آفاق مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی نے ۱۹۶۰ء میں دیے تھے، ان کا اردو ترجمہ بھی حیلنی صاحب کا کیا ہوا ہے۔ متعدد مسلمان حضرات نے کشمیر کے موضوع پر ریڈیو سے اردو میں تقریریں نشر کی تھیں؛ ان کا انگریزی ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے۔

آخری دو تین سال بستر علالت پر گزرے۔ دل کے مریض تھے۔ اسی حالت میں، ۲ ستمبر ۱۹۶۹ء صبح ساڑھے آٹھ بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور کربلائے ملکہ جہاں، لکھنؤ میں آخری خوابگاہ نصیب ہوئی۔ ان کی وفات سے اردو نے ایک صاحب نظر مصنّف کھویا، اور میں نے ایک بزرگ مہربان اور دوست۔ ان کی محبت یاد آتی ہے، تو دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ افسانوں کے مجموعے : رفیق تنہائی، آئی سی ایس، کچھ ہنسی نہیں، باسی پھول، سیلہ گھومنی، ہمارا گاؤں، کانٹوں میں پھول، ایک عورت ہزار جلوے۔

۲۔ ناول:

سر سیّد احمد پاشا، شاید کہ بہار آئی، ندیا کنارے، حکیم بانا، ڈینگوں کا بادشاہ (مضحکات)

۳۔ ڈراما:

نورتن (ایک ایکٹ کے ڈرامے)

امیر خسرو کی کہانی (اردو ہندی)

۴۔ ناول کی تاریخ و تنقید۔

۵۔ ہندی:

پھولوں کی چھڑی، گائے اماں، کومل نگری۔

بہت سی چیزیں نامکمل اور غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ نامکمل میں دو ناول ہیں، اور مکمل لیکن غیر مطبوعہ میں، ہماری اردو شاعری، راج ہٹ، اور تقریباً ۲۵ فلمی کہانیاں۔

آربری، آرتھر جان (پروفیسر)

ماہرینِ علومِ شرقیہ کے حلقے میں عموماً اور فارسی اور عربی کی دنیا میں خصوصاً پروفیسر آربری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پچھلے ۳۰-۳۵ سال میں انھوں نے تصنیف و تالیف ترجمہ و تحشیہ کے میدان میں جو قابلِ تعریف اور مستقل کارنامے سرانجام دیے، ان کی بدولت انھوں نے عالمی شہرت حاصل کرلی تھی۔ افسوس کہ ان کا ۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو کیمبرج میں انتقال ہوگیا۔

پروفیسر آربری کے والد ولیم آربری برطانوی بحریہ میں ملازم تھے۔ پروفیسر آربری ۱۲ مئی ۱۹۰۵ء کو پورٹس ماؤتھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم وہاں مقامی گرامر اسکول میں ہوئی، جو السنۂ قدیمہ (کلاسیکی) کی تدریس کے سلسلے میں خاص طور پر مشہور ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے پیمبروک کالج، کیمبرج میں داخلہ لیا۔ یہاں اپنی محنت اور قابلیت سے انھوں نے متعدد وظیفے اور تمغے حاصل کیے۔ وہ السنۂ قدیمہ اور السنۂ شرقیہ دونوں امتحانوں میں اوّل آئے، جس کے جلد ہی بعد انھیں ولیم براؤن

تمغہ اور ایڈورڈ جارج براؤن وظیفہ اور رائٹ وظیفہ عطا ہوئے۔ اب ہر ایک کی نظر ان پر تھی۔ مبصرین کے دل میں جائز طور پر توقع پیدا ہوگئی کہ عربی اور فارسی علوم کے آسمان پر ایک نئے ستارے کا طلوع ہوا ہے اور خوش قسمتی سے آربری نے انھیں مایوس نہیں کیا۔

تعلیم سے فراغت پر او لاً وہ چندے اپنے کالج ہی میں تحقیق کے شعبے سے متعلق رہے، اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں شعبۂ السنۂ قدیمہ کے صدر مقرر ہو گئے۔ یہاں سے جب وہ ۱۹۳۴ء میں انگلستان واپس گئے، تو انڈیا آفس لائبریری میں نائب کتابدار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی، تو ان کا وزارت جنگ کے محکمۂ رقابتہ البرید دستنسر میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ تھوڑے دن کے لیے وزارتِ اطلاعات سے بھی منسلک رہے۔ اگرچہ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن اب اس کے نتیجے سے متعلق کوئی شبہہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے ۱۹۴۴ء میں انھیں جنگی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اس پر وہ دوبارہ تعلیمی میدان میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد موت تک تعلیم و تدریس اور تصنیف و تدوین کا شغل ان کا اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔ پہلے وہ لندن یونیورسٹی میں فارسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور دو سال بعد عربی کے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ اپنے اصلی گھوارۂ علوم کیمبرج پہنچے، عربی کے پروفیسر بن کر۔ یہ وہ کرسی ہے جس پر کسی زمانے میں پروفیسر براؤن (ف ۱۹۲۵ء) متمکن رہے تھے۔ اس لیے علمی دنیا میں اس عہدے کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ آربری کو ان کی جانشینی کا فخر حاصل ہوا اور انھوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا۔

آربری کے تصنیفی کارناموں کا جائزہ لینا آسان نہیں ہے۔ ان کی پہلی کتاب لیلیٰ مجنوں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دوران جنگ کے صرف ایک سال ۱۹۴۱ء کو چھوڑ کر

۱۹۶۸ء تک کوئی سال خالی نہیں گیا، جب ان کی کوئی نہ کوئی کتاب شائع نہ ہوئی ہو۔ بعض سالوں میں تو دو دو تین تین کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اکسٹھ (۶۱) کتابیں میرے علم میں ہیں، اور ممکن ہے کہ بعض تک میری رسائی نہ ہوئی ہو۔ انھوں نے انڈیا آفس، کیمبرج یونیورسٹی، چیسٹر بیٹی کتابخانوں کی فارسی اور عربی کتابوں کی فہرستیں مرتب کیں، جو شائع ہو چکی ہیں۔ ان سے ان کی وسعتِ معلومات اور دقیقہ سنجی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے شائع کیے، کئی کتابوں کو حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ انھیں تصوف سے بہت شغف تھا اور اسی سے انھیں قرآن کے مطالعے کا بھی خاص شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا، جو ہر لحاظ سے بلند پایہ تراجم میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اقبال کی دو کتابوں ـــــ زبورِ عجم اور رموزِ بیخودی کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ پیامِ مشرق میں سے لالۂ طور کا اور بانگِ درا میں سے "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کا ترجمہ بھی کیا۔ اسرارِ خودی پر مفصل حواشی بھی قلمبند کیے تھے۔

بسیار گو اور زود نویس مصنفین کا تمام کام ایک معیار اور پائے کا نہیں ہوا کرتا۔ عجلت کی وجہ سے وہ اس کی نوک پلک درست کرنے کے لیے وقت صرف نہیں کر سکتے، جس سے ان کی تحریروں میں رطب کے ساتھ یابس کا بھی اچھا خاصا حصہ داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے تعجب ہوتا ہے کہ اتنے کثیر التصانیف ہونے کے باوجود آربری نے کہیں معیار کو گرنے نہیں دیا۔ میری ان سے پچھلے دس بارہ برس سے خط و کتابت تھی، لیکن پہلی ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی، جب میں بلجیم میں مقیم تھا۔ رفتہ رفتہ تعلقات میں استواری اور وسعت اور قربت پیدا ہوتی گئی۔ انھوں نے میری فرمائش پر نذرِ عرشی اور نذرِ ذاکر کے لیے مضامین قلمبند کیے، جو ان کتابوں میں شامل ہیں۔ نذرِ ذاکر کی ترتیب کے زمانے میں ان کی تندرستی بہت خراب تھی اور اطبانے کام کاج سے منع کر رکھا تھا۔ اس کے

باوجود انھوں نے میری درخواست پر انکار نہ کیا اور ایک مختصر مضمون بھیج دیا۔ میں گزشتہ جون میں لندن گیا تھا۔ قدرتاً ان سے ملنے کی تمنا تھی۔ لہٰذا ان سے وقت مقرر کرنے کے لیے میں نے کیمبرج ٹیلیفون کیا، تو ان کی بیگم (لیسنا) نے بتایا کہ ان کی طبیعت بہت علیل ہے، ڈاکٹروں نے کسی سے ملنے جلنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ لیکن آپ اتنی دور سے اور اتنی مدت کے بعد آئے ہیں، چاہیں تو آجایئے۔ ایسے میں مجھے انھیں زحمت دینے میں تکلف محسوس ہوا۔ میں نے کہا، نہیں، میں ابھی چند دن اور یہاں ہوں، پھر کسی دن، جب ان کی طبیعت بہتر ہوگی، حاضرِ خدمت ہو جاؤنگا۔ چار پانچ دن بعد پھر معلوم کیا، تو انھوں نے بتایا کہ ہنوز ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی اور ڈاکٹروں کی پابندی بھی بدستور قائم ہے۔ غرض ان سے ملاقات کی فرصت نہ مل سکی اور میں واپس چلا آیا۔ اب جو اطلاع ملی، کہ ان کا انتقال ہو گیا، تو بےحد قلق ہوا۔ ان کی عزلت گزینی، انکسار، لطف و کرم، عالمانہ گفتگو ___ غرض ایک ایک بات رہ رہ کے یاد آتی ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے۔

اولادِ جسمانی میں ایک بیٹی 'انا' ہے؛ وہ اپنے گھر بار والی ہیں۔

محمد اجمل خان

اصل میں ایک افغان خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کا پیشہ سپاہگری اور کشاورزی تھا
ان کے والد کا نام اسماعیل خان تھا۔ محمد اجمل خان صاحب کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء
کے ہنگامے میں حصہ لیا تھا، جس کی پاداش میں وہ انگریز کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے۔
محمد اجمل خان ۲ فروری ۱۸۹۷ء کو یوپی کے قصبے گوتنی (ضلع پرتاب گڑھ) میں پیدا
ہوئے۔ ایم اے اور ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک دو ڈھائی
سال الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے شعبے میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی لیے
کبھی کبھی بعض لوگ ان کے نام کے ساتھ "پروفیسر" کا لفظ لکھتے تھے۔ اس کے بعد چند دنے
وکالت بھی کی، لیکن یہاں وہ جم نہ سکے۔ ۱۹۳۵ء میں ٹیگور کی یونیورسٹی میں ریسرچ
اسکالر کی حیثیت سے کلکتے چلے گئے۔ دو سال بعد ۱۹۳۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد
مرحوم نے انھیں اپنا سکریٹری مقرر کیا اور پھر ان کی وفات تک وہ اسی حیثیت سے ان سے
وابستہ رہے۔

عربی زبان پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ مطالعۂ قرآن سے بہت شغف تھا اور ترتیبِ قرآن حسبِ نزولِ قرآن، ان کا خاص موضوع۔ چنانچہ انھوں نے حضرت رسول کریم صلعم کی سوانحِ عمری قرآنی پس منظر اور وحی کی ترتیبِ زمانی کے تطابق سے مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کا مختصر انگریزی ترجمہ بھی چھپا تھا۔ دوسرے مذاہب سے بھی دلچسپی تھی، گیتا اور رجب جی کے ترجمے اس کے گواہ ہیں۔ اور بھی چند چھوٹے چھوٹے رسالے ان سے یادگار رہیں۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ایک لغت تھی، گیارہ حصّوں میں، اسے وزارتِ تعلیم نے طبع کروایا تھا۔ لیکن خدا معلوم شائع کیوں نہ ہوئی اور یہ بھی کچھ پتہ نہ چلا کہ اس کا حشر کیا ہوا۔ اس میں سرکاری استعمال کے اردو ہندی کے مرادفات دیے تھے۔ بڑے کام کی چیز تھی۔

میری ان سے ۱۹۳۹ء سے ملاقات تھی، آخری ان کے انتقال سے کوئی دس بارہ دن قبل ہوئی۔ ان کے سوچنے کا انداز چونکانے والا تھا، انھیں کبھی بڑی سے بڑی مسلّمہ روایت کے خلاف رائے کا اظہار کر دینے میں کبھی باک نہیں ہوا۔ پھر لوگ جتنا اس پر بدکتے، وہ اس سے لطف لیتے ہوئے اور چھیڑتے۔ اس کے باوجود میں نے انھیں کبھی مذہب کی حمایت اور اخلاق کے احترام میں کسی سے کم نہیں پایا۔

مولانا آزاد کی وفات (۱۹۵۸ء) کے بعد انھیں راجیہ سبھا کا رکن نامزد کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی رحلت تک یہاں رہے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء صبح ولنگڈن اسپتال، نئی دلی میں انتقال ہوا اور اسی دن سہ پہر کو اپنی وصیت کے مطابق بستی نظام الدین (غربی) میں احاطۂ خاندان خواجہ حسن نظامی میں دفن ہوئے۔ یغفرہ اللہ۔

رئیس احمد جعفری

ان کا وطن سیتا پور تھا اور ان کے خاندان کا وہاں کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ ننھیال اسی ضلع میں خیر آباد کا مردم خیز قصبہ تھا۔ ان کے نانا نیاز احمد صاحب مشہور شاعر ریاض خیرآبادی (ف ۱۹۳۴ء) کے چھوٹے بھائی تھے۔ (یہ تین بھائی تھے، ریاض احمد، نیاز احمد، فیاض احمد۔ اپنے والد سید طفیل احمد کی طرح یہ تینوں بھائی بھی پولیس میں ملازم ہوئے۔ ریاض تو یہ کھڑاگ زیادہ دن نہ نباہ سکے اور مستعفی ہو گئے۔ البتہ دوسرے دونوں بھائی آخر تک ملازم سرکار رہے۔ سید نیاز احمد (رئیس احمد کے نانا) مدتوں بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے پر فائز تھے۔ اور وہیں ملازمت سے سبکدوش ہو کر مدتوں مقیم بھی رہے۔ رئیس احمد جعفری کے والد کا نام ناظر حسین تھا۔ رئیس احمد ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ (ایک جگہ تاریخ ولادت ۱۹۱۲ء بھی لکھی ملتی ہے، جو ٹھیک نہیں ہے)۔ ناظر حسین کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا جب رئیس احمد ابھی بہت کمسن تھے، اس لیے ان کی پرورش اور تربیت اپنی ننھیال (خیر آباد) میں ریاض کی سرپرستی میں ہوئی۔

سید ناظر حسین کی جوانا مرگی کے باعث جاداد کی مناسب دیکھ بھال نہ ہو سکی اور کاروبارِ زندگی

کی خورد برد کے باعث تباہ ہوگئی۔ اس کا اثر رئیس احمد اور ان کے بڑے بھائی عقیل احمد صاحب کی تعلیم پر پڑا۔ عقیل احمد تو آٹھویں درجہ سے آگے نہ بڑھ سکے، البتہ رئیس احمد نے زورِ بازو سے بہت کچھ پیدا کر لیا۔ انھیں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیجا گیا، جس کا ان ایام میں ترقی پسند حلقوں میں شہرہ تھا۔ یہ غالباً ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔

چونکہ ان کی پرورش علمی و ادبی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے شروع سے مطالعے کا شوق تھا۔ اس زمانے میں دار العلوم ندوہ میں ایک انجمن "الاصلاح" تھی۔ یہ اس کے دار المطالعہ میں جانے لگے اور یہاں کے رسائل و جرائد کے مطالعہ سے انھوں نے اپنی استعداد میں خاصہ اضافہ کیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ خود انجمن کے رکن بن گئے اور ایک دستی قلمی رسالہ بھی جاری کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ انجمن کے نائب ناظم اور ۱۹۳۰ء میں ناظم منتخب ہوئے۔ ان کے دورِ نظامت میں انجمن نے بہت ترقی کی۔

اپنی قابلیت اور محنت کی عادت کے باعث وہ اساتذہ کے بہت چہیتے تھے خصوصاً شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی (ف ۱۹۶۲ء) شاگردِ شیخ حسن بن محسن یمانی و خلیفۂ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی انھیں بہت چاہتے تھے۔ اپنے قیامِ ندوہ کے زمانے میں انھوں نے جن اساتذہ سے پڑھا، ان میں مولانا حفیظ اللہ (شاگرد مولانا عبد الحی فرنگی محلی) مولانا عبد الحلیم صدیقی، مولانا عبد الرحمٰن نگرامی (ف ۱۹۲۶ء) مولانا عبد الودود حیراجپوری، مولانا سید علی زینبی، مولانا شبلی فقیہ اول کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ صرف و نحو میں مولانا کلیم احمد بہرائچی اور مولانا محمد سلیم گنگوہی ان کے استاد تھے۔

۱۹۳۰ء میں دار العلوم ندوہ کے طلبہ میں ایک سخت احتجاجی تحریک پیدا ہوئی تھی، طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ بعد کو چند طلبہ کو مدرسے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ رئیس احمد بھی ان سزا یافتوں میں تھے۔ چونکہ اب ان کا ندوہ میں تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں تھا، انھوں نے جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، دہلی میں داخلہ لے لیا۔ وہ جامعہ میں تین برس (۱۹۳۰-۱۹۳۳ء) رہے۔ اس زمانے

میں انھوں نے انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اس دور کے جملہ اساتذۂ کرام سے انھوں نے پڑھا اور استفادہ کیا۔

مضمون نویسی تو وہ "الاصلاح" کے زمانے سے کر رہے تھے، یہاں رسالۂ جامعہ کی موجودگی نے گویا مہمیز کا کام دیا۔ انھوں نے اس کے لیے متعدد علمی مضامین لکھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے بعض عربی چیزوں کا ترجمہ بھی کیا مثلاً منفلوطی کا افسانہ الی اکواخ الفقراء، مرحوم نے اس کا عنوان 'غریب خانہ تک' رکھا تھا۔ یہ ترجمے کا شوق اور تجربہ بعد کو ان کے بہت کام آیا۔

۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی نے لندن میں انتقال کیا، تو حامد علی خان مینجر مکتبۂ جامعہ (ف دسمبر ۱۹۶۳ء) نے ان کی سوانحعمری لکھوانے اور شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی نظر انتخاب نوجوان رئیس احمد پر پڑی، جو ان کی مردم شناسی کی روشن دلیل ہے۔ رئیس احمد کو مولانا محمد علی سے غیر معمولی عقیدت تھی، انھوں نے اپنی جوانعمری اور ناتجربہ کاری کے باوجود یہ کتاب ایسی محنت سے قلمبند کی کہ صحیح معنوں میں آج تک بھی محمد علی مرحوم کی کوئی سیرت اس سے بہتر تو درکنار، اس کے برابر بھی نہیں لکھی گئی۔ یہی کتاب ان کے مرکزی خلافت کمیٹی کے روزنامے خلافت (بمبئی) کے ایڈیٹر بننے کا باعث بن گئی۔

اس زمانے میں خلافت ہاؤس اور خلافت اخبار بلکہ آل انڈیا خلافت کمیٹی عبارت تھی، مولانا شوکت علی سے۔ اس کی بہار اور شباب کب کا رخصت ہو چکا تھا، لیکن مولانا شوکت علی اسے سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ آمدنی کم، چندہ ندارد اور خرچ بدستور۔ ملازموں کی تنخواہیں چڑھنے لگیں اور قرضخواہوں کے تقاضے بڑھنے لگے۔ اخبار کی اشاعت بیقاعدہ ہوگئی اور غیر مطمئن ایڈیٹر اور کارکن آہستہ آہستہ باری باری کنارہ کرنے لگے۔ آخری ایڈیٹر جو یہاں سے گئے، وہ احسن مرادآبادی تھے۔ جب تک کوئی ڈھنگ کا آدمی نہ ملے مولانا شوکت علی اسے جاری رکھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ ایک نئے ایڈیٹر کی تلاش میں تھے کہ

کسی نے انھیں سیرت محمد علی کے مصنف رئیس احمد جعفری کا پتہ دیا۔ شروع میں رئیس احمد نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن بالآخر وہ بمبئی پہنچ گئے۔ یہ جون ۱۹۳۳ء کی بات ہے، جب ان کی عمر بمشکل ۲۶ برس کی رہی ہو گی۔

جب وہ خود یہاں جم گئے، تو انھوں نے اپنے بعض قدیم دوستوں کو بھی بمبئی بلا لیا۔ ان میں مولانا عبد السلام قدوائی (حال شیخ التفسیر جامعۂ ملیہ اسلامیہ، دلّی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نائب مدیر مقرر ہوئے تھے۔ غرض بتدریج انھوں نے نہ صرف اخبار کا عملہ مضبوط کیا، بلکہ خلافت کو از سرِ نو صاحبِ اثر روزنامہ بنا دیا۔ لیکن یہ پرچہ مسلسل نقصان میں جا رہا تھا۔ انجام کار مولانا شوکت علی نے فیصلہ کر لیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ جعفری صاحب نے ان سے کہا کہ اگر آپ اخبار اور مطبع کا انتظامی شعبہ بھی کلیتہً میرے سپرد کر دیں، تو میں اس کا جمع و خرچ برابر کر دینے کا ذمہ لیتا ہوں۔ مولانا شوکت علی نے بغرضِ تجربہ یہ چیلنج قبول کر لیا اور جعفری صاحب نے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کر دکھایا۔ پرچہ نہ صرف اپنا خرچ پورا کرنے لگا، بلکہ اس سے منافع ہونے لگا۔

مولانا شوکت علی کے انتقال (نومبر ۱۹۳۸ء) تک جعفری صاحب خلافت سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ اس سے الگ ہو گئے اور اپنا ہفتہ وار پرچہ 'جوہر' جاری کر دیا۔ اس نے بہت کم عمر پائی؛ غالباً آٹھ شمارے نکلے تھے لیکن اس دوران میں انھوں نے متعدد کتابیں، ناول وغیرہ لکھے اور یوں ان کا نام ایک کامیاب صحافی اور مصنّف کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

وہ شروع سے مولانا محمد علی سے بہت متاثر، بلکہ مرعوب تھے۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، اور خلافت کی ادارت کے زمانے میں تو وہ خلافت کے داعی اور کانگریس کی مخالف سیاست کے گویا نفسِ ناطقہ بن گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ملک تقسیم ہوا، تو وہ بھی پاکستان چلے گئے۔ یہاں پرانی ادبی ساکھ ان کے بہت کام آئی۔

کراچی سے انھوں نے ایک روزنامہ خورشید اور ادبی ماہنامہ ریاض جاری کیے لیکن مالی مشکلات کے طفیل انھیں بند کرنا پڑا۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور نے جس کے صدر پہلے خلیفہ عبدالحکیم تھے اور ان کی وفات (۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء) کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مقرر ہوئے، انھیں لاہور طلب کیا اور وہ اس سے وابستہ ہو گئے۔

وہ زود نویس اور بسیار نویس تھے۔ بلکہ عام اطلاع یہ ہے کہ چند اصحاب ان کے ہاں ملازم تھے۔ جب کسی عربی فارسی کتاب کا ترجمہ مطلوب ہوتا، اس کے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ صفحات ان میں تقسیم کر دیتے! یوں بڑی سے بڑی کتاب کا ترجمہ دس پندرہ دن میں مکمل ہو جاتا۔ پھر وہ اسے ایک نظر دیکھ کر کاتبوں کے حوالے کر دیتے اور مہینے بھر میں کتاب شائع ہو جاتی۔ بلا مبالغہ ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سینکڑوں سے کم نہیں ہوگی، اور بعض ان میں سے اچھی خاصی ضخیم ہیں۔ پھر ان کے موضوعات بھی بحید متنوع ہیں: ناول، افسانہ، علم و ادب، سیاست و معیشت، سیرت و سوانح، تاریخ و تذکرہ، حدیث و فقہ غرض تراجم و تالیفات کا ایک انبار ان سے یادگار رہے۔

ظاہر ہے کہ اتنی محنتِ شاقہ اور تگ و دو میں صحت کب تک ساتھ دیتی! تندرستی خراب ہو گئی اور بہت بیمار رہنے لگے۔ لاہور میں وہ اکیلے رہتے تھے، بیوی بچے کراچی میں تھے۔ یہاں دو مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ اس سے کچھ احتیاط برتنے لگے تھے، لیکن مدتوں کی بگڑی ہوئی صحت کیسے بحال ہو جاتی!

کراچی جانے کے لیے ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن گئے۔ یہیں دل کا دورہ پڑا اور آناً فاناً جاں بحق ہو گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

واقف مرادآبادی، سید یعقوب الحسن

۲۶ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو سنبھل میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ طبیعت میں مزاح کا مادہ تھا اور پڑھنے کا انداز بہت ڈرامائی اور بے ساختہ! اور اسی پہلو سے ان کی شہرت تھی، اسی باعث فلم والوں کی نظر بھی ان پر پڑی۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں یہ فلموں کے گانے اور گیت اور مکالمے لکھنے کے سلسلے میں بمبئی پہنچے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی بہت دن پریشان اور بیکار رہے۔ ۱۹۵۷ء میں بعض دوستوں کی مدد سے کیمپ کالج اور دیال سنگھ کالج، دلّی میں اردو پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ ابھی چند برس ہوئے، وہاں سے الگ ہوئے تو اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ان کا پانچ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ تحقیق مقرر کر دیا تھا۔

بہت دن سے بیمار تھے، غالباً کینسر کی شکایت تھی۔ یہ موذی مرض لاعلاج ہے۔ اسی میں ۱۵/۱۶ دسمبر ۱۹۶۹ء کی درمیانی شب میں انتقال ہوا، اور ۱۶ دسمبر کو کوٹلہ فیروزشاہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں رباعیات عمر خیام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا؛ یہ چھپ چکا ہے۔

اور کلام بھی مقدار میں بہت ہوگا، جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔
نمونۂ کلام میں دو نظمیں ملاحظہ ہوں:

ٹرانزسٹر یا گانوں کا پٹارہ

اس ترقی کے زمانے میں، بڑھیں خوش فعلیاں — لڑکے البیلے بنے ہیں، لڑکیاں البیلیاں

ریڈیو ہر گھر میں، ہے یوں تو مچائے اک وبال — دیدنی ہے آج سڑکوں پر نئی اک بھیڑ چال

کائناتِ شوق ہے، یا وقت کی سوغات ہے — آج جس رسیا کو دیکھیں، ٹرانزسٹر ساتھ ہے

کیا کوئی سمجھے، جو اس کا فیض بے اندازہ ہے — ہر جواں کا جوشِ افسردہ اسی سے تازہ ہے

عشق کا میٹر ہے یہ، تب تو گلے کا ہار ہے — یہ بتا سکتا ہے، اب وحشت کی کیا رفتار ہے

شانے پر لٹکائے آنکھیں بند، اس کی دُھن میں مست — ہجر میں بھی وصلِ جاناں کا کیے ہے بندوبست

کتنے موسیقاروں کا ہے اتنے سے ڈبے میں گھر — گیتا دت، شمشاد، آشا اور لتا منگیشکر

بند ہیں اس میں رفیع و زہرہ و طلعت، مکیش — ہیں ثریا، نور، شمیم اور اقبال، و سریش

چلتے پھرتے سنتے رہیے، طبلہ، سارنگی، ستار — وائلن، مردنگ، شہنائی، کلارنٹ، گٹار

ڈھولکی، نوبت، نگاڑا، بانسری اور جلترنگ — ڈھولا، نوٹنکی، دکجری، آلہا اور اودل کے رنگ

دادرا، ٹھمری، غزل، ہنگامۂ شعر و سخن — گیت اور ڈرامہ، ترانہ، دوہے، میرا کے بھجن

قرأتِ قرآن، رامائن بھی اور قوالیاں — لہرائیں، ناچ کی گت، گھونگرو اور تالیاں

اس سے ہلکا پڑ گیا ہے ہجر کا کالا بخار — ہے اسی ڈبے میں اب آواز اور تصویرِ یار

یار کی آواز میں جلوہ نمائی دیکھ لی — اک ذرا کھٹکا دیا، گردن جھکائی دیکھ لی

زن سے نکلی سائیکل، گاتی بجاتی شان سے — چونک اٹھے راہگیر اک دم اس اچانک تان سے

کاش اپنے ہوش میں ہوں، سر پھرے یہ نوجواں — دیکھ لیں موقع محل، گانا ہے کیسا، ہیں کہاں

اک بڑی بی جا رہی تھیں، جھک چکی جن کی کمر — اور ادھر چالو ہے گانا، آج کے تیج رنگ پہ

"یار تم ہم کو بنا لو، پھر مزہ ہے پیار کا" — دیکھا منہ بڑھیا نے پھر کر عشق کے بیمار کا
آگئی اُن کو ہنسی، بلبلی وہ خواری کے لیے — کیا نہیں ہے تیری میّا، گھر میں یاری کے لیے
اپنی نانی سے کرے یاری، تو ہو گا دل بھی شاد — واہ رے بے شرم لونڈے، لچّے، شہدے، نامراد
گھر سے کیوں نکلا ہے باہر لے کے بھینا کا فراق — ہیں تری دادی کی عمروں کی ہوں، مجھ سے بھی مذاق!
ساتھ میّت کے ادھر چیخیں کسی غمناک کی — ہمنوا اس کی ادھر گت، دھن دھنا دھن تاک کی
پھر صدا آئی کہ منہ مت بزدلی سے موڑنا — ساتھیو سرحد پہ سر کر، ساتھ تم مت چھوڑنا
راجہ نامی پہلوان، ون وے ٹرانک، کانٹین — سن کے ٹھٹکا، "ادھے راجہ کیا کٹیلے تو رے نین"
بے تحاشا پہلواں نے مڑ کے گردن داب لی — اور پھر ان کو ٹھکا ڈالے، کرارے کابلی
طالبہ کا پیچھا کر کے پھٹ پڑیں رسوائیاں — پیار کی بجنے لگیں بازار میں شہنائیاں
جا رہی ہے ساتھ دلھن کو لیے کوئی برات — اور ادھر نغمہ سرا سائیکل پہ کوئی ساتھ ساتھ

"خاک ڈالو اس خوشی پر جب کہ جی گھبرا رہا
دھوم سے دیکھو محبت کا جنازہ جا رہا"

مستقبل کی تعلیم و تعلیم گاہیں

اس ترقی کے زمانے کی جو کچھ رفتار ہے — وہ بتاتی ہے کہ اب کلچر کا بیڑہ پار ہے
آج کی تعلیم گاہیں، ہوں گی مستقبل پہ بار — آتی جنریشن تک آ جائیگی اک تازہ بہار
ہو گی اپنے دیش میں تعلیم کی دنیا بحال — حسبِ اندازہ ہے، ڈیٹنگ پیریڈ، پچیس سال
سنسکرتی دیش کی پھر جی اٹھیگی ایک بار — شوق سے ڈالے گلے میں، ویسٹ کے کلچر کا ہار
اک انوکھے ڈھنگ پر بدلیگا تعلیمی نظام — آئینے تہذیبِ نو کے، کالجوں کے صبح و شام
کورس سے خارج وہ سب بیکار جو سبجیکٹ ہوں — ماڈرن کلچر میں اسٹوڈنٹ سب پرفیکٹ ہوں
ہسٹری یا تھیالوجی، سائنس، کامرس و حساب — جاگرفی، انجینئرنگ اور بیالوجی، دور از نصاب

ڈانس، میوزک، ایکٹنگ، سنگنگ، سوئمنگ، نرسری
گیمس اور گانے میں ماہر ہونگے سارے لیکچرر
ہونگے ٹیچر، جیسے دارا سنگھ اور طلعت، مکیش

پیریڈ پہلا، یہ ورزش اور ریسلنگ کے لیے
لڑکیوں، لڑکوں کی کشتی، مگدر اور جمناسٹک

دوسرا گھنٹہ بجے، پانی میں والی بال ہو
تیسرے گھنٹے میں میوزک، سانگس اور آرکسٹرا

ہوگا چوتھے پیریڈ میں ڈانس بھی کمپلسری
پانچویں گھنٹے میں فلمی ایکٹنگ کے سب مزے

پھر چھٹے گھنٹے میں سوشل اسٹڈی کا خاص کورس
کیا فریڈم کے ہیں معنی، وہ بتائے جائینگے

ہر طرح آزاد سب ہوں، خود چنیں اپنے پیئر
پا سکینگے دیش میں، کوئی نہ سائن آف پاسٹ

آخری گھنٹہ فقط تعلیم کا رہ جائیگا
کارلائل، شیکسپیر، رینالڈ و ملٹن کا کلام

ایسٹ کے کلچر کا نمبر بھی نہ ہوگا پاس کا
ذہنیت پھر سیکس کی بدلے وہ ہوگا کایا پلٹ

لڑکیاں لڑکوں کو چھیڑینگی تو وہ شرمائینگے
ان میں کچھ جیدار اگر ہونگے تو وہ ڈٹ جائینگے

دیکھیے مس صاحبہ! ہم کو ہنسی ایسی ہے شاق
گر کسی نے دیکھ پایا، آپ کا کیا جائیگا

گیمس، رننگ، باکسنگ اور رائڈنگ کمپلسری
ہر پروفیسر بھی ہوگا ڈانس ڈگری ہولڈر

مینو، آشا بھوسلے، موتی، اُدے شنکر، نرگس
جس میں ہوگی دوڑ، پوری چھوٹ مسلنگ کے لیے

بیٹھکیں، ڈنڈ پیلنا، خوش فعلیاں، گتا شنک
چل کبڈی، دے چھپا چھپ، ہر طرف تراق ہو

کمپٹیشن ساز و گانے میں، یہ پریاں، وہ پری
پھر انوکھے ڈھنگ سے تہذیب کی ہو سرجری

ہیرو، ہیروئن، ولن اور ومیپ کے سب مشغلے
ماڈرن کلچر کے اپنانے پہ ہوگا بارڈ فورس

گر جو آزادی کے ہیں سارے سکھائے جائینگے
منگنی، ٹیکہ، بیاہ کے سارے جھمیلے طاق پر

مین کلچر، نو ریلیجن، نو کوئسچن آف کاسٹ
یوں نظامِ نو، سہولت کے موافق آئیگا

سب بھلا دیگا وہ کالی داس اور غالب کے نام
پھر تو دنیائے محبت میں، مزہ رومانس کا

آئے دن لڑکوں سے ہوگی لڑکیوں کی جھٹ پٹی
گر ہوئے عاجز تو تھانے میں رپٹ لکھوائینگے

اور نہایت ہی ادب سے جھینپ کر فرمائینگے
گھر میں اپنے بھائی سے فرمائیے ایسا مذاق

ہوگی بدنامی ہماری، ہر کوئی شرمائیگا

ہم کو آوارہ سمجھ کر آپ کرتی ہیں خفیف
ہم بھی باعزّت ہیں، جی ہاں اور گھرانے کے شریف

اب کچھ خیّام کی رباعیوں کے ترجمے کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ مقابلے کی سہولت کے لیے خیّام کی اصلی رباعیاں بھی دے رہا ہوں

دی کوزہ گرے بدیدم اندر بازار
بر پارۂ گلے لگد ہمی زد بسیار
واں گل بزبانِ حال باُو می گفت
من ہمچو تو بودہ ام، مرا نیکو دار

کل دیکھتا رہا میں حسین ایک کوزہ گر
مٹی کو منتشر رہا تھا جو لاتوں سے کھوند کر
مٹی زبانِ حال سے گویا یہ کہتی تھی
کچھ گلرخوں کی خاک ہے مجھ میں بھی، بیخبر!

تا بود دلم زعشق محروم نشد
کم بود ز اسرار کہ معلوم نشد
اکنوں کہ ہمی بنگرم، از روئے خرد
معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد

کہنے کو میں تحقیق سے محروم نہیں
اک نکتۂ اسرار بھی معدوم نہیں
از روئے خرد اب جو یہ سب دیکھتا ہوں
معلوم ہوا، خاک بھی معلوم نہیں

گر من زمے مغانہ مستم، ہستم
ور کافر و گبر و بت پرستم، ہستم
ہر طائفہ بمن گمانے دارد
من زاں خودم چنانکہ ہستم، ہستم

بدمست شرابی ہوں، دیوانہ کہ سودائی
کافر ہوں کہ مشرک ہوں، موسائی کہ عیسائی
کیا میری بداعمالی پٹیگی زمانے کو
لاکھوں مرے مذہب ہیں، مسلک مرا ہرجائی

گر بادہ خوری تو، با خردمنداں خور
یا با صنمے سادہ رخ و خنداں خور
بسیار مخور، وردمکن، فاش مساز
اندک خور و گہ گہ خور و پنہاں خور

جو مے کا شوق ہے، پی جا کے ذی شعوروں میں
گلوں کی چھاؤں میں، یا ناشگفتہ حوروں میں
نہ ڈگڈگا کے، جو عادت پڑے بھرم جائے
چھپا کے تھوڑی سی، وہ بھی نہ جی حضوروں میں

گر مے نخوری، طعنہ مزن مستاں را
گر دست دہد، توبہ کنم یزداں را
تو فخر بدیں کنی کہ من مے نخورم
صد کار کنی کہ مے غلام است آں را

ہے فخر اسی پر کہ تو مے خوار نہیں
رندوں کی بھی توبہ کوئی دشوار نہیں
اعمال وہ بد تیرے ہیں کہ شر ہے شراب
صد شکر کہ ہم رند ریا کار نہیں

پیرے دیدم بخانۂ خمّارے
گفتم نکنی ز رفتگاں اخبارے
گفتا: مے خور کہ ہمچو من بسیارے
رفتند و کسے باز نیامد بارے

میں نے اک بوڑھے کو میخانے میں دیکھا، تو کہا
واہ کیا کہنا، یہ سن آپ کا، یہ ریش و قبا!
بولا نادان! غنیمت ہے یہ مہلت، پی لے.
پھر کوئی لوٹ کے آیا ہے، یہاں سے جو گیا؟

زاہد بہ زنے فاحشہ گفتا: مستی
کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت: چنانکہ می نمایم، ہستم
تو نیز چنانکہ می نمائی، ہستی

اک پیر جی نے فاحشہ عورت سے یہ کہا
بیشرم! تجھ کو خوفِ خدا بھی نہیں ذرا!
کی عرض اس نے: جیسی بھی ہوں، ہوں حقیقتاً
فرمائیںگے کچھ اپنے بھی باطن کا ماجرا؟

جامی حیدرآبادی، خورشید احمد

حیدرآباد کے ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کا مسقط الرّاس دراصل پربھنی (مہاراشٹر) تھا، جہاں سے ان کے نانا قاضی صدیق احمد فہیم تخلص نقلِ مکان کرکے حیدرآباد آئے اور یہاں وکیلِ سرکار مقرر ہو گئے۔ جامی کے والد مولوی محمد یعقوب بھی عالمِ دین تھے۔

جامی حیدرآباد میں ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہو گیا! اس کے بعد تعلیم و تربیت اپنی والدہ اور نانی کی نگرانی میں پائی۔ عربی فارسی اور دینیات کی تعلیم گھر پر ہوئی اور بعد کے زمانے (۱۹۳۲ء) میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے منشی فاضل کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ کسب معاش کے لیے چندے محکمۂ آبکاری میں ملازم رہے اور اس میں انسپکٹری کے عہدے تک ترقی کی؛ لیکن جلد ہی دل اُچاٹ ہو گیا اور استعفیٰ دے دیا۔

انھوں نے ۲۲ برس کی عمر یعنی ۱۹۳۷ء میں شعر کہنا شروع کیا، اور اس میں فصاحت

جنگ جلیل مانکپوری سے مشورہ رہا۔ ان کی وفات کے کچھ دن بعد علی اختر حیدرآبادی اور جوش ملیح آبادی سے بھی اصلاح لی۔ وہ شاعری میں اقبال، فراق اور فیض سے بہت متاثر ہوئے۔ جلد جلد ترقی کی منزلیں طے کیں، غزل اور نظم دونوں سے دلچسپی تھی۔ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ان کی متعدد کتابیں چھپیں، جن میں بچوں کے لیے بعض کتابچے بھی ہیں۔ ان کے تین ابتدائی شعری مجموعے، شرارے، نشانِ راہ، منزل کی طرف چھپے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے رنگِ سخن بدلا۔ اس کے بعد دو مجموعے اور شائع ہوئے: رخسارِ سحر یہ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی طرف سے ۱۹۶۴ء میں چھپا؛ اور دوسرا برگ آوارہ ۱۹۶۸ء میں۔ تیسرا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا، لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس سے قبل خود ان کی کتابِ زندگی کا ورق الٹ دیا گیا۔ یہ ان کی وفات کے بعد یاد کی خوشبو کے عنوان سے چھپا (حیدرآباد ۱۹۷۱)

لیکن جتنا کلام شائع ہوا، اس سے کہیں زیادہ انھوں نے دوسروں کی نذر کر دیا۔ ان کی بدولت کئی لوگ صاحبِ دیوان ہو گئے، ان میں سے بعض آج خاصے مشہور شاعر ہیں۔

آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۰ء میں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف انعام سے کیا۔ پارسال اُن کے مداحوں اور قدردانوں نے "جشنِ جامی" منانے کی تیاری شروع کی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'قیمتِ عرضِ ہنر' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

وہ صحیح معنوں میں شاعر اور خادمِ ادب تھے، لیکن نمود و نمائش سے کوسوں دور۔ مدتوں انھوں نے مشاعروں سے کوئی سروکار نہیں رکھا، بلکہ احباب کی نجی مجالس تک میں بھی شعر سنانے کے روادار نہیں تھے۔ ادھر پچھلے دو چار سال سے احباب کے اصرار پر کبھی کبھی مشاعرے میں چلے جاتے، لیکن اس طرح جیسے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہو۔ تاہل کا روگ پالا ہی نہیں ساری عمر تجرد میں گزاری۔

صحت ہمیشہ بالعموم اچھی رہی۔ اگرچہ آخری ایام میں مختلف عوارض کی شکایت کرنے لگے

تھے، اور بد قسمتی سے کوئی آٹھ مہینے ہوئے، کینسر کے موذی مرض کا شکار ہو گئے۔ جب ان کی حالت تشویشناک شکل اختیار کر گئی، تو ۱۸ فروری کو انھیں بغرضِ علاج دواخانۂ عثمانیہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہیں ۸ مارچ ۱۹۷۰ء اتوار شام کے وقت جان جان آفرین کے سپرد کی۔ ہوش و حواس آخر تک درست رہے، بلکہ چند منٹ پہلے تک بات چیت کرتے رہے۔ لاش اسی دن اسپتال سے ان کے مکان (محلہ سلطان پورہ) منتقل کر دی گئی، جہاں سے اگلے دن (۹ مارچ کو) بعدِ عصر جنازہ اٹھا۔ نمازِ جنازہ مسجد کھڑاویں والے شاہ صاحب میں ادا کی گئی اور احاطۂ چیونٹی شاہ کے قبرستان (عثمانپورہ) میں سپردِ خاک ہوئے۔

نورانی بیگم نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

شور ہے ملکِ معنیٰ میں بپا	ہائے، کیا جامی کو ہم نے کھو دیا
سالِ منقوطہ یہ نورانی! لکھو	"حیف کی خورشید احمد نے قضا"

(۱۹۷۰)

جامی کے کلام میں سنجیدہ تفکر ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کے مسائل پر انوکھے انداز میں سوچتے ہیں۔ ان کے ہاں تشبیہ و استعارہ کی تازگی بھی ملتی ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ وہ اس دور کے ممتاز لکھنے والے تھے۔

پہچان بھی سکی نہ مری زندگی مجھے	اتنی روا روی میں کہیں سامنا ہوا
ترے قریب پہنچ کر بھی کم نہیں ہوتے	غمِ حیات نے جو فاصلے بڑھائے ہیں
ہنگامۂ حیات میں، اے شمعِ دلبری!	لمحاتِ دل ملے، تو بہت مختصر ملے
کتنی شبوں کا زہر پیا ہے نگاہ نے	اس انتظار میں کہ نگارِ سحر ملے
حالات خود ہی پاؤں کی زنجیر بن گئے	ورنہ کچھ اتنی دور نہ تھی تیری انجمن
شعورِ غم کے سوا، کچھ نہیں ہے غم کا علاج	مگر یہ بات زمانے کو کون سمجھائے
ناصحو! میرے ساتھ ذرا	تم بھی اس رہگذر تلک آؤ

جلا ہے کس کا لہو، رات بھر چراغوں میں
غرورِ حسنِ سحر اب یہ پوچھتا بھی نہیں

اسی نگاہ نے جینا سکھا دیا مجھ کو
مری حیات کو اب جس کا آسرا بھی نہیں

رہِ حیات میں کتنے ہی پیچ و خم آئے
بچھڑ گیا ہے کوئی، کب، کہاں پتا بھی نہیں

یہ اور بات کہ دل سُن کے ہو گیا انجان
دگرنہ تیری صدا، دور کی صدا بھی نہیں

دیکھا تو لوحِ دل پہ، ترے نام کے سوا
جلتے ہوئے نشانِ ستم اور بھی ملے

کچھ دور، آؤ موت کے ہمراہ بھی چلیں
ممکن ہے، راستے میں کہیں زندگی ملے

جامی! مرے خلوص نے سینے میں رکھ لیے
یارانِ خود فریب سے جو زخم بھی ملے

نیم تاریک سی گلیوں میں کہیں ٹھہرا کر
چھپ گئی گردِ کشاکش میں امیدوں کی سحر

کچھ دیے اور جلاؤں گا سرِ راہِ بہار
میں نے کچھ سوچ کے رکھا ہے قدم کانٹوں پر

وہی راتیں ہیں، وہی زخم، وہی راہگزر
ختم ہوگا کہ نہیں، تیرہ نصیبوں کا سفر

وہ غم، شعورِ غم کی جسے آگ مل گئی
میرا خیال ہے کہ مسیحائے دہر ہے

لرز گیا مری تنہائیوں کے شانے پر
کوئی خیال، کسی دستِ مہرباں کی طرح

اک عمر ساتھ ساتھ مرے زندگی رہی
لیکن کسی بخیل کی دولت بنی رہی

کس سے کرتا، دلِ خوددار غموں کا سودا!
نکہتِ گل بھی نہیں، سایۂ گیسو بھی نہیں

جب بھی ملے وہ مجھ سے، نئے روپ میں ملے
برسوں میں طے ہوئے ہیں تعارف کے مرحلے

غم کی وادی ہے، نہ یادوں کا سلگتا جنگل
ہائے، ایسے میں کہاں چھوڑ گیا ہے کوئی!

اعتبارِ نشاط سے پہلے
غمِ دوراں سے مشورہ کر لوں

لے کے پھرتی ہیں آندھیاں جس کو
زندگی ہے وہ برگِ آوارہ

دل کی راہوں میں کوئی سایۂ لرزاں اب بھی
ساتھ چلتا ہے، کسی جادۂ گردل کی طرح

اس طرح ترے درد کو سینے سے لگایا
جیسے کوئی روٹھے ہوئے ساتھی کو منا لے

کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے صدیوں کا اندھیرا
پھرتے ہیں مہ و مہر کی آغوش کے پالے

امید کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے لگ کر — سو بار جو سوچا ہے، وہی سوچ رہا ہوں

اوراقِ بہاراں کو، پھر اک بار الٹ کر — دیکھو تو سہی، نام ہمارا بھی کہیں ہے

صدیوں سے اسی طرح بھٹکتی ہے خدائی — صدیوں سے اسی طرح خدا عرش نشیں ہے

وقت نے رات کے ہاتھوں کو حِنا رکھا تھا — صبح کے پاؤں میں حالات کی زنجیریں ہیں

آج مقروض وہی دستِ عزیزوں کی طرح — میرے خوابوں سے گریزاں، مری تعبیریں ہیں

جیسے ریشم میں لپیٹے، کوئی انگاروں کو — یوں حقائق کے بدن پر ہیں فسانوں کے لباس

دل میں اس طرح ترا درد ابھر آتا ہے — نرم مٹی پہ کوئی نقشِ کفِ پا جیسے

یوں تو ہر سمت ترے شہر میں ہنگامہ ہے — اور پھر بھی ہے، ہر اک شخص اکیلا جیسے

اس طرح پھانسیوں نے پکارا ہمیں کہ ہم — جیسے کوئی رسول تھے، اہلِ کتاب تھے

ہر اجنبی سے اپنا پتا پوچھتے پھرے — ہم سے جہاں میں اور بھی خانہ خراب تھے

کل ہم وہاں سے آ کے، یہی سوچتے رہے — آخر، ہر ایک چہرے پہ کتنے نقاب تھے

بہت کچھ، جو کتابوں میں نہیں تھا — وہ چہروں کی لکیروں میں پڑھا ہے

زندگی طنز ہے، دشنام ہے، رسوائی ہے — سب تماشا ہے یہاں، کون تماشائی ہے

غم کی قندیل جلاؤ کہ بہت ممکن ہے — کوئی مہمان سرِ شام، مرے گھر آئے

لوگ پھرتے ہیں یہاں حرفِ ملامت کی طرح — زندگانی کا یقیں آئے، تو کیونکر آئے

جس طرف مجمعِ احباب کھڑا تھا، جامی! — ہم پہ آئے تو اسی سمت سے پتھر آئے

اب زندگی کے نام پہ یوں چونکتا ہوں میں — جیسے نیا خیال ہے موضوعِ گفتگو

دبے پڑے ہیں کہیں تیرگی کے مدفن میں — وہ لوگ جن کو ستاروں کا قرب حاصل تھا

بڑے عجیب ہیں یہ دردوغم کے رستے بھی — کہ جس کو دیکھیے، اپنا دکھائی دیتا ہے

زندگانی کو بھٹکتے ہوئے سائے کی طرح — دل کی گلیوں سے کئی بار گزرتے دیکھا

کتنے چہروں پہ غمِ دہر کی تحریر پڑھی — کتنی آنکھوں میں سوالوں کو ابھرتے دیکھا!

ہائے، اک اذنِ تبسّم کے لیے، کلیوں کو
مشورہ تلخیٔ ایام سے کرتے دیکھا

تجھ کو پایا، تو دھڑکتے ہوئے دل میں پایا
تجھ کو دیکھا، تو خیالوں سے گزرتے دیکھا

وقت کی تیزیٔ رفتار کی زد میں، آ کر
ہم نے اک عہدِ روایات کو مرتے دیکھا

احساس کے شعلے، نہ امیدوں کے سمندر
انسان ہیں، یا صرف تراشے ہوئے پتھر

احباب کے خلوص میں شاید کمی ہوئی
دل کے قریب، لوگ بناں بھی نہیں کوئی

حالات کے فریب نے پتھر بنا دیا
اب زندگی تو بارِ گراں بھی نہیں کوئی

اپنے قبضے میں تو زخموں کی بڑی دولت ہے
کیوں نہ پھر وقت کا سب قرض چکایا جائے

دل میں اس طرح ترے درد کو رکھ لیتا ہوں
جیسے گھر میں کسی مجرم کو چھپایا جائے

اب زلفِ عنبریں کی پناہیں نہیں، تو کیا
آوارگانِ غم کے ٹھکانے ہیں اور بھی

جلتا ہے ایک ذہن، مہکتا ہے ایک پھول
روزِ ازل سے، ہے یہی تخلیق کا اصول

دیارِ ہند

دیارِ ہند کی عظمت کا نام زندہ ہے

اُتر گیا ہے، نیا آفتاب سینوں میں
دھڑک رہے ہیں شب و روز کارخانوں کے
اُبھر رہے ہیں، نئے خواب نرم مٹّی سے
چمک رہے ہیں نئے حوصلے کسانوں کے
"چلے چلو" کی صداؤں سے گونجتی ہے فضا
رہِ حیات میں ہیں قافلے جوانوں کے

ہر ایک پھول کی پتی، ہے اب شرر افشاں
ہر ایک شاخ، ہے کھنچی ہوئی کماں کی طرح
نئی اُمنگ، نئے جوش کا تقاضہ ہے
عدو پہ ٹوٹ پڑو، مرگِ ناگہاں کی طرح
فریب کار اندھیروں کے فرق پر چمکو
بہ نامِ حسنِ سحر تیغِ بے اماں کی طرح

چلے چلو کہ ابھی سرحدیں ہیں خطرے میں
لپک رہے ہیں جہنم کے چیختے سایے
چلے چلو کہ گلستانِ امن و آزادی
تمھاری جرأتِ بیباک سے نکھر جائے
نظر میں آگ، ارادوں میں بجلیاں لے کر
چلے چلو کہ ہر اک فاصلہ سمٹ آئے
دیارِ ہند کی عظمت کا نام زندہ ہے

عبدالشکور (پروفیسر)

ان کے والد عبداللطیف صاحب سرکارِ انگریزی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ڈپٹی کلکٹری تک ترقی پائی اور پنشن کے بعد اپنی وفات (۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء) تک بریلی میں مقیم رہے۔ پروفیسر عبدالشکور مرحوم یہیں بریلی میں ۳ جولائی ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک انھوں نے تعلیم بھی بریلی ہی میں پائی۔ اس کے بعد ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور یہاں سے یکے بعد دیگرے ایم اے (انگریزی) اور بی ٹی کی اسناد حاصل کیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے ملازمت کا آغاز علی گڑھ ہی سے کیا۔ یہاں وہ انگریزی کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں انھیں جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن سے دعوت ملی اور وہ علی گڈھ چھوڑ کر وہاں چلے گئے۔ یہاں ۱۹۳۳ء تک ڈربن کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ اس سال واپس وطن آئے، تو بریلی کالج میں جگہ مل گئی، اس کالج میں وہ ۱۹۴۱ء تک رہے اور اسی سال یہاں سے حلیم کالج کے پرنسپل ہو کر کانپور منتقل ہو گئے۔ حسنِ اتفاق سے انھیں یہاں ترقی کا موقع میسّر آگیا؛ اور رضا کالج رامپور کی پرنسپلی کی پیشکش ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے کانپور سے رام پور کی راہ لی۔ ان کا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک کا زمانہ رامپور ہی

میں گزرا، رامپور کے زمانۂ ملازمت کے بعد وہ چندے بیکار بھی رہے۔ بالآخر ۱۹۵۴ء میں اٹاوہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ کالج سرسید کے ایک رفیقِ کار مولوی بشیر الدین احمد کی کوشش سے قائم ہوا تھا۔ اس کے ابتدائی زمانے میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے بھی یہاں تعلیم پائی تھی۔ پروفیسر عبدالشکور نے اپنے زمانۂ قیام میں کالج کی ترقی اور تنظیم میں بہت کوشش کی۔ یہاں جواہر میوزیم کی توسیع میں ان کی مساعیِ جمیلہ بھی مفید ثابت ہوئیں۔ اس عجائب گھر میں کئی بیش قیمت نادر کتب اور خطوط اور خطی نسخے محفوظ ہیں۔ فارسی مخطوطات کی فہرست مرتّبہ جناب محمد ابرار حسین فاروقی ایم اے (علیگ) "تذکرہ جواہر زواہر" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے (اٹاوہ ۱۹۵۹ء)۔

اٹاوہ میں چار سال رہنے کے بعد وہ ۱۹۵۸ء میں پھر علی گڈھ آئے۔ اب کے وہ ٹریننگ کالج سے وابستہ ہوئے۔ یہیں سے سال بھر بعد وہ مستقلاً ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد قیام بریلی میں رہا۔

مرحوم نے اپنے سہ سالہ قیامِ ڈربن کے زمانے میں وہاں کے سماجی حالات کا غائر مطالعہ کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندستان کی پسماندگی کا بڑا سبب یہاں کی عورتوں میں تعلیم کی کمی اور گھر کی چار دیواری میں ان کا مقیّد رہنا ہے۔ اس سے وہ رسمی پردے کے مخالف بن گئے۔ اور اسی باعث انھیں لڑکیوں کی تعلیم سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی۔ بریلی کے بعض دردمند اور ترقی پسند اصحاب نے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی تھی۔ ان میں خود عبدالشکور صاحب کے والد ڈپٹی عبداللطیف صاحب بھی تھے۔ چنانچہ ان اصحاب نے ۱۹۳۴ء میں بریلی میں اسلامیہ گرلز اسکول قائم کیا۔ اس میں انھیں اپنوں اور غیروں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آدمی تھے دُھن کے پکے، حوصلہ نہیں ہارے۔ جب عبدالشکور صاحب وطن واپس آئے تو یہ بھی اسکول کی کمیٹی کے ممبر بن گئے، بعد کو منیجر مقرر ہوگئے۔ یہ اسکول بہت کامیاب رہا، اب تو ترقی کرکے انٹر کالج بن گیا ہے۔

تصنیف و تالیف کا شوق شروع سے تھا۔ انھوں نے متعدد کتابیں شائع کیں۔ آغاز کار میں دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا: اول، مشہور نارویجی ڈراما نگار ہنرک ابسن کے ڈرامے ڈالز ہاؤس کا مشرقی تجربہ "گڑیا کا گھر" کے عنوان سے شائع کیا (علی گڑھ ۱۹۲۸ء)، اور اس کے بعد مشہور ناول پرائڈ اینڈ پریجوڈس کا ترجمہ۔ ان کے علاوہ روضۃ الرضوان (۱۹۱۵ء)، اصغر (الہ آباد ۱۹۴۵ء)، تنقیدی سرمایہ، حصہ اول (الہ آباد ۱۹۴۶ء)، تنقیدی سرمایہ، حصہ دوم لکھنؤ ۱۹۵۶ء)، فانی (دلی ۱۹۴۷ء)، حسرت موہانی، دور جدید کے چند منتخب ہندو شعرا (لکھنؤ ۱۹۴۳ء) شاہ غمگین حضرتجی اور ان کا کلام، ان کی تصنیفات میں سے زیادہ مشہور ہیں۔ حسرت موہانی سے ان کے ذاتی گہرے مراسم تھے۔ کانپور کے زمانۂ قیام میں وہ اکثر ان کے ہاں رہتے تھے۔ ان کی کتاب "حسرت موہانی" کے آخر میں کلام کا انتخاب خود حسرت کا کیا ہوا ہے۔ انھوں نے سلسلۂ مطبوعات اسلامیہ گرلز ہائی اسکول، بریلی کے عنوان سے کچھ کتابچے بھی شائع کیے تھے: مثلاً گرام سدھار، ضروری باتیں، (مزاحیہ خاکے) یاران میکدہ (دو حصے) وغیرہ۔ اردو نصاب کی کچھ کتابیں بھی مرتب کی تھیں، خود اکیلے بھی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی شرکت میں بھی۔ رسالوں میں بھی لکھتے رہتے تھے، ان میں طبعزاد مضمون بھی ہوتے تھے اور انگریزی سے ترجمہ بھی۔ علی گڈھ میگزین میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ آخری مضمون "فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج، بریلی میگزین" کے غالب نمبر (بابت ۱۹۶۹ء۔ ۱۹۷۰ء) میں بعنوان "غالب کی انسان دوستی" چھپا ہے۔ ان کے یہ مضمون ہنوز کتابی صورت میں جمع نہیں ہوئے۔

شروع میں صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ لیکن آخر آخر میں مختلف امراض کی آماجگاہ بن گئے تھے، بلکہ ایک مرتبہ موت سے چند سال قبل حالت بہت خراب ہوگئی، تو مقامی مشن اسپتال میں علاج کے لیے داخل ہونا پڑا۔ جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا، اس پر گھٹنوں اور ٹخنوں میں درد رہنے لگا؛ نماز میں رکوع و سجود سے بھی معذور ہوگئے۔ مجبوراً یہ فریضہ بیٹھے

بیٹھے ادا کرتے تھے۔ بہر حال موت کا ایک دن معیّن ہے، اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بھی درکار ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو سینے کے بائیں حصے میں درد کی شکایت کی اور یکایک جاں بحق ہو گئے۔ بریلی ہی میں اپنے آبائی قبرستان واقعہ محلہ بھوڑ (شاہ آباد) میں دفن ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اولادِ جسمانی میں چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑی۔ بیٹیاں سب یہاں ہندوستان میں ہیں۔ اور بیٹا پاکستان میں ہے؛ وہ وہاں کسی بنک میں ملازم ہیں۔

تاج، سیّد امتیاز علی

میری عمر کے جو لوگ آج سے ۵۰ - ۵۵ برس پہلے مدرسے میں پڑھتے ہوں گے، ناممکن ہے کہ انھوں نے لڑکوں کا ہفتہ وار پرچہ "پھول" اور لڑکیوں کا "تہذیب نسواں" نہ دیکھے ہوں، یہ دونوں رسالے دارالاشاعت، لاہور کی طرف سے شائع ہوتے تھے۔ اور ان کے کرتا دھرتا تھے مولوی سیّد ممتاز علی، جو بعد کو شمس العلماء کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔

وہ حضرت امام رضا کی نسل سے تھے۔ ان کے اجداد اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بخارا سے ہندستان آئے۔ اسی خاندان میں سید ممتاز علی، ۲ ستمبر ۱۸۶۰ء کو دیوبند (ضلع سہارنپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ذوالفقار علی حکومت میں ملازم تھے۔ ممتاز علی خود مولوی محمد قاسم نانوتوی کے ابتدائی شاگردوں میں تھے، چنانچہ انھوں نے قرآن، حدیث، فقہ کی تعلیم ان سے اور مولوی محمد یعقوب سے پائی۔ اس کے بعد اپنے طور پر کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی۔ ۱۸۷۶ء میں وہ لاہور گئے اور کچھ ایسے کہ پھر عمر بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ وہ سر سیّد کے گہرے دوست اور مؤید تھے۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے عورتوں کے لیے ہفتہ وار پرچہ تہذیب نسواں جاری کیا۔ اس رسالے نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ اسم بامسمّٰی

پرچہ ہمارے ملک کی عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و ترقی میں بہت ممد و معاون ثابت ہوا۔ یہ اسی کی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے لڑکوں کے لیے بھی 'پھول' جاری کیا۔ ہمارے بعض بہترین ادیب اور شاعر اسی 'پھول' کی دین ہیں۔ افسوس کہ یہ دونوں پرچے تقسیمِ ملک کے بعد بند ہو گئے۔

سید ممتاز علی خود بھی مصنّف تھے۔ منجملہ اور کتابوں کے ان کی مرتبہ "تفصیل البیان فی مقاصد القرآن" (۷ جلد) معرکے کی چیز ہے۔ اس میں قرآن کی مختلف موضوعات کے تحت تبویب کی گئی ہے اور یہ قرآن کے مضامین کا بہت مفید اور آسان اشاریہ ہے۔ ان علمی اور ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کا ۱۵ جون ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ ان کی بیوی محمدی بیگم بھی اردو کی اچھی ادیبہ تھیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا ۲ نومبر ۱۹۰۸ء کو شملے میں انتقال ہوا اور لاہور میں دفن ہوئیں۔

ان کے دو صاحبزادے تھے حمیدہ بیگم پہلی بیوی سے: حمید علی اور محمدی بیگم سے امتیاز علی۔ یہی امتیاز علی ہماری زبان کے مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج تھے۔ مولوی ممتاز علی کے کاروبار میں خدا نے بہت برکت دی۔ لاہور میں ان کے بہت سے مکانات تھے: مطبع تھا، کچھ زرعی زمین بھی تھی۔ اس تمام جاداد کی دیکھ بھال بڑے بیٹے سید حمید علی کے سپرد تھی، تعلیم یافتہ تو وہ ضرور تھے، لیکن انھیں تصنیف و تالیف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مکانوں کا کرایہ اگاہنے اور دارالاشاعت کے تجارتی حساب کتاب میں مگن رہتے تھے۔ اس کے بالعکس سید امتیاز علی تاج کو سوائے علم و ادب کے اور کسی چیز سے سروکار نہیں تھا۔ وہ ابتدا ہی سے خاندان کے مالی معاملات سے کم و بیش کنارہ کش رہے۔

سید امتیاز علی ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کینرڈ اسکول میں پائی جو اس زمانے میں شہر میں انگریزی وضع کا ممتاز پبلک اسکول تھا۔ دسویں درجے کی سند سنٹرل

ماڈل اسکول، لاہور سے ۱۹۱۵ء میں اور بی اے کی گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۲۲ء میں حاصل کی، بی اے میں انھوں نے فارسی میں امتیاز (آنرز) پایا۔ مزید تعلیم غیر ضروری خیال کرتے ہوئے، وہ دار الاشاعت کے علمی اور ادبی شعبے کی نگرانی کرنے لگے، وہ تقریباً ربع صدی تک "تہذیب نسواں" اور "پھول" کے ایڈیٹر رہے۔

انھیں لکھنے کا شوق بہت ابتدائی زمانے سے تھا۔ جب ان کا پہلا مضمون دلگیر اکبر آبادی کے مشہور رسالے نقّاد (آگرہ) میں چھپا ہے، تو ان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی اور وہ نویں درجے میں پڑھتے تھے۔ ان کی پہلی مطبوعہ کتاب 'موت کا راگ' بھی زمانۂ طالبعلمی کا کارنامہ ہے، یہ بچوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے ماہنامہ 'کہکشاں' جاری کیا، یہ پرچہ حسن ظاہری و معنوی کا نمونہ تھا اور اردو کے بہترین ادیب اس کے معاونین اور مضمون نگاروں میں شامل تھے۔ تاج کو ڈرامے اور تمثیل اور اداکاری سے شغف کالج کے زمانے سے تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج، لاہور کی ڈرامیٹک کلب کے سرگرم رکن اور اداکار تھے۔ ان کا معرکہ آرا ڈراما 'انارکلی' ہے اس کا آغاز انھوں نے بی اے پاس کرنے کے معاً بعد کیا تھا۔ جب یہ ڈراما اگلے برس ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوا، تو تاج نے اسے آغا حشر کو سنایا۔ آغا حشر (ف اپریل ۱۹۳۵ء) کا ڈرامے کی دنیا میں جو مقام تھا اور ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو "شیکسپیر ہند" لکھا کرتے تھے۔ حشر نے انارکلی کو دیکھا اور سنا تو بہت خوش ہوئے اور کہا (وہ تعلی ملاحظہ ہو):

"میں سمجھتا تھا کہ حشر کے بعد ڈراما ختم ہو جائیگا لیکن اردو ڈرامے کے بہار کے دن تو اب آرہے ہیں۔"

یہ ڈراما مکمل شکل میں پہلی مرتبہ دار الاشاعت کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ ظاہری شکل و صورت میں بھی یہ اتنا دیدہ زیب تھا کہ جس نے دیکھا، اُش اُش کر اٹھا۔ حکومت پنجاب نے اس پر انعام دیا اور یہ کتاب مدتوں بی اے، ایم اے اور مشرقی علوم کے امتحانات میں

بطور نصاب شامل رہی۔ تاج ایک زمانے تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور آزادیٔ ملک کے بعد پاکستان ریڈیو کے تو گویا بانیوں ہی میں تھے۔ دونوں جگہ انھوں نے ڈراما کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ انھوں نے اسی شوق کی تسکین میں اردو کے کلاسیکی ڈرامے کی ترتیب تدوین ہاتھ میں لی۔ ان ڈراموں کی تلاش کے سلسلے میں وہ چند برس ہوئے، ہندستان بھی آئے تھے۔ جہاں سے بھی انھیں یہ ڈرامے ملے، انھوں نے حاصل کیے۔ اگر مالک نے کتاب (یا کتابیں) الگ کرنا منظور نہ کیا، تو اس کی نقل کروائی۔ اس کے بعد انھوں نے ان ڈراموں کا متن صحیح کیا؛ ان پر حواشی لکھے اور انھیں اپنے تنقیدی تبصرے کے ساتھ شائع کر دیا۔ اردو میں ڈرامے کو کبھی قابلِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ خود ڈراما نگاروں نے بھی اپنی تصنیفات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ڈرامے شائع بھی ہوئے، وہ خود مصنف کی تصحیح اور نظرِ ثانی سے محروم رہے۔ اس لیے مطبوعہ ڈرامے بحد ناقص، اور ان کا متن بحد غلط تھا۔ اس لیے جب تاج نے ان ڈراموں کو موجودہ معیارِ صحت متن و تنقید کے بعد شائع کرنے کا فیصلہ کیا، تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا جان جوکھم کا کام تھا۔ لیکن ان کے صبر و استقلال کی داد دینا چاہیے کہ ان سب مشکلات کے باوجود ہمت نہیں ہارے۔ انھوں نے ان ڈراموں کو تیس جلدوں میں مدوّن کیا، اور ان میں سے مندرجہ ذیل کلاسیکی ڈراما نویسوں کی تخلیقات سات جلدوں میں شائع کر دیں:

(۱) بمبئی میں اردو کا پہلا ڈراما۔ خورشید مع اردو ڈرامے کا تاریخی جائزہ؛ (۲) آرام کے ڈرامے (دو جلد)؛ (۳) ظریف کے ڈرامے؛ (۴) رونق کے ڈرامے (۲ جلد) ۵ حباب کے ڈرامے۔

سات مزید جلدیں مطبع کے لیے تیار تھیں۔ بقیہ جلدوں کا مواد جمع تھا اور ان کے لیے یادداشتیں بھی قلمبند کر لی تھیں۔ افسوس کہ ان کی ناگہانی موت کے باعث یہ کام مکمل نہ ہو سکا! اب ان کی سی تعداد، تجربے کا آدمی کہاں ملیگا کہ اسے پورا کر سکے!

ڈراموں کے علاوہ انھیں افسانہ اور عورتوں اور بچوں کے ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے، خدا جھوٹ نہ بلوائے، عورتوں اور بچوں کے لیے کوئی سو کتابیں تو ضرور لکھی ہونگی جیسا کہ

اوپر ذکر ہوا ان کی سب سے پہلی کتاب "موت کا راگ" بھی بچوں کے لیے تھی۔ ان کتابوں کی محکمۂ تعلیم نے بھی قدر کی، ان میں سے بیشتر نصاب یا معاونِ نصاب قرار پائیں۔

افسانے سے دلچسپی کے باعث ہی انھوں نے کہکشاں جاری کیا تھا۔ اس میں وقت کے بہترین افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مشہور انگریزی مزاح نگار جیرومِ کے ایک خاکے (Three Men in a Boat.) سے مختار کرکے مشہور ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور کے لیے ایک ہلکا پھلکا مزاحی افسانہ لکھا: چچا چھکن نے تصویر ٹانگی۔ اس کے بعد انھوں نے اسی رنگ کے چند طنز آمیز خاکے اور بھی لکھے۔ یہ سب "چچا چھکن" کے عنوان سے ایک پتلی سی کتاب میں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پتلی سی کتاب (بمشکل ... صفحات) کئی ضخیم کتابوں اور مجموعوں پر بھاری ہے۔ جس طرح سرشار کے فسانۂ آزاد کا کردار خوجی ہمارے ادب میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح تاج صاحب کا کردار چچا چھکن ہے۔

امتیاز علی تاج نے کئی انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے، جن میں شکسپیر کا ڈراما: مڈسمر نائٹس ڈریم لارڈ لٹن کا لیلایا محاصرۂ غرناطہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کسی زمانے میں لارڈ لٹن کی اس کتاب کا ترجمہ جسٹس محمود (خلف سرسید مرحوم) نے تہذیب الاخلاق کے لیے شروع کیا تھا۔ لیکن چند قسطوں کے بعد یہ کہہ کر اس سے ہاتھ اٹھا لیا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں، تاج کا ترجمہ پوری کتاب کا ہے۔

انھوں نے سید احمد شاہ بخاری "پطرس" مرحوم کی شراکت میں جارج برنارڈ شا کا ڈراما آرمز اینڈ دی مین، اے۔ اے۔ ملن کا The Man at the Popomack. اے۔ اے۔ ملن کا، ایس ایلیٹ کے کیرل چپیک کی R. U. R اور متعدد ایک ایکٹ کے ڈرامے اردو میں منتقل کیے اور پھر انھیں کھیلا بھی۔ ان کے علاوہ وکٹر ہیوگو، ایڈگر ایلن پو، آسکر وائلڈ اور گیٹے اور یورپی اور امریکی مصنفوں کی نگارشات کے ترجمے بھی ان کے مرہونِ منت ہیں، پوری فہرست کہاں دی جا سکتی ہے!

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ تاج ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے، ہوا یہ کہ بچپن میں ان کی والدہ انھیں پیار سے تاج کہہ کر پکارتی تھیں، جو گویا امتیاز کی تحریف تھی۔ رفتہ رفتہ گھر کے سب لوگ اور پھر ان کے احباب بھی انھیں اسی عرف سے پکارنے لگے؛ اور بالآخر انھوں نے خود بھی اسے اپنے نام کا جزو بنا لیا۔

ان کی بیگم اردو کی مشہور افسانہ نگار حجاب ہیں۔ جو شادی سے پہلے حجاب اسمٰعیل کے نام سے لکھتی رہی تھیں۔ اولادِ جسمانی میں صرف ایک لڑکی (یاسمین) ہوئی۔

وہ پچھلے دس برس سے لاہور کے مشہور ادارے انجمن ترقی ادب کے ڈائرکٹر تھے۔ اس ادارے کی طرف سے اردو کا کلاسیکی ادب جس اہتمام اور آب و تاب سے شائع ہوا ہے، اس کے لیے بہت حد تک خود تاج صاحب ذمہ دار تھے۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی گوناگون علمی و ادبی اور تہذیبی خدمات کے صلے میں انھیں ستارۂ امتیاز، کا تمغہ عطا فرمایا، جو ان کے نام کی مناسبت سے گویا انھیں کے لیے وضع ہوا تھا، اس کے علاوہ اعلیٰ ادبی کارکردگی کا انعام بھی ملا تھا۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۲۸ء میں ہوئی جب میں انٹر کے بعد مزید تعلیم کے سلسلے میں لاہور پہنچا ہوں۔ لابد تھا کہ میں بتدریج یہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں نہ پہنچتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور چونکہ وہ ان حلقوں کے گلِ سرسبد تھے، لہٰذا ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء دو سال گوالمنڈی میں کرایے کے مکان میں مقیم رہا تھا۔ یہ مکان انھیں کی جاداد کا حصہ تھا۔ اسی محلے کی پشت پر ریلوے روڈ ہے، جہاں دار الاشاعت کا دفتر اور ان کے خاندان کے سکونتی مکان تھے۔ اس زمانے میں بھی ان سے ملنا جلنا رہا۔ ان سے مل کر دلی مسرت ہوتی۔ ان میں ہمیشہ علمی وقار اور علم دوستی کی ملنساری کا جذبہ پایا۔

افسوس کہ علم و ادب کے اس دیرینہ خادم کا انجام بہت المناک ہوا۔ ۱۸ اپریل کی شب میں دونوں میاں بیوی اپنے مکان کی چھت پر سو رہے تھے کہ دو نقاب پوش شخص آئے اور انھوں نے تاج صاحب پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ آواز سے بیگم بھی جاگ اٹھیں اور انھوں نے بیچ بچاؤ

کی کوشش کی، لیکن بیسود۔ دونوں میاں بیوی زخمی ہو گئے۔ تاج صاحب کو بالخصوص بہت زخم آئے۔ اسی حالت میں انھیں اسپتال پہنچایا گیا۔ علاج معالجے میں کوئی فروگذاشت نہیں ہوئی، لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے؟ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے اور اگلے دن (۱۹ اپریل) سہ پہر کو جان بحق ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جنازہ ۲۰ کو اٹھا اور انھیں مومن پورہ (میکلوڈ روڈ) کے قبرستان میں اپنی والدہ محمدی بیگم کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ کلب علی خاں فائق کی کہی ہوئی تاریخ ہے:

کہو با آہ سالِ رحلتِ تاج
"تاج خلدِ بریں میں جا پہنچے"

۱۳۹۰ = ۱۳۸۴ + ۶

شکیل بدایونی، شکیل احمد

۳ اگست ۱۹۱۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غفار احمد تھا جس سے سنہ ہجری ۱۳۳۴ (۳ شوال) برآمد ہوتا ہے۔ ان کے دادا منشی ہدایت اللہ سوختہ محکمۂ سروے میں ملازم تھے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوئے۔ ان کے دیکھنے والے ان کی نیکی، خوش مزاجی اور دینداری کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کا خاندان سوختہ کہلاتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں کوئی صاحب آگ سے جل مرے تھے، اسی سے یہ نام پڑا۔ اس سے ایک بات یاد آ گئی: کانگریس کے لیڈروں میں ایک صاحب منظر علی سوختہ ہوئے ہیں، وہ بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد منشی مبارک علی سوختہ پنڈت موتی لال نہرو مرحوم کے محرّر تھے اور آنند بھون' الہ آباد میں رہتے تھے۔ پنڈت جی ان پر بہت مہربان تھے اور ان کے خاندان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ منظر علی کی تعلیم و تربیت بھی بہت حد تک پنڈت جی کی مرہونِ منّت تھی۔

شکیل کے والد مولوی جمیل احمد قادری سوختہ نے مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں تعلیم پائی۔ ان کے وعظ میں بڑی کشش تھی۔ چنانچہ دور دور سے انھیں دعوت تقریر و تلقین ملتی رہتی تھی۔ اسی سے ان کے بمبئی میں بہت لوگ قدردان ہو گئے۔ اور بالآخر وہ مستقل طور پر نقل مکان کر کے وہاں

چلے گئے۔ یہاں وہ کم و بیش اٹھارہ سال تک خواجہ اہلسنت (خوجہ سنّی) مسجد میں پیش امام اور خطیب کے منصب پر کام کرتے رہے۔ یہ ان کی اسی مذہبیت کا نتیجہ تھا کہ شکیل کی ابتدائی تعلیم بھی اردو، فارسی، اور عربی تک محدود رہی اور وہ اس سلسلے میں کچھ زمانہ اپنے والد کے پاس بمبئی میں بھی رہے۔ یہ مراحل طے ہو گئے تو انھیں مشن اسلامیہ ہائی اسکول شیخوپورہ بدایوں میں بھیج دیا گیا (یہ اسکول اب حافظ صدیقی اسلامیہ انٹر کالج کہلاتا ہے)۔ ۱۹۳۶ء میں یہاں سے دسویں درجے کی تکمیل کی اور اسی سال علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۳۹ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کی مالی حالت بہت سقیم ہو گئی، لیکن مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری اور قیصر حسین قادری کی دستگیری اور داؤد بھائی فضل بھائی ٹرسٹ (بمبئی) کے وظیفے نے یہ مشکل آسان کر دی۔ چنانچہ انھوں نے تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۴۲ء میں بی اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مرکزی حکومت ہند کے محکمۂ سپلائی میں کلرک بھرتی ہو گئے؛ وہ یہاں دلّی میں ۱۹۴۶ء تک رہے۔

ان کا دلّی کے قیام کا زمانہ دوسری جنگ عظیم کے متوازی ہے۔ حکومت کو لوگوں میں موافق فضا پیدا کرنے اور انھیں جنگ میں حصّہ لینے پر ابھارنے کی خاطر طرح طرح کے پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ انھیں میں ایک سانگ پبلسٹی کا محکمہ تھا۔ اس کے کرتا دھرتا مشہور شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ یہ محکمہ شہر بشہر اور قریہ بقریہ طائفے بھیجتا رہتا تھا، جہاں ڈرامے، قوالیاں مشاعرے، گانے بجانے کا پروگرام ہوتا۔ لوگ جمع ہوتے اور تفریح کے پردے میں انھیں جنگی مساعی سے ہمدردی کا سبق سکھایا جاتا۔ اس زمانے میں شکیل نے بھی بہت نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اس سے ان کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔

شکیل اسم بامسمیٰ تھے، شکل و صورت اچھی تھی اور آواز بھی دلکش پائی تھی۔ شعر خوب پڑھتے تھے اور سننے والے اس کی تعریف کرتے تھے۔ اکثر حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام بڑے جوش و خروش سے سنایا کرتے تھے۔ یہ ان کے لیے پسند عوام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

انھیں خود بھی شاعری سے دلچسپی تو بہت دن سے تھی، لیکن اس سے صحیح شغف علی گڈھ کے قیام کے زمانے میں پیدا ہوا۔ یہ وہ دور ہے، جب جگرؔ مراد آبادی مرحوم کا ڈنکا بج رہا تھا۔ وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے حلقوں میں بہت ہر دلعزیز تھے، یہاں اکثر آتے اور مہینوں مقیم رہتے۔ اسی زمانے میں شکیل ان کے ایک شاگرد دراز مراد آبادی کی وساطت سے جگرؔ کے زیر اثر آئے۔ وہ اس سے پہلے اپنے والد کے جگری دوست مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری سے مشورۂ سخن کرتے رہے تھے۔ ضیاء القادری تحصیل بدایوں میں ناظر تھے۔ ان کے تعلقات شکیل کے والد مولوی جمیل احمد سے اتنے گہرے اور مخلصانہ تھے کہ عام لوگ انھیں بھائی بھائی خیال کرتے تھے۔ شکیل بھی انھیں چچا کہہ کر پکارتے تھے۔ ضیا، خود مولوی علی احمد خاں اسیر بدایونی (پروفیسر عربی و فارسی سینٹ جانس کالج، آگرہ) کے حقیقی بھانجے اور شاگرد تھے۔ دونوں ماموں بھانجے نعت رسول صلعم لکھتے تھے۔ ضیا کی بلا مبالغہ سینکڑوں نعتیں میری نظر سے گذری ہیں۔ ان کی مرتبۂ اکمل التاریخ چھپ چکی ہے (بدایوں ۱۳۳۳ھ) اس کے دو حصے ہیں۔ دراصل یہ انھوں نے اپنے مرشد مولانا فضل رسول کی سوانحعمری کے طور پر لکھی تھی، اس کے پہلے حصے میں بدایوں کے اہل دل اور اہل علم کا بہت اچھا تذکرہ محفوظ ہو گیا ہے اور دوسرے میں مولانا فضل رسول کے مفصل حالات ہیں۔ ضیا صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔ معلوم نہیں ہنوز حیات ہیں، یا اپنی منزلِ آخر کو روانہ ہو گئے، جہاں ہم سب کو ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ ادھر دو تین برس سے ان کی کوئی چیز بھی نظر سے نہیں گزری۔ بشرطِ حیات وہ اس وقت ۹۰ کے پیٹے میں ضرور ہونگے۔

ایک تو شکیل کا اپنا خاندان ہی مذہبی خیالات کا اور آستانۂ قادریہ کا مرید و معتقد تھا، اس پر ضیاء القادری کا تلمذ گویا سونے میں سہاگہ ہو گیا۔ خود شکیل نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

بارک اللہ، فیضِ تعلیم ضیاء سے اے شکیل!
خود بخود رنگِ تغزل عارفانہ ہو گیا

ایک اور شعر میں کہتے ہیں:

لحظہ لحظہ اوج پر فیضِ ضیا ہے اے شکیلؔ!

رفتہ رفتہ شاعرِ کامل ہوا جاتا ہوں میں

جگرؔ نے کسی کو اپنا باقاعدہ شاگرد نہیں بنایا، اگرچہ ان سے کئی اصحاب نے وقتاً فوقتاً استفادہ ضرور کیا۔ شکیلؔ بھی اسی گروہ میں شامل تھے۔ جگرؔ کے اس تعلق سے انھیں یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ جلد اور بآسانی ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ اور باہر کے مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگے۔

فروری ۱۹۴۶ء میں شکیلؔ ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی گئے۔ یہاں ان کی مشہور فلمساز مسٹر کاردار سے ملاقات ہوئی۔ وہ شکیلؔ سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان سے اپنی بعض فلموں کے لیے گیت لکھنے کی فرمایش کی۔ یہ دعوت شکیلؔ کی زندگی کا موڑ ثابت ہوئی۔ ان کے لیے یہ بہت بڑی آزمایش تھی۔ اس زمانے میں وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ان کا مشاہرہ صرف ساٹھ روپے تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے کاردار کی فرمایش یہ کہہ کر رد کر دی کہ جب تک ملازمت میں ہوں، میں کوئی پرائیوٹ کام نہیں کر سکتا۔ اس پر کاردار کا اصرار بڑھا۔ بالآخر انھوں نے ملازمت سے استعفےٰ دے دیا اور کاردار کی چار سو ماہانہ کی پیش کش قبول کر لی۔

خوش قسمتی سے انھیں ایک اور طرف سے بھی کمک ملی۔ مشہور موسیقار ڈاکٹر سید نوشاد علی نے اعلان کر دیا کہ آیندہ وہ صرف شکیلؔ کے لکھے ہوئے گیت گائینگے۔ سب سے پہلی فلم 'درد' میں شکیلؔ کے گیتوں اور نوشاد کی موسیقی کی دھوم مچ گئی، جس نے کامیابی اور مزید ترقی کے تمام دروازے کھول دیے۔ شکیلؔ نے اپنی زندگی میں سو سے زیادہ فلموں کے لیے گیت لکھے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ اس میدان میں بہت کامیاب رہے۔ انھوں نے اردو (ہندی) کے علاوہ پوربی زبان میں بھی گیت لکھے۔ لکھنے کو تو فلموں کے لیے گیت سبھی نے لکھے اور اس گروہ میں ہمارے بعض صفِ اوّل کے شاعر بھی ہیں۔ لیکن ایک بات کا اعتراف

ضروری ہے کہ بیشتر دوسرے حضرات کی طرح شکیل نے اپنے گیتوں اور نغموں میں ابتذال اور سوقیت کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ بہت حد تک ان کے گیتوں میں ادبیت اور ہندی شاعری کا رچاؤ ملتا ہے۔ انھوں نے اس سے بہت روپیہ کمایا۔ بمبئی میں ان کے دو دو مکان ذاتی ملکیت کے تھے۔ ادبی دنیا نے بھی ان کی بہت قدر کی۔ ابھی پار سال غالب صدی تقریبات کے زمانے میں گورنر یوپی (شری گوپال ریڈی) نے ان کے وطن بدایوں میں شکیل روڈ کا افتتاح کیا تھا۔ تین چار سال ہوئے، بمبئی اور دلّی میں خاصے بڑے پیمانے پر جشنِ شکیل منایا گیا تھا۔ اور اب ایک اور جشن کی بمبئی میں داغ بیل پڑ چکی تھی کہ موت کا بلاوا آگیا۔

وہ بمبئی کے ممتاز شہری تھے، وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں شاعری کہنے کا بھی شوق تھا، بالعموم یا تو اس کی صدارت کرتے یا افتتاح۔ غرض عجیب باغ و بہار شخصیت تھی۔

شکیل کو بہت دن سے ذیابطیس کی تکلیف تھی، یہ مرض انھیں ورثے میں ملا تھا، ان کے والد مولوی جمیل احمد کا بھی ۲۰ جولائی ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں اسی موذی مرض سے انتقال ہوا تھا۔ بدقسمتی سے شکیل کو ذیابیطس کے ساتھ تپ دق کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ تپ دق عام حالات میں اب مہلک نہیں رہا، لیکن ذیابطیس نے انھیں بہت کمزور کر رکھا تھا، جس سے تپ دق کا بھی ٹھیک سا علاج نہ ہو سکا، بلکہ آخری ایام میں گلے میں بھی کچھ شکایت پیدا ہو گئی تھی اور بعض لوگوں نے اس پر کینسر کا شبہہ کیا ہے۔ غرض پوری دوا دوش کے باوجود حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء صبح کے وقت انھیں خون کی قے ہوئی، جس پر بمبئی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن وقتِ معیّن آ لگا تھا، علاج معالجے کی اب کیا گنجائش تھی! اسی دن وہیں اسپتال میں سہ پہر کو ساڑھے چار بجے انتقال ہو گیا، لاش مکان پر آئی، عشائے کے بعد جنازہ اٹھا، اور سینکڑوں دوستوں، مدّاحوں، ہمکاروں اور سوگواروں نے

انھیں گیارہ بجے شب باندرہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا، خدا مغفرت کرے۔ کئی دوستوں نے تاریخِ وفات کہی ہے۔ اعجاز صدیقی نے عیسوی تاریخ کہی: خلد میں شاعرِ شباب شکیل (۱۹۷۰) ہجری میں ۵۳ کے تعمیہ کے ساتھ ہے!

'احمد' کے نام کا جو سہارا ذرا ملا
۵۳
ہے خلد میں قیام جنابِ شکیل کا

منشی ہدایت اللہ سوختہ کے دو بیٹے تھے: ایک مولوی جمیل احمد سوختہ یعنی شکیل کے والد، دوسرے ان سے بڑے منشی حضور احمد جن کی بیٹی ریاض بتول، مولوی قیصر حسین قادری کے عقدِ نکاح میں تھیں (ان کا اوپر ذکر ہوا ہے) انھیں قیصر حسین کی صاحبزادی 'سلمہ' سے شکیل کی شادی ہوئی تھی (۱۹۳۶ء) اپنے پیچھے پانچ بچے: تین لڑکیاں (رضیہ، صفیہ، نجمہ) اور دو لڑکے (جاوید، طارق) اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

مرحوم کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رعنائیاں (دلّی ۱۹۴۴ء) صنم و حرم (بمبئی ۱۹۴۶ء)، رنگینیاں (لاہور ۱۹۴۹ء) اور شبستان (لاہور ۱۹۵۰) نغمۂ فردوس (بمبئی ۱۹۴۷ء) نعتوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنی سوانحِ عمری بھی مرتب کر لی تھی، جو ہنوز چھپی نہیں۔ خدا نہ کرے، اس کا مسودہ کہیں ضائع ہو جائے!

اب چند شعر دیکھیے

حالِ دل، احوالِ غم، شرحِ تمنا، عرضِ شوق
بیخودی میں کہہ گئے، افسانہ در افسانہ ہم

یاد ساقی، خندہ زن، وعدہ خلافی طعنہ زن
ہائے کس مشکل سے پہنچے ہیں تا درِ میخانہ ہم

آگے، خدا ہی جانے، انجامِ عشق کیا ہو
جب اے شکیل! اپنا یہ حال ہے ابھی سے

در اصل آدمی نہ سمجھنا اُسے شکیل!
جو آدمی وفا نہ کرے، آدمی کے ساتھ

راہبر کی، نہ فکرِ منزل کی
کر رہا ہوں میں پیروی دل کی

مرے دل نے مجھے، غربت میں، تسکیں دی یہ کہہ کہہ کر
وہ منزل ہے، وہ گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت، ہے ابتدا شرحِ مدّعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں ان کو کہاں سے پہلے

قسم فریبِ نگاہ و دل کی، ہمیں تو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل، قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

ازل سے شاید، لکھے ہوئے تھے، تشکیل! قسمت میں جور پیہم
کھلیں جو آنکھیں اس انجمن میں، نظر ملی آسماں سے پہلے

بے تعلق ترے آگے سے گزر جاتا ہے
یہ بھی اک حسنِ طلب ہے ترے دیوانے کا

مجمعِ احباب و اربابِ وفا
مجمعِ اغیار ہے تیرے بغیر

رعنائیِ بہارِ گل و گلستاں گئی
وہ کیا گئے کہ رونقِ بزمِ جہاں گئی

غم ہو کہ انبساط، کسی کو نہیں قرار
فصلِ بہار آئی، تو فصلِ خزاں گئی

دلِ بے نیازِ آرزوئے التفات ہے
شاید اسی کا نام سکونِ حیات ہے

وائے حیرت کہ بھری محفل میں
مجھ کو تنہا نظر آتا ہے کوئی

چاہیے خود یہ یقینِ کامل
حوصلہ کس کا بڑھاتا ہے کوئی

لمحاتِ یادِ دوست کو صرفِ دعا نہ کر
آتے ہیں زندگی میں یہ عالم کبھی کبھی

فریبِ وفا، وعدہ ہائے مسلسل
مجھی پر یہ مشقِ عنایات کیوں ہو

لب صرفِ تکلّم ہیں، تو نظریں ہیں کہیں اور
ان باتوں سے ہوتا ہے، محبّت کا یقیں اور

وہ بھی دل گرفتہ ہیں، اپنی کیا کہوں ناصح!
مجھ سے گفتگو کرنا، ان سے گفتگو کرکے

ہزار قیدِ خزاں سے چھٹ کر، بہار کا آسرا کرینگے
بہار بھی ہم قفس زدوں کو نہ راس آئی، تو کیا کرینگے

جہاں کی نیرنگیوں نے یکسر بدل گئی آشیاں کی صورت
قفس سمجھتی ہیں جن کو نظریں، وہ درحقیقت قفس نہیں ہے

چمن کی آزادیاں مؤخّر، تصوّرِ آشیاں مقدّم
غمِ اسیری کا ہے نامکمل، اگر غمِ خار و خس نہیں ہے

نہ کر مجھے شرمسار، ناصح! میں دل سے مجبور ہوں کہ جس کا
ہے یوں تو کون و مکاں پہ قابو، مگر محبت پہ بس نہیں ہے

اڑائی واعظ نے چھپ کے بیہم، چڑھائی رندوں نے مل کے باہم
یہاں تو یہ سوچتے ہی گزری کہ بادہ نوشی حرام کیوں ہے؟

نہ ذکرِ عنوانِ نہ حرفِ مطلب، اِدھر خموشی، اُدھر تغافل
تو پھر یہ افسانۂ محبت زبان زدِ خاص و عام کیوں ہے؟

دل نے غم سے شکست پائی ہے — عمرِ رفتہ تری دہائی ہے
میرے معبد نہیں ہیں دیر و حرم — احتیاطاً جبیں جھکائی ہے
وہ ہوا دے رہے ہیں دامن کی — ہائے کس وقت نیند آئی ہے
گُل فسردہ، چمن اداس، شکیل! — یوں بھی اکثر بہار آئی ہے

کفر و ایماں کی سیاست سے، ہے ناکارہ وجود — آدمی کام کا ہوتا، اگر انساں ہوتا
کھل گیا تجزیۂ غم سے ہر اک رازِ حیات — زیست مبہم تھی، اگر دل نہ پریشاں ہوتا
تونے سوچا کبھی، دامن کو بچانے والے! — کچھ سکت ہاتھ میں ہوتی، تو یہ داماں ہوتا

سعیِ تشریحِ آرزو کی قسم! — محرمِ آرزو، نہ تم، نہ ہم
موجِ انفاسِ زاہداں، توبہ! — بجھ نہ جائے کہیں چراغِ حرم

دل کو نہ ہوگی تابِ غم بے تو جہی — للّٰلہ، داستانِ محبت نہ پوچھیے

یوں دیکھتے ہیں، جیسے ادھر دیکھتے نہیں
اس لطفِ بے طلب کی نزاکت نہ پوچھیے

کیسی بہار، کس کے ستارے، کہاں کے پھول
جب تم نہیں، تو دیدہ و دل میں سمائے کون
ذوقِ عمل، نہ ذوقِ جنوں؛ ہر طرف سکوں
جنّت اگر یہی ہے، تو جنّت میں جائے کون!

ذوقِ لطیف و چشمِ حقیقت نگر کہاں!
حسنِ ازل تو عام ہے، حسنِ نظر کہاں!

اے شکیل! ان کی محفل سے جاتے تو ہو
اور اگر دل نے پوچھا: کہاں چل دیئے؟

منوّر لکھنوی، منشی بشیشور پرشاد

منور صاحب جن کا ۲۴ مئی ۱۹۷۰ء کی صبح دلّی میں انتقال ہو گیا، پشتینی شاعر تھے۔ شجرہ نسب ملاحظہ ہو:

منشی اودے راج مطلع لکھنوی

منشی ایشور پرشاد شعاعی لکھنوی

منشی پورن چند ذرّہ لکھنوی

منشی رام سہائے تمنّا لکھنوی (ف ۱۹۴۴ء)
منشی ماتا پرشاد نیاں لکھنوی (ف ۱۹۳۸ء)
منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی

منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

یہی نہیں، منشی جگدمبا پرشاد قیصر لکھنوی ان کے ماموں تھے اور مشہور تاریخ نگار اور فارسی گو منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی ان کے خسر۔ اگر ان حقائق کے پیش نظر منوّر نے کہا:

شاعری سے نہ منوّر کو ہو کیونکر رغبت
پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے مبالغہ کیا، یا غلط لکھا؟

منور سکسینہ کائستھ خاندان کے فرد تھے۔ وہ ۸ جولائی ۱۸۹۷ء کو اپنے آبائی مکان محلہ نوبستہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان سے بڑے ایک اور بھائی تھے، بابو رام شنکر پرشاد۔ وہ بھی خاندانی روایات اور ماحول کے زیر اثر صحافت اور شعر گوئی میں دلچسپی لیتے تھے۔ تعلیم کے بعد اودھ اخبار (لکھنؤ) کے شعبۂ ادارت میں ملازم ہو گئے تھے، اور ایک اپنا ہفتہ وار اخبار تفریح بھی شائع کرتے تھے۔ بدقسمتی سے وہ یکایک فروری ۱۹۱۳ء میں پلیگ کا شکار ہو گئے۔ ان کے علاوہ دو چھوٹے بھائی اور تھے اور ایک بہن۔

منور کے والد افق بڑے پرگو شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے ہماری زبان کی جو خدمت کی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بدقسمتی سے انھیں شراب نوشی کی نامراد لت تھی۔ اگرچہ ان کی آمدنی ترجمے اور صحافت سے، اچھے شریفانہ خرچ کے لیے کافی تھی، لیکن جس بلا کے وہ پینے والے تھے، اس کے لیے یہ کسی طرح کفالت نہیں کر سکتی تھی۔ بڑا بیٹا رام شنکر پرشاد ان کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہوا تھا کہ وہ بھی جوانا مرگی کا داغ دے گیا۔ اس حادثے کا منور صاحب کی تعلیم پر بہت ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس وقت یہ آٹھویں درجے کا امتحان دے چکے تھے۔ لیکن اب گھر کی مالی حالت اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ یہ آگے تعلیم جاری رکھ سکتے۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مصیبت اکیلی نہیں آتی! ابھی خاندان کے حواس رام شنکر پرشاد کی بیوقت موت کے صدمے ہی سے ٹھکانے نہیں آئے تھے کہ اس کے ۷۔۸ مہینے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کو خود افق بھی بعمر ۴۹ سال انتقال کر گئے، جس سے وہ رہا سہا آمدنی کا ذریعہ بھی منقطع ہو گیا۔

یوں کم عمری میں پورے خاندان کی دیکھ بھال کی ذمے داری منور صاحب کے کمزور کندھوں پر آ پڑی۔ ان کی عمر اس وقت ۱۶ سال کی تھی۔ ہمت مرداں مدد خدا! یہ اودھ اخبار کے نامہ نگار تو اپنے بھائی کی وفات کے بعد ہی مقرر ہو گئے تھے، اب انھوں نے کوشش کر کے ریلوے کے حسابات کے دفتر میں عارضی ملازمت کر لی (ستمبر ۱۹۱۳ء) مشاہرہ ۱۸ روپے مقرر ہوا۔ خوش قسمتی سے تھوڑے دن بعد یہ ملازمت مستقل ہو گئی۔ اسی ملازمت کے دوران میں انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پرائیوٹ طور

امتحان دے کر دسویں درجے کی سند حاصل کر لی، اس سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ لیکن انھوں نے ذاتی مطالعے اور محنت سے اپنی استعداد میں بہت اضافہ کیا اور فارسی اور سنسکرت میں بھی اتنی اچھی لیاقت مہیا کر لی کہ بعد کے زمانے میں وہ ان زبانوں کی کتابیں بآسانی ترجمہ کرتے رہے۔

منور صاحب عمر بھر ریلوے کے اسی محکمہ سے وابستہ رہے اور مختلف مقامات (لاہور، لکھنؤ، دلی وغیرہ) تبادلے پر گئے۔ آخری مرتبہ وہ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں دلی آئے اور اس کے بعد یہیں کے ہو رہے۔ یہیں سے جنوری ۱۹۵۷ء میں ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

انھیں شعر و سخن سے دلچسپی بہت ابتدائی زمانے میں پیدا ہو گئی تھی اور یہ ہونا بھی چاہیے تھی۔ گھر کی فضا میں اس کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ شروع میں ان کا کلام اپنے بڑے بھائی کے پرچے تفریح اور ادودھ اخبار میں چھپتا رہا۔ اس کے بعد ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں بھیجنے لگے۔ ان کے چچا منشی رام سہائے تمنا بھی ایک ماہانہ پرچہ دربار شائع کرتے تھے؛ اس میں نظم و نثر دونوں ہوتی تھیں۔ تمنا صاحب کتابوں کے مشہور تاجر لانگ مین گرین اینڈ سنز کے ملازم تھے اور اسی باعث بیشتر دورے پر دلی سے باہر رہتے تھے۔ پرچے کی دیکھ بھال اور ترتیب و تدوین میں ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر گوری سہائے اور منور صاحب کے سپرد تھی۔ نثر کا حصہ ڈاکٹر صاحب دیکھتے اور نظم کا منور صاحب۔

ان کے ایک عزیز دوست شیو نرائن بھٹناگر دلی کے مشہور روزنامہ تیج کے ایڈیٹر تھے۔ منور جب دلی آئے تو ان کے اصرار پر باقاعدگی سے اپنا کلام تیج کو دیتے رہے۔ کئی سال بعد شیو نرائن نے تیج کی ملازمت ترک کر کے اپنا ہفتہ وار اخبار بھارت جاری کر دیا اور پھر ۱۹۳۰ء میں ایک روزنامہ بھی "وطن" کے نام سے چھاپنے لگے۔ منور صاحب کا کلام ان دونوں میں بھی چھپتا رہا، بلکہ کئی سال تک وہ وطن کا ذکاہیہ کالم "کچھ نہ کچھ" کے عنوان سے بھی لکھتے رہے۔

دلّی میں پنڈت امرناتھ ساحر کی شخصیت ایک ادبی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہر ماہ اپنے زیرِ اہتمام مشاعرہ کرتے تھے جس میں اردو اور فارسی دو مصرع طرح دیے جاتے تھے۔ مقامی شعرا کے علاوہ باہر سے بھی اساتذہ کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ جب منور دلّی آئے، تو وہ ان مشاعروں میں جانے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی شروع کی۔ اردو میں اگرچہ شروع میں انھوں نے چندے اپنے والد اور پھر چچا منشی رام سہائے تمنّا سے مشورہ کیا، لیکن صحیح معنوں میں، وہ ۱۹۱۵ء سے منشی نوبت رائے نظر (وفات اپریل ۱۹۲۳ء) سے اصلاح لیتے رہے۔ اب فارسی کا شوق ہوا، تو اس میں رائے سدھ ناتھ بلی فراقی دریابادی سے مشورہ کرنے لگے۔ منور کا فارسی کلام (طوافِ عجم) بقدر ایک دیوان کے جمع ہے، لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ کچھ کلام ہندی میں بھی ہے۔

منور کو ہندی، سنسکرت، فارسی تینوں زبانوں پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی، اور اسے انھوں نے اُردو ادب کو بذریعۂ تراجم مالامال کرنے میں استعمال کیا۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کا حریف و سہیم نہیں تھا۔ آخر میں ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی فہرست دی جا رہی ہے؛ اس سے آپ اندازہ لگائیں گے کہ اس پہلو سے ان کی خدمات کتنی وقیع اور پائیدار ہیں۔

میں انھیں ۱۹۳۷ء سے جانتا تھا۔ چونکہ اس کے بعد میرا کوئی رُبع صدی کا زمانہ ملک سے باہر گذرا، یہاں کہیں برسوں کے بعد آنے کا موقع ملتا تھا۔ اس لیے ہمارے تعلقات میں بے تکلفی کا رنگ تو کبھی نہ پیدا ہوا، لیکن دوستانہ مراسم تھے اور ہم ایک دوسرے سے ملاقات میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ ان سے جب کبھی ملنا ہوا، مجھے ان کی شرافتِ نفس اور انسان دوستی اور وضعداری نے متاثر کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب رہنے لگی تھی۔ ہچکیوں (فواق) کا عارضہ تھا۔ ذیابیطس کی شکایت بھی ایک زمانے سے تھی جس نے جسم گھلا دیا تھا۔ آخری ایام میں بینائی گھٹی بہت

کمزور ہوگئی تھی۔ ان سب عوارض کے باوجود یہ گمان تک نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب آگیا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں کسی مجلس میں نظر آجاتے تھے۔ درحقیقت انھیں کوئی خاص شکایت بھی نہیں تھی۔ بس ۲۴ مئی صبح پونے سات بجے اسی خاموشی سے، جو ان کے مزاج کی افتاد تھی، ابدی سفر پر روانہ ہوگئے۔

۱۹۱۸ء میں ان کی شادی منشی لچھمن پرشاد صدر کی صاحبزادی چندر کلا دیوی سے ہوئی تھی۔ انھیں بھی شعر گوئی کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ شرم تخلص کرتی ہیں۔ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں یکے بعد دیگرے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی کوئی ہفتہ بھر کے بعد داغ مفارقت دے گئی، دوسری سال بھر کے بعد چل بسی۔ کوئی چار برس ہوئے، انھوں نے اپنے برادرِ نسبتی کے خورد سال پوتے کو گود لے لیا تھا، غرض ان کے اٹھ جانے سے علم و ادب کی وہ شمع جو پنجاہ برس سے روشن تھی، سدا کے لیے گل ہوگئی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

تصانیف

(الف) مطبوعہ: (۱) نذرِ ادب (مجموعۂ رباعیات) ۱۹۲۹ء؛ (۲) کائناتِ دل (مجموعۂ نظم) ۱۹۳۹ء (۳) کائناتِ دل (انتخابِ نظم) ۱۹۵۵ء؛ (۴) نوائے کفر (مجموعۂ غزلیات) ۱۹۶۱ء؛ (۵) ادائے کفر (مجموعۂ غزلیات) ۱۹۶۲ء؛ (۶) داد اہرد (سوانحِ نثر) ۱۹۶۱ء

(ب) غیر مطبوعہ: (۱) سوزِ وطن (قومی نظموں کا مجموعہ) (۲) جگر پائے لخت لخت (نظموں کا مجموعہ) (۳) ریزۂ گل (مجموعۂ رباعیات) (۴) تاثراتِ منور (نظموں کا مجموعہ) (۵) چراغِ دیر (۶) صنم خانہ؛ (۷) مہرِ منور (غزلوں کے تین مجموعے) (۸) زعفران زار (مزاحیہ کلام) (۹) شگفتہ عقیدے؛ (۱۰) شعری خاکے؛ (۱۱) خون کے آنسو (نوحے) (۱۲) دشوو دیدنا (منظومات)، (۱۳) طوافِ عجم، (فارسی کلام کا مجموعہ)؛ (۱۴) معروضات (نثری مضامین کا مجموعہ)

۲۔ تراجم:

(الف) مطبوعہ: (۱) رامائن والمیکی (نثر) ۱۹۳۱ء (۲) بھگوت گیتا موسومہ نسیم عرفان (منظوم)

(۱۹۳۶ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۱ء) (۳) کمارسمبھو۔ منظوم (۱۹۵۲ء) (۴) دھمپد یا سچی راہ۔ منظوم (۱۹۵۴ء) (۵) درگا سپت شتی۔ منظوم (۱۹۵۵ء) (۶) وجدانِ حافظ۔ منظوم (۱۹۵۶ء)، (۷) گنجینۂ رموز کشش۔ منظوم (۱۹۵۶ء) (۸) اودھوت کا ترانہ۔ منظوم (۱۹۵۶ء) مدرارا کھشش ڈراما (۱۹۵۸ء) (۱۰) روحانی مکالمہ۔ منظوم (۱۹۶۰ء) (۱۱) ننکن نے کہا۔ نثر۔ (۱۹۶۰ء) (۱۲) ذرّے سے آفتاب۔ نثر (۱۹۶۱ء) (۱۳) ایلینز روزویلٹ۔ نثر (۱۹۶۲ء) (۱۴) ساگر سنگیت۔ نثر (۱۹۶۲ء) (۱۵) گیتا تجلی۔ نثر (۱۹۶۳ء) (۱۶) شکنتلا۔ نظم و نثر (۱۹۶۳ء) (۱۷) گیت گووند۔ منظوم (۱۹۶۴ء) (۱۸) سمندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے: نثر (۱۹۶۸ء) (۱۹) فاؤسٹ۔ منظوم (۱۹۶۹ء) (۲۰) آریہ ابھودے منظوم (۱۹۶۹ء) (۲۱) سوزِ اقبال۔ منظوم (۱۹۷۰ء)

(ب) غیر مطبوعہ: (۱) چارودت (سنسکرت ڈراما)، (۲) صہبائے دوام (رباعیاتِ عمر خیام)، (۳) تعبیر منظوم (قرآن کریم کی کچھ سورتوں۔ کے مطالب منظوم) (۴) گیتا تجلی (منظوم) (۵) افکارِ بلند (مشاہیر کے اقوال کا منظوم ترجمہ)؛ (۶) الہاماتِ ایرانی۔ (۷) یوگ سار (جین دھرم کے مقدس صحیفے کا منظوم ترجمہ)؛ الہاماتِ مغرب (انجیل کے کچھ حصّوں کا منظوم ترجمہ؛ (۹) نالۂ بیکس (تلسی داس کی بنے پتر کا نثری ترجمہ) (۱۰) سری روپ کلا (بہار کے ایک باکمال بھگت کی سوانحعمری کا نثری ترجمہ) (۱۱) مالویکا گن متر (کالی داس کے ناٹک کا ترجمہ) (۱۲) مالتی مادھو (بھوبھوتی کے ناٹک کا ترجمہ) (۱۳) میری یادداشتیں۔ نثر (خود نوشت)

(ج) نامکمل تراجم: (۱) رگھوونش (کالی داس) منظوم؛ (۲) رام کتھا یا رامائن۔ منظوم۔

اب کچھ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو!:۔

ہوگا اب اس سے اور سوا کیا کرم ترا! — ہے خوش نصیب جس کو میسّر ہے غم ترا!

ہوتا ہے کچھ عجیب ہی عالم غریب کا — کرتے ہیں ذکر جب بھی منوّر سے ہم ترا

کاہشیں لے اڑیں فراغ اپنا — دل کا دشمن بنا دماغ اپنا
کیوں کریں دل کسی کا افسردہ! — کیا دکھائیں کسی کو داغ اپنا

ہے کچھ اگر سلیقہ، ہے کچھ اگر قرینا — مرنے کی طرح مرنا، جینے کی طرح جینا

بُرا دیکھ لینا، بھلا دیکھ لینا — دکھائیں جو ارض و سما، دیکھ لینا
یہ دنیا سلامت، یہ آنکھیں سلامت — جہاں اس کی ہو انتہا، دیکھ لینا
نہیں بے صدا، گو ابھی سازِ ہستی — یہ ہو جائیگا بے صدا، دیکھ لینا

بلائے جانِ عنادل، ہے برق و باد کا خوف — سکوں نہ پھر بھی ملا، آشیاں بنا تو لیا

گنہگاری کی نیت کو گنہگاری نہیں کہتے — سفر کے قصد سے ہوتی ہے کب گردِ سفر پیدا!

ضابطے سے ثواب کیا ہوتا — قاعدے سے گناہ بھی نہ ہوا
دوستی کا تو خیر ذکر ہی کیا — دشمنی کا نباہ بھی نہ ہوا

اب اس سے ضبط کی ناکامیابیوں کا شکوہ کیا؟ — دل اس کا اہل نہ تھا، دل کو غم نہ دینا تھا

یہ مجھ کو دیکھ کے آنکھیں جھپک گئیں کس کی! — مرے فسانۂ دل پر یہ کس نے صاد کیا؟

یہ زندگی کا سفر بھی ہے کچھ عجیب سفر — قدم قدم پہ مقامات آئے ہیں کیا کیا!

سینکڑوں جلوہ نمائی کے نکالے انداز — سامنے آپ سے لیکن کبھی آیا نہ گیا

روزِ جزا کا ہو جو کوئی منتظر، تو ہو — ورنہ کھلی ہیں خلد کی راہیں ہزار آج

ہر ایک رسم کی، ملت کی، توڑ دی ہیں قیود — نہیں، نہیں، کہیں میری نظر نہیں محدود
نہ ہے نشستِ مصلّے، نہ گردشِ تسبیح — نہ میں رکوع میں شامل، نہ میں شریکِ سجود
مری نظر سے چھپا ہے تمام بسترِ خاک — مری نظر سے ہے پیدا تمام چرخِ کبود
منافقوں کا بھی حامی ہوں، دوستوں کا بھی دوست — کھلی ہے میرے لیے ہر طرف رہِ بہبود
مرا مآلِ متوّر! نہ جانے کیا ہوگا — نہ ہندوام، نہ مسلماں، نہ کافرم، نہ یہود

تا کجا پاؤں میں زنجیرِ گراں یہ آخر! — تا کجا سلسلۂ عمرِ رواں یہ آخر!

تا کجا فکرِ کم و بیش میں بربادیِ عمر! / تا کجا مسئلۂ سود و زیاں یہ آخر!

تا کجا ہستیِ بیبود میں یہ طولِ امل! / تا کجا خواہشِ اسبابِ جہاں یہ آخر!

تا کجا یہ چمن آرائیِ جذباتِ حسیں! / تا کجا تازگیِ فکر و بیاں یہ آخر!

تا کجا تم کو گوارا یہ، منوّر! توہین / تا کجا بہرِ طلب خونِ زباں یہ آخر!

یہ کہہ رہے تھے فرشتوں سے میکدے والے! / "ابھی جناب منور ادھر سے گزرے ہیں"

دنیا کی عشرتیں ہوں کہ عقبیٰ کی راحتیں / تم پاس ہو اگر، تو مرے پاس کیا نہیں!

خدا پرست بھی ہیں، کچھ خدا نواز بھی ہیں / خدا کے واسطے صورت گروں کو دیکھو تو!

یہ حرف و شکل کے قائل ہیں کس قدر بیباک / خدا سے کھیلتے ہیں، کافروں کو دیکھو تو!

لازم ہے کچھ گناہ کی عظمت کا پاس بھی / اتنا گناہ کر کے، کوئی منفعل نہ ہو

ہم نے دریاؤں کو بیتاب ہی دیکھا ہے مدام / دل جو ہو سیر، وہ محرومِ فراغت کیوں ہو؟

الٰہی! خیر، کیا کوئی مصیبت آنے والی ہے؟ / جو اک دنیا سے کھنچتا ہو، وہ مجھ پہ مہرباں کیوں ہو؟

مری صبح وابستۂ شام کیوں ہو؟ / مری سعی کو فکرِ انجام کیوں ہو؟

شکایت کی حد تک شکایت بجا ہے / شکایت ہیں، پہلوے الزام کیوں ہو؟

جو ہو صبحِ حسرت، جو ہو شامِ حرماں / مری صبح کیوں ہو، مری شام کیوں ہو؟

تم سے ممکن ہو گفتگو نہ اگر / میرے منہ میں زبان ہی کیوں ہو؟

جس کے سننے سے ہو تمھیں انکار / وہ مری داستان ہی کیوں ہو؟

ان خوش نوائیوں سے منوّر حصول کیا / کچھ مغز بھی سخن میں ہو طرزِ ادا کے ساتھ

درد کی نعمت سے محرومی نہیں درمانِ درد / کر رہے ہیں دوست بیدردی بھی غمخواری کے ساتھ

کیا کریں گے اے منوّر! چارہ گر میرا علاج / ہیں نہ جانے روگ کتنے، دل کی بیماری کے ساتھ

نہ آگ دل میں بھڑکتی رہے اگر ہر وقت / نہ دوستی کا مزہ ہے، نہ دشمنی کا مزہ

ہے شرط سجدے سے بے نیازی، دگرنہ معلوم سرفرازی
جبیں سے دھولے جو ہاتھ اُس کو اجازتِ بندگی ملیگی

ہے دل کا رونا غضب کا رونا، اسے چھپانا ہے سخت مشکل
ہزار آنکھیں ہوں خشک، پھر بھی پلک پلک میں نمی ملیگی

تاثرات کی رادھا کا عکس پڑنے سے
تخیلات کی جمنا حسین ہے کتنی!

جمالِ دلنشیں کی شانِ رعنائی نہیں جاتی
بکثرت گو ہیں جلوے پھر بھی یکتائی نہیں جاتی

بتاؤں کیا کہ غرض کیا سفر میں رکھتا ہوں
یہی بہت ہے کہ منزل نظر میں رکھتا ہوں

ذرا سنبھل کے منوّر! ہے مرحلہ نازک
خودی کے جوش میں آکر، خدا نہ ہو جانا

چاند سورج ہیں، یا ستارے ہیں
یہ خد و خال سب تمھارے ہیں
ان کی تفسیر کیا کرے کوئی
کتنے خاموش یہ اشارے ہیں
سبزہ و گل نے کروٹیں لے کر
نقش کتنے حسیں ابھارے ہیں

رکھ لیا غیرتِ ناموسِ جنوں کا پردا
نہ بیاباں سے پلٹ کر کبھی گھر تک پہنچے
جو شکل چاہتے تھے، منوّر! نہ بن سکی
کچھ دل سے، کچھ نگاہ سے بھی کام لے لیا

تلخ ہونے پہ بھی غمِ دل کی دوا ہے تو سہی
خواہ مر مر کے ہو جینے کا مزا، ہے تو سہی

پڑھ کے افسانۂ دل کیوں چپ ہو؟
کوئی مطلب تو عبارت کرتے
تم کو تردید سے اُلجھن ہوتی
ہم جو اظہارِ محبت کرتے
کفر سے دین کی عظمت بڑھتی
عشق کو جزوِ عبادت کرتے
اور بھی دل کو اذیت ہوتی
تم سے کیا ذکرِ مصیبت کرتے
تم مخاطب ہو، تو کھولی ہے زباں
ہم تو اس کی بھی نہ جرأت کرتے

شاعری وحی ہے، الہام سے آگے نہ بڑھی
اک قدم بھی روشِ عام سے آگے نہ بڑھی
کارفرمائیِ معمارِ تخیّل کیا ہے؟
کوئی تعمیر در و بام سے آگے نہ بڑھی

وقت کی رَو تھی بہر حال حدوں کی پابند — اک قدم بھی سحر و شام سے آگے نہ بڑھی
صرف مرغانِ گرفتار پہ ڈھانا تھا ستم — ایک بجلی بھی رگِ دام سے آگے نہ بڑھی
داستاں جب بھی دلِ زار نے اپنی چھیڑی — ذکرِ بے مہریٔ ایام سے آگے نہ بڑھی

رہ گیا کعبۂ دیں اس سے منوّر ہو کر محروم
دلبری حلقۂ اصنام سے آگے نہ بڑھی

○

ضیاء القادری بدایونی، مولوی محمد یعقوب

خدا کی شان، میں نے ابھی پچھلے شمارے ہی میں شکیل بدایونی کے حالات میں ضمناً مولانا ضیاء القادری بدایونی کا ذکر کیا تھا، اور لکھا تھا کہ معلوم نہیں، وہ کس حال میں ہیں، اور زندہ بھی ہیں یا اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس کے چند ہی دن بعد خبر موصول ہوئی کہ ان کا ۱۵ر اگست ۱۹۷۶ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ بلحاظ کمیت ان سے بڑا لغت گو، اردو تو درکنار، کسی اور زبان میں بھی مشکل ہی سے ہوا ہوگا۔

ان کا نام محمد یعقوب تھا۔ ۲۷ رجب ۱۳۰۰ھ (۳ جون ۱۸۸۳ء) کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ "محمد فضل الرحمن" تاریخی نام ان کے خالو مولانا علی احمد خاں اسیر بدایونی نے رکھا تھا اور دوسرا "صغیر" ان کے والد نے۔ ان کے والد شیخ یاد حسین بدایوں کے مشہور ملا خاندان کے فرد تھے۔ ان کے بزرگوں میں اکبری دور کے مشہور ولی اللہ شیخ عبداللہ بدایونی کی ہستی قابل ذکر ہے۔ جن کے شاگردوں میں ملا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) کی سی نادرۂ روزگار ہستی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جیسا کہ خواجہ نظام الدین نے طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے،

یشخ عبداللہ دراصل ہندو تھے۔ ایک دن گلستان کا سبق پڑھ رہے تھے کہ اس میں رسول اسلام کا ذکر آگیا۔ استاد سے ان سے متعلق تفصیل پوچھی اور انھوں نے جو مناقب بیان کیے، ان کے سننے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ پھر اپنی ریاضت سے علم و فضل اور ورع و تقویٰ سے وہ مقام حاصل کیا کہ خلق خدا نے ان کی برگزیدگی کا اعتراف کیا۔

محمد یعقوب کوئی چار سال کے تھے کہ ان کے والد راہگرائے عالم جاودانی ہو گئے (۲۶ شوال ۱۳۰۴ھ) اس کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت اپنے خالو اسیر کے زیر سایہ ہوئی۔ اسیر کی جسمانی اولاد صرف ایک بیٹی تھی؛ انھوں نے محمد یعقوب کو اپنے بیٹے کی طرح پرورش کیا! انھوں نے غالباً فارسی بھی اسیر سے پڑھی تھی۔ پھر دارالعلوم شمسیہ، بدایوں میں باقاعدہ تعلیم پائی۔ ۱۸۹۷ء میں اردو مڈل پاس کیا۔ اس کے بعد چچا کے ساتھ برما گئے اور وہاں چار سال تک محکمۂ سروے میں رہے۔ واپسی پر محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ اسی سلسلے میں مدتوں گنّور میں مقیم رہے۔ سب سے آخر ۱۹۱۳ء میں بدایوں تحصیل میں بطور رجسٹرار گرداور قانونگو تعینات ہو گئے تھے۔ اگرچہ مشاہرہ کچھ زیادہ نہیں تھا؛ لیکن طبیعت قانع اور سادہ پائی تھی؛ اسی میں صبر و شکر سے بسر کرتے رہے اور یہیں سے بالآخر ۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو سبکدوش بھی ہوئے۔

اسیر نے انھیں ۱۰۔ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مولانا عبدالقادر بدایونی کا مرید کرا دیا تھا۔ جب ان کا وصال ہو گیا، تو انھیں کے فرزند رشید مولانا عبدالمقتدر قادری سے تجدید بیعت کی شعر میں مشورہ بھی اسیر ہی سے رہا۔ اسیر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے، اور نعت پر خاص توجہ تھی۔ ضیاء صاحب نے بھی ان کے تتبع میں عمر بھر نعت نبی یا پھر منقبت ائمہ و صحابہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض اصحاب نے اسیر کو غالب کا شاگرد لکھا ہے؛ یہ ٹھیک نہیں۔ وہ امجد حسین امجد (تلمیذ لدار علی مذاق بدایونی) کے شاگرد تھے۔ علی احمد خان اسیر کے والد جنگ باز خان بریلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں اسیر ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں پیدا ہوئے اور

ابتدائی تعلیم بھی بریلی میں پائی۔ ان کے والد ٹھیکہ داری کا کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے کام کے سلسلے میں انھیں کچھلا گھاٹ پر قیام کرنا پڑا، جو بدایوں سے ۱۷۔۱۸ میل دور ایک قصبہ ہے۔ اس دوران میں ان کی بدایوں کی آمد و رفت بہت ہو گئی اور بالآخر انھوں نے بدایوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسیر کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی۔ سب سے آخر میں مدرسۂ عالیہ، رامپور میں مولانا عبدالحق خیر آبادی (ف ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء) سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کی۔ تعلیم کے بعد انھوں نے اولاً ایک صاحب کی شرکت میں بدایوں میں "مطبع نسیم سحر" قائم کیا، اور یہاں سے اسی نام کا اخبار بھی نکالنے لگے۔ جب ۱۸۸۱ء میں محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل گئی، تو مطبع اور اخبار اپنے شریک کار کے حوالے کر کے الگ ہو گئے۔ اسیر اپنی ملازمت کے پورے زمانے میں بدایوں سے باہر نہیں گئے، اور یہیں سے ۱۹۱۳ء میں پنشن پائی۔ پھر اسی سال آگرے کے سینٹ جونس کالج میں عربی پڑھانے پر مقرر ہو گئے؛ یہاں وہ ۱۹۲۵ء تک رہے۔

۱۹۲۷ء میں حج کے لیے گئے۔ انھیں ایک زمانے سے روضۂ نبوی کی زیارت کی تمنا تھی، چنانچہ حج کے بعد مدینہ منورہ پہنچے اور دل کی مراد پائی۔ آٹھ دن بعد پنجشنبہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۷ء (۲۰ محرم ۱۳۴۶ھ) کو عین نماز میں اپنے خالق کے حضور پہنچ گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

جناب ضیاء القادری ہی نے تاریخ کہی۔

کہیے ضیاءؔ! سالِ وصالِ جناب
خاتمہ بالخیر ہوا بے حجاب

(۱۹۲۷)

بہت سا کلام نظم و نثر، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اپنی یادگار چھوڑا۔ ان میں ایک کتاب مشہور مورخ عبدالقادر بدایونی کی سوانح عمری بھی تھی۔ ضیا صاحب کو رجب کی ولادت ہونے کے باعث رجبی تشریف منانے کا خاص شوق تھا۔ اپنے میلانِ طبع کی تسکین کے لیے وہ ہندستان میں

جہاں جہاں بھی اولیا اللہ کے مزار ہیں، وہاں عُرس کے موقع پر حاضری دیتے رہتے تھے۔ بلکہ اسی دُھن میں وہ عراق بھی گئے اور یہاں نجف، کاظمین اور کربلا میں عتبات عالیہ کی زیارت سے شرفیاب ہوئے؛ حج بھی کیا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے، اور کراچی میں مستقل طرح اقامت ڈال دی۔ یہاں انھوں نے ایک انجمن "مجلس شیدائیان نبی" کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کا مقصد میلاد النبی، معراج النبی، یوم خلفائے راشدین، یوم شہید کربلا اور بزرگان دین کے عرس کے موقعے پر جلسے کرنا تھا۔ ان اجتماعوں کے ساتھ نعتیہ اور منقبتی مشاعرے بھی منعقد کرتے رہتے تھے۔ اس سے لوگوں میں شعر و شاعری سے دلچسپی کے علاوہ دینی شغف و شعور بھی پیدا ہوا۔ کراچی میں ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے تلامذہ نے ایک "بزم ضیا" کی تشکیل کی تھی۔ غالباً کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔

ان کے نعتیہ کلام کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی نظم و نثر میں ہیں مثلاً دیار نبی منظوم (یعنی سفر نامۂ حج)؛ مرقع شہادت (منظوم واقعات کربلا)؛ جوابر غوث الوریٰ (منظوم سفرنامۂ عراق)؛ نغمۂ ربانی (منظوم میلاد شریف)؛ تاج مضامین (منظوم مناقب اولیائے قادریہ، بدایوں)؛ ستارۂ جنت وغیرہ۔

لیکن میری نظر میں ان کی سب سے اہم تالیف اکمل التواریخ ہے۔ اس کے دو حصے ہیں؛ پہلے میں بدایوں کے عثمانی خاندان کے علما اور بزرگوں کے حالات ہیں؛ اس طرح بہت سا مواد جو منتشر حالت میں تھا، یکجا ہو گیا اور ضائع ہونے سے بچ گیا۔ دوسرے حصے میں حضرت مولانا فضل رسول کی مفصل سوانحعمری ہے جو کتاب لکھنے کی علت غائی تھی۔ ان کی ایک اور کتاب مجموعہ ہفت احمد (بدایوں ۱۹۶۴ء) بھی قابل قدر ہے۔ اس میں بدایوں کے سات اولیاء اللہ

سے لطیفہ یہ ہے کہ ضیا نے عثمانیوں کی مدح جو کی تو اس پر ایک صدیقی کی رگ حمیت بھڑک اٹھی۔ چنانچہ قاضی فدا حسین (ف ۱۹۴۸ء) کے نام سے سیرۃ الحمید فی احوال سعید شائع ہوئی (۱۳۳۳ھ)

کا ذکر ہے جن کے نام کا جزو احمد ہے۔

یادگارِ جسمانی ایک بیٹی اور ایک بیٹا یوسف حسن نوز ایم اے ہیں، یہ پاکستان حکومت میں ملازم ہیں۔ قطعۂ تاریخِ وفات ان کے شاگرد صابر براری نے لکھا ہے، جس کا آخری شعر ہے!

سالِ رحلت کو ہے، صابرؔ، سبز گنبد کی صدا
"فی امان اللہ ضیاء القادری جنّت مکاں"
(۱۹۷۰ء)

ہجری تاریخ میں بھی انھیں کا مصرع ہے! آہ ولیِ زماں ضیاء القادری بدایونی (۱۳۹۰ھ)

اب ان کی مختلف رنگوں کی نظموں کا نمونہ ملاحظہ ہو!

مناجات

اے خدا، اے مالکِ کل کائنات
خالق و قیّوم، بہتر ی ذات ہے
تو نے ہی پیدا کیے ہیں مہر و ماہ
تو نے ہی پیدا کیے جنّ و بشر
تو نے مخلوقات کو پیدا کیا
از زمیں تا آسماں ہے تیرا نور
تو ہے خلّاقِ ملائک، اے کریم!
تو نے ہی پیدا کیے لوح و قلم
حور و غلماں ہیں ترے تسبیح خواں
تو نے آدم کو بنایا خاک سے
حضرتِ آدم کو یہ رتبہ دیا
منحرف ابلیس سجدے سے ہوا!

اے کریم و اے رحیم و حق صفات
روشنی ہر جا تری دن رات ہے
تیرے ہی انوار ہیں شام و پگاہ
تو نے ہی پیدا کیے ہیں بحر و بر
بزمِ موجودات کو پیدا کیا
تیرے جلوؤں کا ہے عالم میں ظہور
ہے ترا انساں پہ احسانِ عظیم
عرش و کرسی ہیں ترے زیرِ قدم
محوِ طاعت ہیں ترے سبّوحیاں
روح ڈالی اپنے نورِ پاک سے
سجدہ ان کو سب فرشتوں نے کیا
راندۂ درگاہ فوراً ہو گیا

آدم و حوّا کو جنت کی عطا — نعمتیں ان کو عطا کیں بے بہا
ہو گئے حوّا سے آدم پھر جدا — دونوں صدیوں تک رہے محوِ بکا
آخر ان کی ہو گئی توبہ قبول — پھر ہوئے شاداب یہ جنّت کے پھول
سلسلہ اولاد کا جاری ہوا — اُن پہ لطفِ ایزدِ باری ہوا
اُن سے پیدا انبیاء لاکھوں ہوئے — خلق کے جو ہادیِ موزوں ہوئے
سب سے آخر رحمۃ للعالمیں — آئے بن کر عرش کے مسند نشیں
ملتِ برحق کا چمکا آفتاب — خلق میں آئے شہِ عالیجناب
عرش سے چمکا یہ کعبے کا سراج — حق پرستی کا ہوا ہر جا رواج
دور دورہ علم و عرفاں کا ہوا — تذکرہ تعلیم قرآں کا ہوا
ملتِ حق کی ہوئی تعلیم عام — ہو گیا انساں جہاں میں نیک نام
اے خدا! جب تک رہے قائم جہاں — اے خدا! جب تک ہیں ارض و آسماں
بول بالا ملتِ حق کا رہے — جلوہ ہر جا نورِ مطلق کا رہے
ہر زباں پر تیرا نام آتا رہے — پرچم اسلام لہراتا رہے
تیری طاعت اور عبادت عام ہو — کام ہو دنیا کا تیرا نام ہو

نیکیوں کا ہو خدائی میں رواج
ہو فقط تیری حکومت، تیرا راج

نعت

امینِ کعبۂ رب، آپ پر ہزاروں سلام — شہِ حجاز و عرب، آپ پر ہزاروں سلام
مدام کرتے ہیں سب آپ پر ہزاروں سلام — ہوں آپ پر شہِ والا حسب ہزاروں سلام

سلام آپ پہ خضرِ رہِ شبِ "اسریٰ"
سلام آپ پہ شاہنشہِ شبِ "اسریٰ"

وہ آئے کعبے سے دم بھر میں جانبِ اقصیٰ
بنے امامِ رسل اور پڑھا یہاں خطبہ
سب انبیاء سے ملاقات کی یہاں نخبدا
یہاں بلند یہ نعرہ ہوا سلاموں کا

سلام آپ پہ خضرِ رہ شبِ اسریٰ
سلام آپ پہ شاہنشہِ شبِ اسریٰ

یہاں سے لے کے براق آپ کو روانہ ہوا
سرِ حضور پہ رحمت کا شامیانہ ہوا
بساطِ عرش پہ اک جشنِ خسروانہ ہوا
ادا فرشتوں کے لب سے یہی ترانہ ہوا

سلام آپ پہ خضرِ رہِ شبِ اسریٰ
سلام آپ پہ شاہنشہِ شبِ اسریٰ

کھلے حضور پہ ساتوں فلک کے دروازے
سلام شوق کے ہر آسماں پہ تھے نعرے
ادب سے اہلِ فلک اور رسول ملتے تھے
سلام کہتے تھے سب مرسلین خوش ہو کے

سلام آپ پہ، خضرِ رہِ شبِ اسریٰ
سلام آپ پہ، شاہنشہِ شبِ اسریٰ

حضور وادیٔ ہفت آسماں سے یوں گزرے
کہ جیسے نور گزرتا ہے پاک شیشے سے
ہر اک فلک پہ تھے سامان خیر مقدم کے
سب انبیاءِ گرامی سلام کرتے تھے

سلام آپ پہ، خضرِ رہِ شبِ اسریٰ
سلام آپ پہ، شاہنشہِ شبِ اسریٰ

خدا کا نور، خدا کے حضور آ پہنچا
حبیبِ پیشِ خدائے غفور آ پہنچا
قریبِ رب، شبِ اسریٰ کا نور آ پہنچا
حدِ نظر سے وہ ماہ پارہ دور آ پہنچا

سلام آپ پہ خضرِ رہِ شبِ اسریٰ
سلام آپ پہ، خضرِ رہِ شبِ اسریٰ

حجاب اٹھ گئے، وہ بے حجاب حق سے ملے — حبیبِ حق، شہ عالی جناب حق سے ملے
نقاب دور ہوئی، بے نقاب حق سے ملے — ہوا سلام، مبارک خطاب حق سے ملے

"سلام آپ پہ خضرِ رہِ شبِ اسریٰ"
"سلام آپ پہ شاہنشہِ شبِ اسریٰ"

لطافتِ شبِ "اسریٰ" کا واسطہ یارب! — جمالِ نورِ سراپا کا واسطہ یارب!
وقارِ گنبدِ خضریٰ کا واسطہ یارب! — مدینہ، کعبہ و اقصیٰ کا واسطہ یارب!

"سلام آپ پہ خضرِ رہِ شبِ اسریٰ"
"سلام آپ پہ شاہنشہِ شبِ اسریٰ"

حضورِ شاہ میں مقبول ہو سلامِ نیاز — سنو سلام، غلاموں کا اپنے، بندہ نواز!
غلام کیوں شبِ اسریٰ کریں نہ آپ پہ ناز — سنیں سلام، بلائیں حضور تا بہ حجاز

"سلام آپ پہ خضرِ رہِ شبِ اسریٰ"
"سلام آپ پہ شاہنشہِ شبِ اسریٰ"

نعت

السلام اے چراغِ عرش بریں! — فخرِ کون و مکاں، رسولِ امیں!
السلام، اے بنائے ارض و سما! — باعثِ خلقِ آسمان و زمیں
السلام اے مرادِ قدرتِ حق! — ہمہ تن پیکرِ جمیل و حسیں!
السلام اے نگاہِ محفلِ "کن"! — جانِ ہر علم و روحِ حسنِ یقیں
السلام، اے امامِ بزمِ رسل! — خاتم الانبیائے با تمکیں
السلام، اے تجلیِ "و الشمس"! — "والضحیٰ" تیرا عکسِ لوحِ جبیں
السلام اے محمدِ عربی! — از ازل تا ابد حقیقتِ دیں

السلام، اے فروغِ بخشِ حیات! | تاجِ عرفان و معرفت کے نگیں
السلام، اے رفیقِ غمزدگاں! | خستہ جانوں کے محسن اور معین

آپ سرمایۂ ہدایت ہیں | آپ عنوانِ لطف و رحمت ہیں
آپ ہیں تاجدارِ مخلوقات | آپ بنیادِ آدمیت ہیں
آپ کے مقتدی تمام رسول | آپ سرچشمۂ رسالت ہیں
آپ پیغمبرِ خلیق و شفیق | قاسمِ دولتِ شرافت ہیں
آپ پر ہے مدارِ حسن و جمال | عشق کی جاودان حقیقت ہیں

در پہ آئے ہیں دادِ غم پانے | منزلِ معرفت کے فرزانے
آپ کے روئے پاک کے شیدا | گیسوئے عنبریں کے دیوانے
تلخ ہے جن کی داستانِ حیات | عبرت آگیں ہیں جن کے افسانے
ہو چکے ہیں الم سے چکنا چور | راحتِ زندگی کے پیمانے
روز آتی ہے گردشِ ایام | رہروانِ وفا کو بہکانے
جن کو اپنا خیال کرتے تھے | بنتے جاتے ہیں سب وہ بیگانے
زخم خوردہ ہے پیکرِ ہستی | داغ اتنے دیے ہیں دنیا نے
خارزاروں میں ہو گئے تبدیل | روح کے لالہ زار کاشانے
گوشہ گوشہ میں بن گئے دل کے | کفر و باطل کے لاکھ بت خانے

المدد، المدد، رسولِ انام
مٹ نہ جائیں حضور کے یہ غلام

منقبت امیر خسرو

صدرِ سریرِ عرفاں، حضرت امیر خسروؒ
بدرِ سپہرِ ایماں، حضرت امیر خسروؒ

دلدادۂ نظامؒ و قطبؒ و فریدؒ و خواجہؒ
ظلِّ حبیبِ رحماں، حضرت امیر خسروؒ

لذت کشِ وصالِ پیرِ مغانِ سنجر
مستِ شرابِ عرفاں، حضرت امیر خسروؒ

تم ہو بہشت مسکن، تم خلد آستاں ہو
تم ہو جناں بداماں، حضرت امیر خسروؒ

خیرؐ البشر کی امت، خیرؐ البشر کے شیدا
قدسی صفات انساں، حضرت امیر خسروؒ

صہبائے سنجری کا اک دَور ہو ادھر بھی
اے پیرِ بزمِ رنداں، حضرت امیر خسروؒ

شیدائے حسنِ ذاتِ محبوبؒ پاک، یعنے
نوشاہِ جیشِ خوباں، حضرت امیر خسروؒ

کیخسروِ جہانِ شعر و ادب، مسلّم
میرِ صفِ سخنداں، حضرت امیر خسروؒ

عالم، ولی۔ مشائخ۔ عارف، ادیب، شاعر
سب آپ کے ثنا خواں، حضرت امیر خسروؒ

احسانِ سلطنت کے مانے ہوئے معلّم
فطرت شناسِ شاہاں، حضرت امیر خسروؒ

مدحت نگارِ خواجہؒ، یعنی ضیائے بیکس
غربت میں ہے پریشاں، حضرت امیر خسروؒ

○

ماچس لکھنوی، میرزا محمد اقبال

گذشتہ ۲۶ اگست کو مشہور مزاح نویس ماچس لکھنوی کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا، اور یوں ہماری بزم شعر و ادب سے ایک باغ و بہار شخصیت اٹھ گئی۔

مرحوم کا پورا نام میرزا محمد اقبال تھا۔ اسی لیے لوگ عرف عام میں انھیں ایم ایم اقبال بھی کہتے تھے۔ اپنے آبائی مکان محلہ کاظمین گیٹ میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب اودھ کے شاہی خاندان سے ملتا ہے۔

سلطنت اودھ کے تیسرے فرمانروا محمد علی شاہ تھے۔ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے امجد علی شاہ تخت پر بیٹھے، اور ان کے بعد واجد علی شاہ، جنھیں انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے کلکتے بھیج دیا اور اودھ کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی پر سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو گیا۔ رہے نام اللہ کا۔

محمد علی شاہ کے امجد علی شاہ کے علاوہ بھی متعدد اولادیں تھیں۔ ان میں دو بیٹے میرزا رفیع الشان اور میرزا فرخندہ بخت بھی تھے۔ میرزا فرخندہ بخت کے پوتے میرزا مہدی حسین (ابن میرزا رضا علی) ماچس کے والد تھے۔ دوسرے شاہزادے میرزا رفیع الشان کے بیٹے میرزا ابراہیم علی

عیش تخلص کی بیٹی (سلطان جہان بیگم) میرزا مہدی حسین کے عقد نکاح میں تھیں۔ یہی ماچس کی والدہ تھیں، گویا ابراہیم علی عیش ان کے نانا تھے

ایک تو شاہی خاندان میں اولاد کی کثرت تھی ہی، اس پر زمانے کا رواج بھی کچھ ایسا ہی تھا؛ غرض شاہزادوں کی تعلیم کی طرف سے بہت غفلت برتی جاتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ اگر کسی کو اردو میں شُد بُد ہو گئی، یا قرآن کا ایک آدھ پارہ ناظرہ پڑھ لیا، تو گویا تعلیم کی معراج حاصل کر لی۔ لڑکوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ انھیں کہیں نوکری یا کوئی پیشہ تو اختیار کرنا نہیں تھا، اس لیے شاہی خاندان کے بچے عام طور پر جاہل رہتے تھے۔ اس ماحول کے برخلاف عیش کو پڑھنے لکھنے سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اساتذہ سے عربی اور فارسی کی معقول تعلیم حاصل کی۔ خیر، یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے طب پڑھنے پر توجہ کی۔ جب اس کی خبر ان کے والد میرزا رفیع الشان کو ملی، تو وہ بہت خفا ہوئے کہ ہمارا بیٹا ہو کر طب پڑھنا کیا معنی! یہ تو ہماری شان ریاست کے منافی ہے۔ میرزا ابراہیم علی نے اس کے باوجود چوری چھپے اپنی تعلیم جاری رکھی اور رفتہ رفتہ اسے مکمل کر لیا۔ جب رفیع الشان کو معلوم ہوا کہ صاحبزادے نے میرے کہے کی پروا نہیں کی اور حکیم بن گیا ہے تو حکم دیا کہ آج سے ابراہیم کبھی ہمارے سامنے نہ آئے، ہم اس مردود کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے؛ اس نے طبابت کا پیشہ اختیار کر کے ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے نام کو بٹہ لگایا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد عمر بھر باپ بیٹوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور بیٹے نے صرف ان کی مٹی میں شرکت کی۔

لیکن نام بڑا اور درشن چھوٹے۔ نام کو تو یہ شاہی خاندان تھا، لیکن درشنوں کا یہ حال تھا کہ جب رفیع الشان کا انتقال ہوا ہے تو ابراہیم علی کو ستائیس روپے اور کچھ آنے وثیقے کے ملے اور تیس روپے کی پولٹیکل پنشن باپ کے ترکے میں سے ملی؛ لے دے کے کل ستاون روپے۔ ان کا ذریعۂ معاش طبابت کا پیشہ تھا۔ اگر یہ نہیں ہوتا، تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ کیا گذرتی۔

عیش اپنے زمانے میں خاصے مشہور رہے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں رحلت کی۔ اچھی لمبی عمر پائی۔ وفات کے وقت ۹۰۔ ۹۵ برس سے کم کے نہیں ہونگے۔

ماچس کے والد میرزا مہدی حسین نے عین جوانی میں ۱۹۴۹ء میں انتقال کیا۔ محدود ذرائع معاش کے باعث، فراغت کا تو کیا ذکر، گذراوقات بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے بچّوں کی معقول طریقے پر تعلیم بھی نہ ہوسکی۔ ماچس بھی مدرسے میں ٹدل سے آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ محلّہ نوبستہ کے اسکول میں پڑھتے رہے، جو ان کے مکان کے بالکل قریب تھا۔ اس کے بعد کچھ انگریزی کی شد بد گھر پر، اور عربی فارسی اپنے نانا میرزا ابراہیم علی عیش سے پڑھی لیکن دونوں سے واقفیت ادھوری رہی۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک عیش کبرسنی کے باعث مضمحل ہو چکے تھے اور زیادہ محنت کے قابل نہیں رہے تھے۔

۱۳،۱۴ برس کا سن تھا، جب ماچس کو شاعری کی چیٹک لگی، اور اس میں وہ انور حسین آرزو لکھنوی مرحوم (ف ۱۹۵۱ء) کے فارغ الاصلاح شاگرد داغؔ صاحب وقار سے مشورہ کرنے لگے، جو انھیں کے محلے میں رہتے تھے۔ وہ ابتداءً اقبال تخلص کرتے تھے، اور سنجیدہ غزلیہ کلام کہتے اور مشاعروں میں سناتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں وقار کا انتقال ہو گیا۔ اس کے کچھ دن بعد آرزو صاحب کلکتے سے واردِ لکھنؤ ہوئے، تو ماچس ان کی خدمت میں حاضر ہوئے؛ وقار سے اپنے تلمذ کا ذکر کیا اور ان سے اصلاح کی درخواست کی۔ آرزو نے کلام پر اصلاح دینا منظور کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جتنے دن لکھنؤ میں ہوں، شوق سے آؤ، لیکن میری عدم موجودگی میں سید آلِ رضا ایڈووکیٹ (تلمیذ آرزو؛ حال مقیم کراچی) سے مشورہ کرو کیونکہ خط و کتابت کے ذریعے سے نہ مکمل استفادہ ممکن ہے، نہ کلام پر اصلاح ہی نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔

سید آلِ رضا سے یہ تعارف ماچس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ ان کی وساطت سے یہ انجمن بہارِ ادب لکھنؤ کے رکن بن گئے، جس سے ادبی حلقوں سے ان کی شناسائی کا دائرہ وسیع تر

ہو گیا۔ اسی زمانے میں آل رضا صاحب یتیم خانے کے سکریٹری مقرر ہو گئے، تو انھوں نے ماچس کو یتیم خانے کے لیے کمیشن پر چندہ جمع کرنے کا کام سپرد کر دیا۔ جب تک آل رضا سکریٹری رہے یہ کام ان کے پاس رہا؛ بلکہ شاید ان کے الگ ہونے کے بعد بھی کوئی سال بھر یہ کام کرتے رہے۔ غالباً ۱۹۴۴ء میں ماچس کانپور کی مشہور ہارنس فیکٹری میں ملازم ہو کر وہاں چلے گئے۔ یہاں کی نوکری دو سال رہی۔ اس کے بعد راشن کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ جب یہ محکمہ تخفیف میں آ گیا، تو اپریل ۱۹۴۸ء میں سیلس ٹیکس کا محکمہ قائم ہوا، اور راشن والے بیشتر ملازموں کو اس میں جگہ دی گئی۔ چنانچہ ماچس بھی جون ۱۹۴۸ء میں اس دفتر میں عارضی ملازم ہو گئے۔ مشکل یہ تھی کہ مستقلی اس وقت تک ممکن نہیں تھی، جب تک ان کے پاس ہائی اسکول کا سرٹیفکٹ نہ ہو۔ ماچس (اور ان کے بعض اور ساتھیوں نے بھی) خاص طور پر انگریزی سیکھنے کا انتظام کیا اور بورڈ کے امتحان میں بیٹھے اور یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ یوں ۱۹۵۶ء میں وہ ملازمت میں مستقل ہو گئے۔ وہ کانپور میں ۱۹۶۱ء تک رہے اور اس سال والدہ کے اصرار پر لکھنؤ تبادلہ کرا لیا۔ والدہ کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔

آرزو اور ان کے تلامذہ کی فنی مہارت مسلمہ ہے اور اس کا سب نے اعتراف کیا ہے۔ وقار اور آل رضا کے علم و فضل سے ماچس نے بھی استفادہ کیا اور فن عروض و شعر میں خاصی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ لیکن بہت جلد اپنی طبیعت کے اقتضا سے وہ اقبال سے ماچس ہو گئے۔ اور مزاحیہ رنگ میں کہنے لگے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ کسی مشاعرے میں طرح ہوئی؛ دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟ جب کسی نے یہ مصرع اقبال صاحب کے سامنے پڑھا، تو انھوں نے گرہ لگا کر اسے یوں پورا کیا:

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے
حلق تک آ کے جھانکتا کیا ہے!

اس پر ان کے برادرِ بزرگ میرزا محمد عزیز معزز لکھنوی نے کہا کہ تم اپنی غزل اسی مزاحیہ رنگ

یں مکمل کرو اور مشاعرے میں پڑھو۔ اس کامیابی پر وہ مستقلاً مزاحیہ شاعر ہو گئے۔
انھوں نے کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں کیا، غالباً باقاعدہ بیاض بھی نہیں رکھی۔ حافظہ
اس بلا کا تھا کہ جو کچھ کہا، ازبر تھا۔ دوست احباب کی مجلسوں میں گھنٹوں اپنا کلام سناتے اور
کہیں غلطی نہیں کرتے تھے۔ مدتوں ان کی نظمیں اودھ پنچ (دورِ ثانی) اور شوکت تھانوی
کے سرپنچ میں چھپتی رہیں۔ شوکت مرحوم ہمیشہ ان کے نام کے ساتھ ظریف الملک کا خطاب لکھا
کرتے تھے۔

انھوں نے بعض مشہور نظموں کی کامیاب پیروڈی لکھی ہے مثلاً ان کی اقبال کے شکوہ کی پیروڈی
"شکوۂ شکّر" معرکے کی چیز ہے، اس میں راشن کے زمانے میں شکّر کی قلّت کی شکایت کی
ہے۔ چاند کا ریڈیو اسٹیشن، مہنگائی، خاندانی منصوبہ بندی بھی ان کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔
ان کا کچھ سنجیدہ کلام بھی ہے، خاص طور پر نوحے اور سلام۔ ان میں وہ بہت متین رہے
ہیں۔ موضوع کی سنجیدگی کے پیشِ نظر ان میں مزاح بیمحل بھی ہوتا۔ اس کلام میں تخلص
سوختہ کیا ہے۔

ان کے احباب کو فوراً توجہ کرنا چاہیے، منتشر کلام یکجا کر کے چھاپ دیا جائے۔ طنزیہ مزاحیہ
شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ہماری زندگی کی جو افتاد ہے اور کشمکش حیات جس رفتار
سے تیز و تند ہوتی جا رہی ہے، اس کے پیشِ نظر اب کسی اچھے مزاح نگار کے پیدا ہونے کی امید
کم ہے۔ اس لیے یہ ادب کی خدمت ہوگی کہ جلد ان کا کلام محفوظ ہو جائے۔ طنزیہ اور رمزاحیہ
شاعری کے لیے بڑے سلیقے اور فطری اور جذباتی ضبط کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے اسی کا ہمارے
ہاں فقدان ہے۔ اگر شاعر کو اپنے اوپر قابو نہیں ہے، تو اس کا ابتذال کی طرف مائل ہو جانا
لابُد ہے۔ ماچس مرحوم کے مزاج میں بڑی سنجیدگی اور شگفتگی اور پختگی ہے اور ان کا کلام بہت
پُر وقار ہے۔ اردو ادب کی یہ نہایت بدقسمتی ہو گی، اگر یہ ضائع ہو گیا۔

پچھلے جون میں انھیں کینسر ہو گیا۔ دو تین مہینے بہت تکلیف میں گذرے۔ آخر وقت موجود

آگیا اور وہ ۷۵ سال کی عمر میں ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء شام آٹھ بجے راہی ملکِ بقا ہو گئے۔ انھوں نے شادی اچھی بڑی عمر میں ۱۹۶۴ء میں کی تھی اپنے پیچھے بیوی کے علاوہ تین بالکل خورد سال بچے (دو لڑکے اور ایک لڑکی) جسمانی یادگار چھوڑے۔ اگلے دن کربلائے امین الدولہ (لکھنؤ) میں آخری خوابگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے بھتیجے فرخ نواب سگار لکھنوی نے تاریخ کہی ہے!

مصرع تاریخ ہجری میں یہ لکھ دو لے سگار!

"سکنۂ خلد بریں اقبال ماچس لکھنوی" (۱۳۹۰ھ)

نمونۂ کلام میں سب سے پہلے "شکوۂ شکرّ" ہی دیکھیے، جو اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" کی پیروڈی ہے:

کیوں نمک خوار بنوں، زود فراموش رہوں — فکر زردہ نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
گڑ کے طعنے بھی سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں — ہمنشیں میں کوئی مردہ ہوں کہ خاموش رہوں

نفع اندوزوں سے الفت کی جلن ہے مجھ کو
شکوہ شکرّ سے یہ خاکم بدہن ہے مجھ کو

خاص درجے کے مٹھاسوں میں تو مشہور ہیں ہم — اب کہ چینی سے مرتبے سے بھی مجبور ہیں ہم
مرتباں کہتے ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم — نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے شکر! شکوۂ اربابِ غذا بھی سن لے
تلخ کاموں سے ذرا اپنا گلہ بھی سن لے

تجھ سے بیگانہ تھے، سلجوق بھی، تورانی بھی — اہل چیں چین میں، ایران میں ایرانی بھی
تھے بڑے شہرۂ آفاق تو یونانی بھی — ایک سے ایک یہودی بھی تھے، نصرانی بھی

کی ہے ہل بیل سے کھیتوں پہ چڑھائی کس نے؟
بو کے گنّے کو، تری بات بنائی کس نے

نقشے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — ناؤ پر لاد کے بھیجا تجھے دریاؤں میں
کیک میں ڈھال کے پہنچا یا کلیساؤں میں — گاڑے جھنڈے ترے، ہر شہر میں اور گاؤں میں

کہیں فہرست میں ہوتے جو جہاندار دوں کی
تیرا دم بھرتے یونہی چھاؤں میں تلوؤں کی

اب بھی ہے دل میں ہمارے وہی سوز اور وہی ساز
جھولے ہاتھوں میں لیے صبح پہر، بعد نماز
"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

"بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے"
آکے دوکان پہ راشن کی سبھی ایک ہوئے

اور دوکان سے راشن کی جو ناکام پھرے
حسرت وصل میں ننگے ہی لیے دام پھرے
بڑی دوکانوں پہ لے کے ترا نام پھرے
مضطرب ہجر میں تیرے سحر و شام پھرے

چھوٹے چھوٹے بھی دوکاندار نہ چھوڑے ہم نے
چور بازار میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

آکے دوکانوں پہ گیہوں کے مقابل تو نے
اک اشارے پہ ہزاروں کے لیے دل تو نے
سر پھٹول کو کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمیِ دیدار سے محفل تو نے

کیا کہا؟ سینے ہمارے شکر آباد نہیں
تیرے بوروں پہ لدے ٹوٹتے تھے، کیا یاد نہیں؟

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کو کو بیٹھے
ہیں جو دوکان پہ راشن کی ہر اک سو بیٹھے
تیرے دیوانے ہیں سب منتظر ہو بیٹھے

کلکِ منشی کو پیامِ رقم افروزی دے
تولنے والے کو فرمانِ نظر سوزی دے

صنفِ نازک نے کیا فاش جو تھا ہجر کا راز
لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاق پرواز
میز اور کرسیاں ہیں مرکزِ صد ناز و نیاز
ہوٹلوں میں ہے وہ چھڑنے کو ترے نام کا ساز

چائے بیتاب ہے، بنڈل سے نکلنے کے لیے
کیتلی رکھی ہے بھٹی پہ ابلنے کے لیے

تمکلیں ہم سے شریفوں کی، تو آساں کر دے — یہ نہیں کہتے کہ ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ لذت کو بایں حال اب ارزاں کر دے — بسکہ ہر ذائقہ دشمن کو مسلماں کر دے

پھر بصد جدت باورچی دیرینۂ ما
می رسد در شکم ما زرہ سینۂ ما

میری بیگم کبھی جز بز کبھی حیران بھی ہوئیں — چائے پی پی کے نمک کی، وہ پریشاں بھی ہوئیں
"بھاڑ میں جائے شکر" کہہ کے گریزاں بھی ہوئیں — کیتلی ٹوٹ گئی، پیالیاں ویراں بھی ہوئیں

غم ہے شوہر کو کہ دولت ہوئی برباد اس کی
خوش ہیں بیگم کہ سنی کوئی نہ فریاد اس کی

چاک پھر شاعرِ بیکس کی نوا سے دل ہوں — جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
پُر ہوں بیوی کے، تو شوہر کی وفا سے دل ہوں — بدلے غصے کے محبت ہی کے پیاسے دل ہوں

مایۂ حسن اس واسطے گلِ شعلہ طرازی ہے مری
لاکھ غصہ ہے، یہ بیوی تو نمازی ہے مری

مندرجۂ ذیل نظم خمار بارہ بنکوی کی ایک نظم کی پیروڈی ہے:

بیوفائی پہ تُلو گے، مجھے معلوم نہ تھا — (۱) نام سے میرے چڑو گے، مجھے معلوم نہ تھا
گالیاں، کوسنے دوگے، مجھے معلوم نہ تھا — یوں مری قدر کرو گے، مجھے معلوم نہ تھا

کیا کہوں، میں نے محبت کی جہالت کیوں کی — (۲) کیا کہوں، طرزِ تغافل کی شکایت کیوں کی
کیا کہوں، عرضِ تمنا کی حماقت کیوں کی — یہ سوا لا رت کرو گے، مجھے معلوم نہ تھا

بات ہے کل کی، کہ پہنے ہوئے چھوٹی سی فراک — (۳) پونچھ دیتی تھی کھلائی، جو ٹپک پڑتی تھی ناک
آج یہ ڈیل، یہ ڈول، اور یہ لمبی پوشاک — نل ککڑی کے بڑھو گے، مجھے معلوم نہ تھا

یاد ہے، یاد ہے، بچپن کا وہ عالم کہ نہیں؟ — (۴) نت نئے کھیل ہوا کرتے تھے باہم کہ نہیں؟
جو کہیوں، تختوں پہ رہتی تھی دھما دھم کہ نہیں؟ — بڑھ کے اس طرح کھلو گے، مجھے معلوم نہ تھا

(۵) ایک سے ایک شرارت میں بڑھا کرتے تھے
ایک ہی مولوی صاحب سے پڑھا کرتے تھے
کھیلتے کودتے کوٹھے پہ چڑھا کرتے تھے
بات بھی اب نہ کروگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۶) بے تمھارے نہ کوئی چیز کبھی کھاتا تھا
گھر سے پیسے بھی چرا کر تمھیں دے جاتا تھا
تم جو روتے تھے، تو میں ساتھ میں رو تا تھا
میرے رونے پہ ہنسوگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۷) ہاں اگر تم سے سیانے کبھی دیکھے نہ سنے
حسن او رعشق میں رہتے ہیں ازل سے جھگڑے
داؤ خالی بھی دیے، ہاتھ بھی کچھ جھاڑ دیے
اس طرح جم کے لڑوگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۸) جس سے ہے خلق کی انگشت نمائی کا خیال
جس طرح باپ کا ڈر ہے تمھیں بھائی کا خیال
کاش آجائے یونہی وعدہ وفائی کا خیال
عہد سے اپنے پھروگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۹) آکے آغوش تمنّا میں اچھل جاؤگے
ایسے بھڑکوگے کہ بالکل ہی بدل جاؤگے
اس طرح دامِ محبّت سے نکل جاؤگے
پھر دوبارہ نہ پھنسوگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۱۰) بیٹھ کے ہاتھ سے خود اپنے سیوگے اک دن
تھی خوشی اس کی کہ تم میرے بنوگے محسن
اسی امید پہ پھاڑ اتھا گریباں، لیکن
سوئی تاگا بھی نہ دوگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۱۱) میرے ہی زیرِ علاج آنے کی حاجت ہوگی
طب پڑھی میں نے کہ تم کو جو شکایت ہوگی
ایکس رے عیر کرے، اف، یہ ضرورت ہوگی
ایسا بیمار پڑوگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۱۲) وہی آنکھوں سے، مقدّر نے دکھائی ہے گھڑی
مختصر یہ ہے کہ جس کی کوئی امید نہ تھی
آخری وقت بھی تم بیٹھ کے بالیں پہ مری
مکھیاں تک نہ جھلوگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۱۳) ہائے، مجھ کو تو جدائی نے سڑی کر ڈالا
تم کہاں ہو، یہ میں کیا کرتا ہوں تم سے شکوہ
یہ خبر ہوتی، تو واللہ میں پہلے مرتا
مجھ سے تم پہلے مروگے، مجھے معلوم نہ تھا

(۱۴) گرمیِ عشق کے موسم میں اکڑ جاؤگے
راہ پہ فلک کے بھی متھے سے اکھڑ جاؤگے
اس طرح منزلِ انکار پہ اڑ جاؤگے
اک قدم بھی نہ بڑھوگے، مجھے معلوم نہ تھا

آخر میں ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں؛

شیخ آئے جو حشر میں، تو اعمال ندارد   جس مال کے تاجر تھے، وہی مال ندارد

ماں باپ، بھائی ان کے سبھی ساتھ ہیں میرے   اب گھر مرا سسرال ہے، سسرال ندارد

معلوم کیا ان کا جو شجرہ، تو یہ پایا   کچھ یونہی سی ننھیال ہے، ددھیال ندارد

ماچس! نہ کہیں آتشِ سوزاں سے لگے آگ

ہو جائے نہ پنڈال کا پنڈال ندارد

○

سلیمان اریب حیدر آبادی

پچھلے سال بھر میں حیدر آبادی ادیبوں پر یہ موت کا تیسرا حملہ ہوا ہے۔ ہنوز مخدوم محی الدین اور خورشید احمد جامی کی دائمی مفارقت ہی سے ہمارے اوسان بجا نہیں ہوئے تھے کہ ۷ ستمبر کو سلیمان اریب کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

اریب نے نسبتاً بہت کم عمر پائی۔ ان کا صحیح نام محمد تھا اور وہ سلیمان بن عبدالرزاق کے بیٹے تھے۔ وہ ۵ اپریل ۱۹۲۲ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد یافعی قبیلے کے عرب تھے۔ بزرگوں میں کوئی صاحب حضر موت سے ہجرت کر کے حیدر آباد آگئے تھے۔ سلیمان بھی بیشتر دوسرے عربوں کی طرح حیدر آباد کی فوج (اے سی گارڈ) میں رسالہ دار تھے۔ انکی پانچ چھ برس ہوئے انتقال کیا۔ اریب کی والدہ اکوزئی پٹھان خاندان سے تھیں۔

گھر کے حالات تو جیسے تھے، وہ ظاہر ہی ہے، لیکن اریب کو کم عمری ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا اور ۱۹۴۲ء سے تو انھوں نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا ہی بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی تعلیم سے بے توجہی برتی اور دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ رہی سہی کسر سیاست نے پوری کر دی۔ وہ ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس میں قید و بند

تک کی نوبت آئی۔ اسی سال جب حکومتِ ہند نے حیدرآباد کے خلاف اقدام کیا، تو اریب نے 'مجاہدِ تلنگانہ' کے عنوان سے ایک نظم جلسۂ عام میں سنائی۔ اصحابِ اقتدار کی نظر میں یہ نظم قابلِ اعتراض ٹھہری اور وہ گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور دو برس قید کی سزا ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء میں رہا ہوئے، تو اب مقامی سیاست میں سرگرمی سے حصّہ لینے لگے، اور امن کمیٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری چنے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں حیدرآباد کے طلبہ نے زبردست ہڑتال کی تھی، اریب نے بھی اس میں جوش و خروش سے شرکت کی۔ چونکہ نقصِ امن کا خدشہ تھا، اس لیے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ بارے، اب کے دو مہینے بعد رہائی نصیب ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے مزاج میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہو گیا، اور ۱۹۵۴ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی سے بھی الگ ہو گئے۔

اریب بہت دن تک ادب اور صحافت سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۸ء میں اپنی گرفتاری سے پہلے وہ ہفتہ وار 'جمہور' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور رہائی کے بعد ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ 'چراغ' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ جون ۱۹۵۱ء میں نکلا تھا۔ اس کے کل ۱۴ شمارے شائع ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے دو سال بعد (۱۹۵۳ء میں) وہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ماہنامہ 'سب رس' کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے ماہنامہ 'صبا' جاری کیا۔ دراصل یہ پرچہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد کے تعاون سے شروع ہوا تھا، لیکن بعد کو انھوں نے اسے اپنا ذاتی پرچہ بنا لیا۔ مالی مشکلات کے باعث اس کی اشاعت میں بھی بےقاعدگی ہوتی رہی، لیکن لشتم پشتم انھوں نے اسے جاری رکھا، چنانچہ یہ ان کی موت تک شائع ہوتا رہا۔

انھیں پچھلے دو سال سے کینسر کا مہلک عارضہ لاحق تھا۔ لیکن ان کے تحمّل اور قوتِ برداشت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس سے ان کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں پار سال (مارچ ۱۹۶۹ء) کے اوائل میں غالب صد سالہ یادگار کی تقاریب میں شرکت کے لیے حیدرآباد

گیا، تو وہاں کے جلسوں میں انھیں موجود پایا۔ ابھی تین چار مہینے ہوئے، یہیں دلّی میں ایک ادبی اجتماع میں پھر ان سے ملاقات ہوئی؛ وہ آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر کسی سرکاری مشاعرے میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔

اگرچہ علاج میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن کینسر ہنوز لاعلاج ہے۔ حالت روز بروز نازک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ بالآخر انھیں حیدرآباد کے کینسر اسپتال میں داخل کر دیا گیا ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء کی شام تک وہ بظاہر بالکل ٹھیک تھے اور شب کی دوائی لے کر حسب معمول سو گئے۔ آدھی رات کے قریب طبیعت یکایک خراب ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد ساڑھے تین بجے (علی الصباح) جان بحق ہو گئے۔ جنازہ ۷ ستمبر کی شام کو اٹھا اور انھیں خیریت آباد (حیدرآباد) کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اریب نے شروع میں نثر میں بھی بہت کچھ لکھا؛ اس میں افسانے اور ڈرامے تک شامل ہیں لیکن بعد کو وہ کاملاً شعر گوئی کے لیے وقف ہو گئے۔ شعر میں ان کا صرف ایک مجموعہ "پاس گریباں" کے عنوان سے شائع ہو سکا (حیدرآباد ۱۹۶۱ء) "حیدرآباد کے شاعر" کا دوسرا حصہ بھی انھیں نے مرتب کیا تھا؛ یہ بھی ۱۹۶۱ء میں چھپا۔ بہت سا کلام غیر مرتب صورت میں منتشر پڑا ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ حال آنکہ وہ جدید دور کے شاعر تھے اور ان کے خیالات و افکار بھی روایتی نہیں تھے، لیکن زبان کے معاملے میں وہ بہت سخت روایت پسند تھے؛ اور اس میں کسی آزادی اور بے راہروی کے روادار نہیں تھے۔

پس ماندگان میں ان کا اکلوتا بیٹا حسین اور بیوہ صفیہ اریب ہیں۔ اریب کی پہلی شادی واحد خاتون سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک لڑکی ہوئی۔ لیکن دونوں ماں بیٹیاں ایک کے بعد دیگرے چل بسیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی والدہ کے اصرار کے باوجود سات آٹھ سال تک دوسری شادی نہیں کی۔ اب وہ مشاعروں کے ہر دلعزیز شاعر کی حیثیت سے روشناس عالم تھے۔ صفیہ نے انھیں مشاعروں میں دیکھا اور سنا؛ اور اس کے بعد اپنے والد (جناب محمد شریف

ایڈووکیٹ) کی مخالفت کے باوجود ان سے شادی کرلی، حالانکہ ان کی اپنی تعلیم ایم اے تک تھی، اور اریب جیسا کہ لکھ چکا ہوں، انٹرنس سے زیادہ نہیں تھے۔

عشق ازیں بسیار کردہ است وکند

اب ان کے چند شعر دیکھیے!

بے دامن و بادیدۂ تر زندہ ہوں / آئینہ بکف، خاک بسر زندہ ہوں

مجھ رند خراب کو دیکھ، اے دنیا! / ہر سانس پہ مرتا ہوں، مگر زندہ ہوں،

گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے / حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

بے رنگیِ اوقات ابھی باقی ہے / بے مہریِ حالات ابھی باقی ہے

اے ماہ! نہ جا چھوڑ کے ایسے میں مجھے / میخانے میں کچھ رات ابھی باقی ہے

سوچتا ہوں دنیا کو چھوڑ کر کہاں جاؤں / تیری بوئے پیراہن ہر نفس سے آتی ہے

ہر مرحلۂ دہر کو آساں کرلوں / مرنے کے لیے جینے کا ساماں کرلوں

جلتا ہوں، مگر جلنے سے پہلے، اے موت! / پیمانے کے ہر خط کو رگِ جاں کرلوں

مٹ گئے جس کے لیے، نام تک اس کا نہ لیا / کاش اس بات کی اس کو بھی خبر ہو جاتی!

تھی تو مرہم کی ضرورت، پہ تری یاد کے ساتھ / ایک نشتر سا مرے دل کے قریب آج بھی ہے

وہی میں ہوں، وہی دل ہے، وہی سر ہے، وہی سودا / کہ یہ خاکسترِ دل آج بھی آتش بداماں ہے

جیسے اک لمحے کو رک جاتی ہے نبضِ عالم / جب مرے پاس سے وہ ہو کے نکل جاتے ہیں

رد زاک دامن تو کوئی کہاں سے لائے! / شیوۂ دیدۂ خونبار وہی ہے کہ جو تھا

تیری خوشی سے نبھ نہ سکی، اس کا غم نہیں / غم سے ترے نباہ کی خواہش ضرور ہے

انجام رسم و راہ اگرچہ ہے سامنے / پر تجھ سے رسم و راہ کی خواہش ضرور ہے

پیہم نوازشیں بھی محبت نہیں، مگر / الطافِ گاہ گاہ کی خواہش ضرور ہے

غضب تو یہ ہے کہ تجھ کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی / ہوس کا سلسلہ کب تیرے پیار تک پہنچا

حادثہ یہ ہے، پلٹ کر بھی نہ دیکھا تو نے
حادثہ یہ نہیں، تو مجھ کو نظر آیا تھا

دشتِ پُرہول کا اندھیرا کیا!
عشق میں شام کیا، سویرا کیا!

زمیں بھی اپنی نہیں ہے، یہ راز آج کھلا
سمجھ رہے تھے دِوانے، ہے آسماں اپنا

بھیس کیا کیا نہ زمانے میں بنائے ہم نے
ایک چہرے پہ کئی چہرے لگائے ہم نے

تیرے پہلو سے بھی پہنچے نہ ترے پہلو تک
فاصلے قرب کے گو لاکھ گھٹائے ہم نے

وہ دن گئے کہ کرتی قیامت بھی انتظار
ہم پر تمھارے ہوتے، قیامت گزر گئی

یہ بھی شاید ترا اندازِ دل آرائی ہے
ہم نے ہر سانس پہ جینے کی سزا پائی ہے

تو مرے چاک گریباں سے تو مجوب نہ ہو
میں نے کب تیری محبّت کی قسم کھائی ہے

کیا ترا حال بھی، اے انجمن آرا ہے یہی
میں ترے پاس ہوں، لیکن وہی تنہائی ہے

تمام عمر، میاں! کون ساتھ دیتا ہے!
جلی تھی شمع، ابھی جل مرا ہے پروانہ

پیار کا، درد کا، مذہب نہیں ہوتا کوئی
کعبہ و دیر سے مطلب نہیں ہوتا کوئی

سچ تو یہ ہے کہ میں ہر بزم میں تنہا ہی رہا
یوں تو گر پاس مرے کب نہیں ہوتا کوئی

چاندنی، پھول، ہوا، جام، ستارے، خوشبو
زہر کے نام ہیں، جس شب نہیں ہوتا کوئی

مجھ کو خود مجھ سے بھی ملنے نہیں دیتی دنیا
چھپ کے ملتا ہوں کبھی، جب نہیں ہوتا کوئی

نہیں نشہ، نہ سہی، بیخودی تو دے مجھ کو
اگر شراب نہیں، تشنگی تو دے مجھ کو

پھرتے ہیں کب سے سر کو ہتھیلی پہ رکھ کے ہم
کیا شہر بھر میں اب کوئی قاتل نہیں رہا

آج بھی ہاتھ پہ ہے تیرے پسینے کی تری
یعنی ہے آج بھی شاخِ شجرِ درد ہری

دل کی بستی سے کبھی یوں نہ گزرتی تھی صبا
اب نہ پیغامبری ہے، نہ کوئی نامہ بری

ہم نے بھی چھوڑ دیا مسلکِ اربابِ وفا
وہ بھی اب بھول گئے شیوۂ بیدادگری

کڑوی خوشبو

ایک ہنگامہ بپا ہے ہر سُو

ان گنت صدیوں سے یہ ہنگامہ
یوہنی بپا ہے ہر سُو
جس میں
میں بھی، تو بھی
اس طرح جکڑے ہوئے وسعتِ زنجیر تک آزاد بھی ہیں
جس طرح مکڑی کے جالے کے اسیر

پاس سے ہو کے مرے کوئی جوانِ رعنا
جب بھی گزرا ہے، مرا جی چاہا
اس کو لپٹا کے کئی پیار کروں

ہائے وہ پیکرِ ناظورۂ صد عشوہ طراز
جب بھی آیا ہے تصور میں مرے۔
میں نے جینے کی تمنّا کی ہے

رات چپکے سے مرے کمرے میں
چاند کی ایک کرن در آئی۔
اس نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کہا:
"آؤ، ہم چاند تک ہو آئیں ذرا"
چاند کی سیر سے جب میں لوٹا
گھر کی دہلیز پہ سورج تھا کھڑا

اُف یہ برسات، یہ ہنگامِ گل و مُل، یارب!
عام کردے کہ یہاں کوئی بھی
تشنہ لب رہنے کا شکوہ نہ کرے
ساقیِ کوثر سے وہاں

اب بھی ہنگامہ بپا ہے ہر سُو
شام سے صبح مگر کیسے ہو
رات کی صبح نہیں ہوتی ہے
زہر کی لہر ہے، یا موت کی کرواہی خوشبو
لمحہ لمحہ مرے جی جاں سے گزرجاتی ہے
بیتھڈن لینے سے کچھ دیر کو نیند آتی ہے
زندگی

آج یہ معلوم ہوا
کچھ بھی نہیں
چھپکلی بھی نہیں
ہاں، اسکی کٹی دُم ہوگی

فرسٹریشن نمبر دس

ہم نے دو کتّے پالے ہیں
ایک کو ماما لے آئی تھی
جب وہ اتنا سا پلّا تھا
دوسرا کتّا بھی بن مانگے اک صاحب نے بھیج دیا تھا

میری بیوی دو دو کتے (ان کے نجس ہونے کی وجہ سے)
_____ رکھنے پر تیار نہیں تھی
لیکن میرے بچے کی ضد کی بالآخر جیت ہوئی تھی
اب یہ کتے "ٹامی" "ٹونی" گھر کی رکھوالی کرتے ہیں
ساتھ ہمارے ہی رہتے ہیں
ان کتوں سے میری بیوی پہلے بھی نفرت کرتی تھی
اور اب بھی نفرت کرتی ہے
میرا بچہ جو تنہا ہے _____ ان کتوں سے
اب بھی پیار کیا کرتا ہے
گھنٹوں ان کو ساتھ لیے گھوما کرتا ہے
میرا ان کتوں سے رشتہ، خونی یا روحانی
کیا ہو سکتا ہے؟
کتے بھی واقف ہیں اس سے
یوں کہ نہیں اصحاب کہف سے
لیکن اب یہ حال ہے میرا _____ روزانہ
جب تک کتوں کے رات کا بندوبست نہیں ہوتا ہے
مجھ کو اپنا کھانا پینا جرمِ انسانی لگتا ہے
یہی نہیں بلکہ مجھ کو تو اکثر یہ احساس ہوا ہے
کچھ بھی نہیں اب زیست کا مقصد
کتوں کی خاطر جینا ہوں

حقی حزیں، توفیق الحق میرٹھی

حزیں تخلص، توفیق الحق نام، حنفی خاندانی نسبت، وطن میرٹھ۔ حقّی نسبت خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ف جون ۱۶۴۲ء) کی طرف ہے، جن کا نام اس ملک میں حدیث کی ترویج کے سلسلے میں رہتی دنیا تک یاد رہیگا۔ جیسا کہ ظاہر ہے، یہ خاندان دراصل دلّی کا رہنے والا تھا۔ یہاں سے نقلِ مکان اِن کے والد وحید الحق حقی نے کیا: وہ ۱۹۰۲ء میں سلسلۂ روزگار میرٹھ چلے گئے اور وہیں بس گئے؛ وہ وہاں کچہری میں ملازم تھے۔

جناب وحید الحق نے میرٹھ میں ایک بیوہ خاتون سے شادی کرلی تھی۔ حزیں تقریباً ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی یہ کمسن تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ بچپن بہت تنگی ترشی سے بسر ہوا۔ ان کے اخیافی بھائی قاضی نعمان احمد نے جو ججی میں پیشکار تھے، دیکھ بھال نہ کی ہوتی تو خدا معلوم، کیا حشر ہوتا! بارے انھوں نے دستگیری کی۔ توفیق الحق اور ان کی دو چھوٹی بہنوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت انھیں کی نگرانی میں ہوئی۔ ابتدا میں تعلیم مذہبی علوم تک محدود رہی، قرآن حفظ کیا اور مدرسۂ اسلامیہ (گدڑی بازار)، میرٹھ میں عربی اور فارسی پڑھی، گویا اچھے خاصے نیم ملّا بن گئے۔ لیکن قدرت کو بہتر منظور تھا۔ مدرسۂ اسلامیہ کے زمانۂ تعلیم ہی میں انھیں

مثنوی معنوی اور دیوان حافظ نے بہت متاثر کیا اور یہ خود بھی کچھ غوں غاں کرنے لگے۔ ۱۹۴۲ء میں ایک مقامی دفتر میں معمولی ملازمت بھی مل گئی، جس سے بسر اوقات کا کچھ سہارا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ یہی نہیں، بلکہ ذاتی کاوش سے انگریزی میں بھی خاصی استعداد پیدا کر کے فیض عام انٹر کالج سے دسویں درجے کی سند حاصل کر لی۔ اور رفتہ رفتہ ۱۹۴۷ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد وہ باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ شعر میں کسی سے اصلاح و مشورہ کی نوبت نہیں آئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جگر مرادآبادی کے شاگرد تھے، لیکن غالباً یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمت معمولی کلرکی سے شروع کی تھی۔ ایم اے کی سند سے بھی کچھ مادی منفعت نہ ہوئی۔ ادھر ۱۹۴۸ء میں (بعمر ۲۷ سال) شادی ہو گئی اور اہلی ذمہ داریاں بڑھتے لگیں۔ چھ بچے تھے (چار لڑکے اور دو لڑکیاں) یہ گرانی کا زمانہ اور اتنا کم مشاہرہ! پریشان رہنے لگے اور آہستہ آہستہ دماغ کا توازن بگڑنے لگا۔ بات بات پر الجھنا اور زود رنجی ان کا شیوہ ہو گیا۔

بدھ کے دن ۳۰ ستمبر ۱۹۷۰ء دوپہر کے وقت گھر آئے۔ یہاں کوئی خلاف پسند بات پیش آئی، تو جھنجلا کر باہر چلے گئے۔ پہلے تو کسی نے خیال نہیں کیا، لیکن جب دیر تک واپس نہیں لوٹے، تو سب کو تشویش ہوئی۔ بہت تلاش کے بعد ان کی لاش جامع مسجد (میرٹھ) کے صحن کے کنوئیں سے برآمد ہوئی۔

اگلے دن (یکم اکتوبر کو) چشتیہ قبرستان (نزد عیدگاہ) میں دفن ہوئے۔ ۴۹ برس کی عمر پائی۔ بالعموم غزل ہی کہتے تھے۔ کوئی مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں کچھ کلام مختلف رسائل سے جمع کر کے دیا جا رہا ہے:۔

عشق کا ہو گا یہ چرچا، مجھے معلوم نہ تھا
تم بھی ہو جاؤ گے رسوا، مجھے معلوم نہ تھا

مجھ سے پھر جائیگی وہ چشم توجہ بھی حزیںؔ!
یوں بدل جائیگی دنیا، مجھے معلوم نہ تھا

ذوق طلب مرا حزیںؔ کام عجب یہ کر گیا
ان کا ہی سامنا ہوا، آج تو میں جدھر گیا

آج بھی بہرِ عرضِ غم میری زباں نہ کھل سکی
آج بھی آ کے وہ مرے حال سے بےخبر گیا

جیسے کہ تیری ذات سے دور کا واسطہ نہ ہو
یوں بھی کبھی کبھی ترے پاس سے میں گزر گیا

ہائے رے تیری یاد جو بن گئی جزوِ زندگی
اُف رے ترا خیال جو دل سے نہ عمر بھر گیا

آنکھ میں یہ نمی ہے کیوں، رخ پہ ہے یہ ملال کیا
بیٹھے بٹھائے آگیا اُن کو مرا خیال کیا

عشق ہے بیخودی کا نام، خود ہے جو لذتِ تمام
عشق کو اس سے کیا غرض، ہجر ہے کیا وصال کیا

جب ہو کسی کا انتظار، آئے نہ دل کو جب قرار
لمحۂ یک نفس بہت، وسعتِ ماہ و سال کیا

شیوۂ عشق ہے یہی، ان پہ فدا ہو زندگی
جان بھی دی اگر حزیںؔ، تو نے کیا کمال کیا؟

اگرچہ کوئی نہیں رہنمائے کوئے حبیب
مگر قدم ہیں، کہ خود اٹھ رہے ہیں سوئے حبیب

نہ عرضِ حال، نہ تابِ نظر، نہ جرأتِ شوق
نہ جانے کون سا عالم ہے روبروئے حبیب

اُسی کی اک نگہ لطف کا کرشمہ ہے
کہاں ہم اور کہاں ورنہ آرزوئے حبیب

مشامِ جاں ہے معطر جو ہر نفس میرا
بسی ہوئی ہے مرے پیرہن میں بوئے حبیب

کیوں ابھی سے ہے دل پہ رعبِ جمال
پردۂ در ابھی اُٹھا تو نہیں

آپ نے سن لیا، یہ بات ہے اور
آپ سے ہم نے، کچھ کہا تو نہیں

کس سے اب ماجرائے درد کہیں
اب کوئی درد آشنا تو نہیں

روز و شب کی اذیتیں، توبہ!
زندگی ہے، کوئی سزا تو نہیں

نہ شورش ہے نہ ہنگامہ نہ کوئی شوق متانہ
ہمیں اے زندگی! تجھ پر گماں کچھ اور ہوتا ہے

نظر کو جستجوئے کیف نظارہ سہی لیکن
حزیں! لطف حجاب درمیاں کچھ اور ہوتا ہے

مدامِ ہوش آیا تو مرا احساس نقیرا نہ مجھے
اس نے دیکھا تو باندازِ کریمانہ مجھے

محو ان کی یاد میں ہوں مجھ کو اس سے کیا غرض
لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں کہ، فرزانہ مجھے

کیا بتاؤں، کس قدر احساسِ مجبوری ہوا
یاد جب آئی تری، بے اختیارانہ مجھے

بےتعلق ان سے ہو کے، جانے یہ کیا ہو گیا
اب تو اک دنیا نظر آتی ہے بیگانہ مجھے

ہو گئے دل پہ منکشف، جتنے جو رموزِ زندگی
اُتنے ہی باخبر ہوئے، بڑھ گئی جتنی بیخودی

عشق تمام گمرہی، حسن تمام سرکشی
سارے جہاں سے دشمنی، اُف رے جنونِ آگہی

حسنِ فسردہ میں بھی کچھ پائی نہ حسن کی کمی
اُس رُخِ پُر ملال کی، بڑھ گئی اور دلکشی

اپنا ہی سوزِ باطنی، کام نہ جب تک آسکا
کم نہ ہوئی کسی طرح دیدہ و دل کی تیرگی

گاہ وہ بیرخی میں بھی ایک ادائے التفات
گاہ وہ التفات میں ایک ادائے بیرخی

اور بھی ہو گئیں فزوں، عشق کی بیقراریاں
پوچھیے اور حالِ غم، کیجیے اور دلدہی

آج تو اُن کی یاد کا دل پہ اثر نہ پوچھیے
آج تو زخمِ کہنہ میں آ گئی جیسے تازگی

آہ یہ جبرِ عشق کا کتنا عجیب حکم ہے!
دل میں ہو گو ہجومِ غم، رُخ پہ رہے شگفتگی

جس کا خیال بھی حزیں! نشترِ جاں سے کم نہیں
یاد نہ آئے اب ہمیں، کاش وہ دورِ زندگی!

لبوں پر مُہرِ خامشی، لگی ہے عشق میں مگر
نفس نفس ہے دردِ دل کی داستاں لیے ہوئے

ہزار شکر ہے کہ ہم نثارِ عشق ہو گئے
نہ جانے کتنے رہ گئے متاعِ جاں لیے ہوئے

نظر اُٹھی، نہ لب ہلے، بالآخر اُن کی بزم سے
ہم اٹھ گئے خیالِ سعیِ رائیگاں لیے ہوئے

ترے لیے دل حزیں! کہیں مگر سکون نہیں
پھرا کیے ہیں ہم تجھے کہاں کہاں لیے ہوئے

یہ کس منزل پہ آخر آ گئی وارفتگی اپنی
کہ اکثر خود ہمیں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

بتائیں کیا محبت کا اثر، بس یہ سمجھ لیجے
بہت مجبور ہو کر رہ گئی ہے زندگی اپنی

زہے جذب و کشش دوری بھی اب عینِ حضوری ہے
رسائی سے حزیں! کچھ کم نہیں اب نارسی اپنی

وہ جب سے واقفِ غم ہو گیا ہے
تڑپنا خود بخود کم ہو گیا ہے

خوشی سے خوش، نہ غم سے ہے یہ غمگیں
عجب کچھ دل کا عالم ہو گیا ہے

وہی ہر ایک سے بیگانگی سی
جو اُن کا تھا، وہ عالم ہو گیا ہے

ہمراہ اپنے گردشِ شام و سحر تو ہے
اس زندگی میں کوئی مرا ہمسفر تو ہے

کیسے کہیں کہ عشق کی دولت نہیں رہی
دل میں وہی خلش، وہی دردِ جگر تو ہے

ڈر ہے، اگراں نہ ہو کہیں اُس طبعِ ناز پر
ویسے مرا فسانۂ غم مختصر تو ہے

سراپا درد و غم جب زندگی تھی
عجب اُس زندگی میں دلکشی تھی
وہ اُن کا لطف تھا، یا برہمی تھی
بہر صورت ادائے دلبری تھی
بباطن، گفتگو ہوتی تھی اُن سے
بظاہر، لب پہ مُہرِ خامشی تھی
جو سچ پوچھو، تو اس جہلِ خرد سے
حزیں! اچھی مری دیوانگی تھی

یا انھیں بام و در پہ تھیں حسن کی ضو فشانیاں
یا یہی بام و در ہیں، جو تیرہ و تار ہو گئے
یوں تو جہاں میں ہے کسے، موت پر اپنی بس، مگر
آہ، وہ خوش نصیب جو ان پر نثار ہو گئے

بتاؤں تم کو کہ روٹھ جانے پہ مجھ سے تم کیا کیا کروگے
کسی کا کیا ذکر، خود سے بھی کچھ خفا خفا سے رہا کروگے
ستائیگا جب غمِ جدائی، کریگا کوئی نہ ہمنوائی
مجھے یقیں ہے، نہ ہو سکیگا، جو پاسِ عہدِ رضا کروگے
ہزار ہو جائے مجھ سے دوری، رہیگی دل میں تو ناصبوری
مجھے خیالات سے تم اپنے، بتاؤ کیوں کر جدا کروگے
یہ بُعدِ ظاہر ہے قربِ باطن، کھلیگا تم پر بھی ایک دن
مری نظر سے بھی دور رہ کر، مری نظر میں پھرا کروگے
حزیں کو آساں نہیں بھلانا، کروگے تم ضبط یہ تو مانا
چبھینگے دل میں وہ خار بن کر، جو اشکِ غم تم پیا کروگے

بیدل بیکانیری، شیخ محمد عبداللہ

شیخ مولابخش کے فرزند ارجمند، شیخ محمد عبداللہ جن کا راجستھان کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا، ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ شاعر تو وہ تھے ہی، اور شاعر بھی برگزیدہ، لیکن وہ اس سے بھی زیادہ بحیثیت انسان بہت بلند تھے۔ ان کے تمام ملنے والے ان کی شرافتِ نفس، دیانتداری، انسان دوستی، جذبۂ خدمتِ خلق کے مداح و معترف ہیں۔ اگر زبانِ خلق، نقارۂ خدا کا مقولہ درست ہے، تو یقین ہے کہ خدا اپنے فضل و کرم سے ان کی مغفرت فرمائیگا۔

شیخ محمد عبداللہ جنوری ۱۸۸۸ء میں بیکانیر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان جیپور اور بیکانیر کی صنعتی روایات کا وارث تھا؛ یہ لوگ مصوری اور پھول پتی بنانے کا کام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کام کی مانگ میں انحطاط پیدا ہوا اور ان کی اپنی مالی حالت بھی سقیم سے سقیم تر ہوتی چلی گئی۔ گھر کا ماحول سراسر مذہبی تھا، اس لیے ابتدا میں دینی تعلیم اور عربی فارسی کی پڑھائی نجی طور پر ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں (یکم جنوری ۱۹۰۰ء) باقاعدہ تعلیم کے لیے دربار ہائی اسکول (بیکانیر) میں داخلہ لیا۔ ذہن کی براقی کا یہ کرشمہ تھا کہ انھوں نے دو

دو درجے ایک ایک سال میں پورے کیے اور ۱۹۰۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، تو اسکول بھر میں اول آئے۔ مختلف مضامین میں اول آنے پر انعامات تو ملنا ہی تھے، والیِ ریاست مہاراجہ گنگا سنگھ نے اپنی طرف سے سونے کا تمغہ عطا فرمایا۔

گھر کے حالات مزید تعلیم جاری رکھنے کے موافق نہیں تھے اور یہ مجبور تھے کہ کہیں ملازمت کر لیں۔ ان کے ہیڈ ماسٹر جناب کرشن سنگھ تیواری نے جوان کی ذہانت اور ہونہاری کے قائل تھے، مشورہ دیا کہ تم یہیں اسکول میں مدرسی کر لو اور پرائیوٹ طور پر تعلیم بھی جاری رکھو۔ اس پر یہ اپنے اسکول ہی میں پڑھانے پر مقرر ہو گئے اور ساتھ ساتھ امتحانوں کی تیاری کرنے لگے۔ بالآخر ۱۹۱۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ وہ ریاست بیکانیر میں پہلے مسلمان گریجوٹ تھے (بلکہ اس زمانے میں یہاں غیر مسلم گریجوایٹ بھی صرف دو ہی شخص تھے) مہاراجہ گنگا سنگھ مرحوم تک خبر پہنچی، تو بہت خوش ہوئے اور اس کا عملی اظہار یوں کیا کہ انھیں ریاست کے چیف کورٹ کا رجسٹرار مقرر کر دیا۔ آدمی تھے محنتی اور دیانت دار، آقا قدردان ملا، تو انھوں نے اور بھی تندہی اور اخلاص سے اپنے فرائض کو سرانجام کیا، چنانچہ چیف جج رائے بہادر نہال سنگھ انھیں اپنا دستِ راست سمجھتے تھے۔

مہاراجہ نے ان کی کارگزاری دیکھ کر ۱۹۲۳ء میں انھیں اپنی وزارت کا سکرٹری بنا دیا۔ یہاں وہ تقریباً دو سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد یہ جلد جلد ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ اس دوران میں ریاست کا امتحانِ قانون بھی پاس کر لیا۔ ادھر وزارت میں ردّ و بدل ہوا، تو جون ۱۹۲۴ء میں یہ منصف مقرر ہو گئے۔ ان کے عدل و انصاف اور بہادری کی تعریف میں کہ دہ سب رطب اللسان تھے۔ ترقی کر کے ۱۹۳۳ء میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ (پوری ریاست میں صرف تین اضلاع تھے) جو اس زمانے میں ریاست کے عدلیہ میں بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہیں سے ۲۳ سال بعد ۱۹۵۶ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

چونکہ خدا نے فراغت نصیب کی تھی اور دردِ دل کی دولت سے نوازا تھا، اس لیے رفاہِ عام

کے کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ درگاہ نوگزا پیر کا مدرسۂ اسلامیہ انھیں کا قائم کردہ ہے، بلکہ اس درگاہ کی عمارت بھی اپنے خرچ پر تعمیر کروائی تھی۔

فارسی کے منتہی تھے۔ اس کے علاوہ اردو انگریزی پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کی قابلیت کے جوہر خاص طور پر ترجمے میں کھلتے تھے۔ ریاست کے متعدد تاریخی مقدمات کے فیصلوں کے اردو اور انگریزی ترجمے ان کی مہارت زبان اور اصطلاحات قانون سے واقفیت کے مرہون منت ہیں۔ یہ کے ریاستی دفتر خانے کی بعض اہم فارسی دستاویزوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ شاہجہانی عہد کی مشہور تاریخ بادشاہ نامہ (عبدالحمید لاہوری) کے اس حصے کا ترجمہ جو راجستھان سے متعلق ہے، انھیں کے قلم سے ہے۔ ابھی انٹر کا امتحان بھی نہیں دیا تھا کہ ۱۹۱۵ء میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ بیدل تخلص اختیار کیا اور داغ کے شاگرد رشید منشی وحید الدین احمد بیخود دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) سے اصلاح لینے لگے۔ راجستھان کے رہنے والے تھے، لیکن زبان ایسی صاف اور شستہ و رفتہ لکھتے تھے کہ استاد کو ان پر فخر تھا۔ جن اصحاب نے بیخود کو دیکھا ہے یا ان سے بات چیت کی ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور کسی کو اپنے برابر کا شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا یہ لطیفہ مشہور ہو گیا۔ ایک دن اپنے استاد بھائی نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی (ف ۱۹۴۵ء) سے جو داغ کے داماد بھی تھے، باتیں کر رہے تھے، کہنے لگے بھائی سائل! اب دلی میں شاعری کا خاتمہ ہی سمجھو۔ لے دے کے ایک تم اور ایک میں، دو ہی شخص اس کے نام لیوا رہ گئے ہیں؛ ہمارے بعد، بس اللہ کا نام ہے۔ اور بھئی، سچ پوچھو، تو تم بھی کیا ہو!

تو خیر، بیخود نے جو سند اپنے اس شاگرد کی زبان اور بیان اور تخیل سے متعلق دی ہے، وہ بیدل کے دیوان "باغ فردوس" کے شروع میں موجود ہے۔ بیخود لکھتے ہیں کہ بیدل نے میری زبان پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ میرے پاس مال دنیا سے اور کچھ تو تھا نہیں، ایک زبان رکھتا تھا، وہ حضرت بیدل کی نذر ہو گئی؛ ان کے بہت سے شعر میرے ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ بھی اپنے استاد کے مداح اور عاشق تھے۔ لکھتے ہیں:

شہرہ ہے آج جن کا جہاں میں بجاے داغ
شاعر نہیں ہے حضرت بیخود سا ہند میں

بیخودی طاری ہوئی بیدل کا دیوان دیکھ کر
حضرت بیخود کا ہر شاگرد ہے ساغر بکف

دیوان کا نام "باغ فردوس" تاریخی ہے جس سے ۱۳۵۳ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اس سے ایک سال بعد شائع ہوا تھا (لاہور ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء) اس سے مختلف اصنافِ سخن پر قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک ایک صفحے سے حبِ رسول اور اولیاے امت سے عقیدت نمایاں ہے۔ عام غزل لکھتے ہوئے بھی اس میں نعت یا منقبت کے شعر لکھنے لگتے ہیں۔ سلامتِ طبع اور پختگی کلام کا خاص جوہر ہیں۔ باغ فردوس کے علاوہ اور کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ بہت سا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔

وفات سے پہلے پانچ چھ دن تک ملیریا سے بیمار رہے۔ اس سے شفایاب تو ہو گئے، لیکن نقاہت بہت بڑھ گئی تھی، جو کبرسنی کا تقاضا تھا۔ اسی حالت میں ۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو فجر کے وقت عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا؛ ۸۲ برس کی عمر پائی۔ جبو سر گیٹ (بیکانیر) کے قریب کے پرانے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اولاد میں سات بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ راجیہ سبھا کے رکن جناب محمد عثمان عارف ان کے صاحبزادے ہیں۔ وفات کے وقت ستر پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور ان کے بچے ان کے سوگواروں میں تھے۔

مختصر انتخاب کلام ملاحظہ ہو:

لب پر مرے جو نام ہے اس کارساز کا
موقع ملا ہے خود مجھے دیواں پہ ناز کا

کیا عشق نے بڑھایا ہے رتبہ ایاز کا
کس منھ سے شکر ہو سکے بندہ نواز کا

جلوہ بھی پردہ بن گیا موسیٰ کے واسطے
پردہ اٹھا دیا کہیں راز و نیاز کا

دم تو وہی ہے دم، جو تری یاد میں کٹے
غم ہے فضول عمر قلیل و دراز کا

کعبہ دیکھا نہ کبھی قبلۂ ایماں دیکھا
جھک پڑے ہم تو جدھر ابروے جاناں دیکھا

تیر دیکھا نہ ترے تیر کا پیکاں دیکھا
در پہ تیرے کوئی بسمل، کوئی بیجاں دیکھا

جانِ مضطر ہے، جگر سوختہ، آنکھیں پُرنم — غمِ الفت کا مزہ، اے دلِ ناداں دیکھا
مظہرِ شانِ جمالی و جلالی ہم ہیں — اپنا رتبہ بھی کبھی حضرتِ انساں دیکھا؟

دل بجھ گیا، وہ جوشِ تمنّا نہیں رہا — جس کی یہ کاوشیں تھیں، وہ کانٹا نہیں رہا
اٹھ کر تمھارے در سے جو کوئی چلا گیا — دنیا میں کوئی اس کا ٹھکانا نہیں رہا
اک بار اور کہیے: تجھے اختیار ہے — اب میرے دل پہ آپ کا دعویٰ نہیں رہا

دل ہے مشتاق، کہیں وصل کا ساماں ہوتا! — آنکھ جویا ہے، کہیں جلوۂ جاناں ہوتا!

مدہوش ہی ہیں واقفِ اسرارِ معرفت — اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

آبروِ اشکِ ندامت نے بڑھا دی میری — دُرجِ گوہر سے سوا دیدۂ گریاں نکلا

اچھا کبھی ہوتا نہیں بیمارِ محبت — اللہ کسی کو نہ دے آزارِ محبت

خاک لطفِ زندگی ہے جب تمنّا مٹ گئی — کیجیے گا آپ، بیدلؔ! ترکِ الفت دیکھ کر

دلِ بیتاب افشا کر نہ دے رازِ محبت کو — نظر رکھتا ہوں اپنے دل پہ بھی میں بدگماں ہو کر

تمھارے عشق نے دونوں جہاں سے کھو دیا — اِدھر زمانہ مخالف، اُدھر خدا سے بگاڑ

ارماں اب کہاں ہیں، تمنا وہ اب کہاں؛ — تھے وصل کے مزے تو دلِ ناصبور تک

تھی رہگذر، نہ شرم نے جمنے دیے قدم — مڑ مڑ کے دیکھتے رہے مجھ کو وہ دور تک

دلِ مضطر پہ تو الزام ہے رسوائی کا — کچھ تمھیں اپنی نظر پر بھی نظر ہے کہ نہیں؟
دل نہ بیدرد کو دینا تھا تمھیں، اے بیدلؔ! — لب پہ اب آہ و فغاں شام و سحر ہے کہ نہیں!

وہ دیکھا ہے، جو کچھ دکھایا خدا نے — ابھی دیکھیں، کیا اور ہم دیکھتے ہیں

دل دے چکا جب اس بتِ بیداد گر کو میں — بیکار ہے جو رو دُوں دعا کے اثر کو میں

رونق ہی بزمِ حسن کی عاشق کے دم سے ہے — اپنی نمود کے لیے پیدا کیا مجھے

جب تک نہ سوزِ دل میں ہو، اٹھتا نہیں دھواں — جب تک نہ آہ دل سے ہو، اس میں اثر کہاں!

وہ آنکھ کیا ہے، جس میں تری جستجو نہ ہو — وہ دل ہی کیا ہے، جس میں تری آرزو نہ ہو

یہ رمزِ حسن و الفت کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی

جو ہے بیگانہ مجھ سے، ہے اسی کی آرزو مجھ کو

بیدل! بتوں سے دل کے بچانے کا حوصلہ ہم بھی سلام کر لیں گے اچھا، جناب کو

دیر و حرم میں، شیخ و برہمن کڑا کیے فتنہ گری ہے ساری یہ تیرے حجاب کی

عجب دیدِ تماشہ ہے کہ نظروں میں بیاں سب ہو

دمِ نظارہ حیرت سے بنیں آنکھیں، زباں میری

دل لگی سمجھے تھے، بیدل! ہم کسی کی چاہ کو چھیڑ یہ تو جان کا آزار ہو کر رہ گئی

مصطفےٰ زیدی (تیغ الہ آبادی)

الہ آباد میں ایک خاصے معروف شیعہ خاندان کے فرد سید لخت حسنین سی آئی ڈی انسپکٹر ہوئے ہیں۔ ان کا نام ہماری جنگِ آزادی میں یادگار رہیگا۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں تاریخی مقدمۂ بغاوت علی برادران، مولانا حسین احمد مدنی، جگت گورو شنکر آچاریہ (سوامی کرشن تیرتھ) پیر غلام مجدّد سندھی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا ثناء اللہ کانپوری پر کراچی میں چلا تھا۔ اس کی فردِ جرم یہ تھی کہ ان حضرات نے آل انڈیا خلافت کانفرنس، کراچی (۸ تا ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء) میں اپنی تقریروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو فوج کی ملازمت سے الگ رہنے کی ترغیب دی تھی۔ اس مقدمے میں مولانا محمد علی کی تقریروں کی جو اردو خفیہ رپورٹ عدالت میں پیش ہوئی تھی، وہ انھیں سید لخت حسنین صاحب نے سرکار میں بھیجی تھی۔ وہ خود بھی پہلے ہی دن عدالت میں لطور گواہِ استغاثہ پیش ہوئے تھے (اس مقدمے کے علاوہ اسی موقع پر مولانا محمد علی کے خلاف کچھ اور مقدمے بھی دائر ہوئے تھے، ان سب میں بھی سرکاری رپورٹر سید لخت حسنین ہی تھے) مولانا محمد علی کی بذلہ سنجی مشہور رہی ہے۔ ان کا نام سننے پر اُن کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ انھوں نے لخت حسنین صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے

یہ شعر فی البدیہہ اسی دن کہا تھا:۔

محمدؐ کا دشمن، علی کا عدو
نہ کہہ اپنے کو لخت حسنین تو

سید لخت حسنین شاعر نہیں تھے، لیکن اس کے جواب میں انھوں نے کہا:

علی اور محمدؐ سے کیا تجھ کو کام
تو کر اپنے گاندھی کی حجت تمام

اس کے سوائے ان کا اور ایک مصرع تک نہیں ملتا۔ ان کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوا۔
سید لخت حسنین نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے پانچ بیٹے ہوئے: احمد رضا، حیدر رضا، امیر رضا، عابد رضا اور ناصر رضا؛ اور دوسری بیوی سے تین: مجتبیٰ حسنین، مصطفیٰ حسنین اور مرتضیٰ حسنین۔ یہی مصطفیٰ حسنین ہمارے شاعر مصطفیٰ زیدی (سابق تیغ الہ آبادی) ہیں، جن کا انتقال افسوسناک حالات میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء پیر کی شب کراچی میں ہوا۔
سید مصطفیٰ حسنین ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم معقول طریقے پر ہوئی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں مقامی ماڈرن اسکول سے دسویں درجے کی سند لی۔ شعر گوئی کا شوق اسکول کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تیغ تخلص اختیار کیا اور تیغ الہ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہت ذہین اور اپنی عمر کی بہ نسبت کہیں زیادہ غور و فکر کے عادی تھے۔ میں نے ان کے بعض احباب کے پاس ان کی ۱۸۔۱۹ برس کی عمر کے کچھ خطوط دیکھے ہیں؛ ان سے ان کی مختلف مسائلِ حیات سے متعلق آرا کے تیکھے پن اور جدت اور بڑی حد تک پختگی پر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ وہ جوش ملیح آبادی سے بہت متاثر تھے اور فراق کے دوستوں اور ہمنشینوں میں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'زنجیریں' کے عنوان سے ۱۹۴۷ء میں یعنی اسکول چھوڑنے کے ایک سال بعد الہ آباد سے شائع ہوا، جب کہ وہ محض ۱۶۔۱۷ برس کے تھے۔ یہ قطعات پر مشتمل ہے اور اس کے شروع میں فراق کا طویل مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے اس نوخیز

ادیب کی بیحد تعریف کی ہے۔ اس میں نوجوان شاعر کی تصویر بھی ہے؛ اس کے نیچے یہ شعر ہے:

تدبر فرما تیغ کی، اے دخترِ گنگ و جمن
تیغ، جو اس وقت، ہے پیغمبرِ شعر و سخن

۱۹۴۸ء میں وہ ایک ادبی ماہانہ رسالے 'کرن' کے ایڈیٹر بن گئے، حال آں کہ ابھی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایونگ کرسچین کالج سے انٹر اور ۱۹۵۰ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔

۱۹۵۱ء میں وہ پاکستان چلے گئے، جہاں اُن کے دونوں حقیقی بھائی پہلے سے مقیم تھے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں ہندستان میں ایم اے (انگریزی) کے پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا تھا، اب دوسرے سال (آخری) کا گورنمنٹ کالج (پنجاب یونیورسٹی)، لاہور سے دیا، اور کامیابی کے بعد چند سے اسلامیہ کالج، کراچی اور پشاور یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان سول سروس کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوئے اور منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مختلف اضلاع میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ ۱۹۶۵ء کی ہندستان اور پاکستان کی فوجی چپقلش کے بعد وہ لاہور میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے تھے۔

دورِ ایوبی میں وہ خاصے کامیاب رہے۔ اور اسی زمانے میں اپنی نمایاں خدمات کے لیے تمغۂ قائدِ اعظم کے اعزاز سے مفتخر ہوئے۔ؔ لیکن صدر ایوب کے زوال اور دستبرداری کے بعد، ان کے متعدد دوسرے دوستوں کی طرح یہ بھی معتوب ہوئے اور ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ یہ اسی سال ۱۹۷۰ء کے شروع کی بات ہے۔

مصطفیٰ بڑے صحتمند اور وجیہ و شکیل آدمی تھے۔ ان کی طالبعلمی کے زمانے کے بھی بعض رومانی افسانے سننے میں آئے ہیں۔ بالآخر انھوں نے ۴ اکتوبر ایک جرمن خاتون (ویرا انان ہل) سے سیالکوٹ میں شادی کر لی۔ ان سے دو بچے (بیٹا: مجتبیٰ، ولادت ۲۴ اگست ۱۹۵۸ء اور

ؔ ان کی وفات کے سال بھر بعد ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو حکومت پاکستان نے ان کا یہ اعزازی تمغہ واپس لے لیا۔

بیٹی، عصمت، ولادت جنوری ۱۹۶۰ء میں۔ جب ملازمت سے الگ ہو گئے، تو اپریل ۱۹۷۰ء میں انھوں نے بیوی بچوں کو برلن بھیج دیا۔ وہ خود بھی وہاں جانے کے لیے پر تول رہے تھے کہ جب تک فضا صاف نہیں ہو جاتی، کہیں ملک کے باہر سکون سے دن گزار لیں۔ اسی سلسلے میں تھوڑے دن سے ایک دوست کے ہاں کراچی میں مقیم تھے، جہاں پُراسرار حالات میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء صبح ان کی لاش ملی۔ ہنوز یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ انھوں نے خودکشی کی یا قتل کیے گئے؛ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے۔

انھوں نے ۱۹۵۵ء میں پہلا تخلص تیغ ترک کر دیا اور اس کی جگہ مصطفیٰ لکھنے لگے تھے؛ اب تیغ الہ آبادی کی بجائے ان کی مصطفیٰ زیدی کے نام سے شہرت تھی۔ زنجیریں (۱۹۴۷ء) کے بعد انھوں نے اپنی زندگی میں چار اور مجموعے شائع کیے[1]: روشنی (نظمیں) الہ آباد ۱۹۴۹ء؛ شہرِ آذر (کراچی جنوری ۱۹۵۹ء)؛ موج میری صدف صدف (لاہور اپریل ۱۹۶۰ء)؛ قبائے ساز (لاہور، ۱۹۶۷ء)؛ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا دورِ جدید کے مقبول شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ ابھی عمر ہی کیا تھی؛ مشکل سے ۴۰ سال پورے کیے تھے۔ کوئی دن اور جینا ملتا، تو ترقی کے بہت امکانات تھے؛ لیکن وقتِ مقررہ کو کون ٹال سکتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو!

کربلا

کربلا! میں تو گنہگار رہوں، لیکن وہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزندی کی
جسم سے، روح سے، احساس سے عاری کیوں ہیں؟
ان کی مسمار جبیں، ان کے شکستہ تیور
گردشِ حسنِ شب و روز پہ بھاری کیوں ہیں؟
تیری قبروں کے مجاور، ترے منبر کے خطیب
فلسِ دینار و توجہ کے بھکاری کیوں ہیں؟

---

[1] ایک مجموعہ "کوہِ ندا" کے عنوان سے پہلی برسی پر اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔

روضۂ شاہِ شہیداں پہ اک انبوہِ عظیم
بل ایر اور کرسلر کے نئے ماڈل کو
اسی خاموش عقیدت سے تکا کرتا ہے
جس کو کہہ دوں، تو کئی لوگ برا مانیں گے
غیر تو رمزِ غمِ کون و مکاں تک پہنچے
کربلا! تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے
دل کو تہذیبِ تمنّا میں خدا ملتا ہے
سوزِ ناقوس و نظارہ میں خدا ملتا ہے
تیرے دیوانوں کو اے شاہدِ دریائے فرات
اپنی بیگانگیٔ ذہن میں کیا ملتا ہے؟

لوگوں کی ملامت بھی ہے، خود دردِ سری بھی
کس کام کی یہ اپنی وسیع النظری بھی

کس طرح خود اپنے کو یقیں آئے کہ اس سے
ہم خاک نشینوں کی ملاقات رہی ہے

کسی تو کام زمانے کے سوگوار آئے
تجھے جو پا نہ سکے، زیست کو سنوار آئے

یہ اور بات کہ ساقی سے قرض مل نہ سکی
حضورِ حضرتِ یزداں تو باوقار آئے

آخر تمام عمر کی وسعت سما گئی
اک لمحۂ گذشتہ کی چھوٹی سی بات میں

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

ہونٹوں کے ماہتاب ہیں، آنکھوں کے بام ہیں
سر پھوڑنے کو ایک نہیں، سو مقام ہیں

تم سے تو ایک دل کی کلی بھی نہ کھل سکی
یہ بھی بلاکشانِ محبت کے کام ہیں

وہ کیا کرے جو تیری بدولت نہ ہنس سکا
اور جس پہ اتفاق سے آنسو حرام ہیں

منعم کا تو خدا بھی امیں، بت بھی پاسباں
مفلس کے صرف تیغ علیہ السلام ہیں

Belair اور Chrysler موٹر کاروں کی دو مشہور قسمیں (ماڈل)

ناقدرو! دیدہ ورو! کفر کا الزام نہ دو — میرے الحاد میں اک پرتوِ الہام بھی ہے
عشقِ خوددار! یہ پندارِ جنوں چھوڑ بھی دے — اب تو ان آنکھوں میں آنسو بھی ہیں، پیغام بھی ہے

برف کے نم اداس سینے پر — رقص کرتی ہے شعلگی میری
موت کا راگ چھیڑ کر اے تیغ! — مسکراتی ہے زندگی میری

تھپکیاں دیتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی ہوئی — ہر غمِ دوراں کو میٹھی نیند میں لاتی ہوئی
دفعتہً گزریں یہ کس کی انگلیاں، اے ہمنشیں! — میرے ان الجھے ہوئے بالوں کو سلجھاتی ہوئی

حسنِ خودبیں کی عشوہ کاری دیکھ — اپنے دیدار کے عوض اس نے
ساز و بربط، صراحی و ساغر — دے کے بہلا دیا کھلونوں سے

سرود و نغمہ و مے، ساز و جام، رہنے دے — کہ ہر نشاط پہ غم کی نگاہ ہے ساقی!
یہ بزم وہ ہے، جہاں بے صدا ہے سازِ حیات — یہاں تو آہ بھی کرنا گناہ ہے ساقی!

میں عشقِ مکمل کا ہوں پیرو، اے دوست! — صیدِ ہوسِ اندک و بسیار نہیں
بس جامِ شراب، اور ان کا دیدار — میں اور کسی شے کا طلبگار نہیں

اسرار احمد آزاد

اسرار احمد آزاد صاحب رامپور منہاران (ضلع سہارنپور) کے رہنے والے تھے، جہاں وہ ۱۵ اگست یا ستمبر ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نور احمد صاحب چونے کا کاروبار کرتے تھے، ان کا مئی ۱۹۶۰ء ڈیرہ دون میں انتقال ہوا۔ آزاد صاحب نے دسویں درجے تک تعلیم اسلامیہ اسکول سہارنپور میں پائی تھی۔ چونکہ گھر کے مالی حالات زیادہ سازگار نہیں تھے، اس لیے وہ تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ لیکن تھے بلا کے محنتی اور ذہین۔ اس لیے ذاتی جد و جہد سے اتنی اچھی استعداد پیدا کر لی کہ مشکل سے مشکل انگریزی عبارت کا ترجمہ آسانی سے کر لیتے تھے۔

آزاد صاحب کی ننھیال کرنال میں تھی۔ یہ تلاش معاش میں وہاں گئے، تو نانا کی وساطت سے پاکستان کے سابق وزیر اعظم صاحبزادہ لیاقت علی خان (ف ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء) کے بچوں کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ یہاں یہ تین برس رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ لیاقت علی خان مرحوم انھیں کے صلاح و مشورے کے نتیجے میں سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ آزاد خود مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر تھے، اور نظریاتی لحاظ سے کانگریس کے بائیں بازو سے متفق تھے۔ بعد کو کچھ عرصہ کمیونسٹ پارٹی میں بھی شامل رہے۔

کرنال کے زمانۂ قیام ہی میں انھوں نے ایک پرچہ "العزم" شروع کیا تھا، لیکن تین سال بعد مالی مشکلات کے باعث اسے بند کرنا پڑا۔

کرنال سے واپس آئے، تو سہارنپور میں ایک بنک میں ملازمت کرلی۔ لیکن اس میں ان کا دل نہیں لگا۔ چنانچہ وہاں سے دلی چلے آئے۔ یہاں انھیں مختلف اخباروں میں ترجمے کا کام مل گیا۔ ریڈیو نے بھی کچھ سرپرستی کی۔ اس کے بعد مولوی حفظ الرحمٰن مرحوم کی سفارش پر روزنامہ "الجمعیۃ" کے سنڈے ایڈیشن کی ترتیب اُن کے سپرد ہوئی۔ کوئی تین برس تک وہ اس جگہ کام کرتے رہے (۱۹۴۷ - ۱۹۵۰ء)۔ اس کے بعد ماہنامہ 'برہان' اور 'دین و دنیا' میں کام کرنے لگے۔ ان کے لیے وہ اجرت پر ترجمے اور طبعزاد مضامین لکھتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک اپنا ذاتی پرچہ 'جدوجہد' کے نام سے بھی نکالا تھا، لیکن یہ بھی تین چار سال بعد مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کے پرچے 'عوامی دور' (پیپلز ایج) کا اردو حصہ) کے ادارۂ تحریر میں بھی شاید دو برس تک (۱۹۵۸ - ۱۹۵۹ء) کام کیا۔

بین الاقوامی سیاسیات اور تعلقات پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ چنانچہ انھوں نے مکتبۂ برہان کے لیے 'جدید سیاسی معلومات' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ اردو میں اس نوعیت کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی، لہذا ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ حالات بھی تیزی سے بدل رہے تھے، اس لیے انھیں اس کا نیا ایڈیشن تیار کرنا پڑا۔ انھوں نے اسے از سرِ نو 'جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات' کے نام سے مرتب کیا اور یہ تین حصوں میں شائع ہوئی (۱۹۵۲ - ۱۹۵۸ء) مکتبۂ برہان ہی نے ان کی ایک اور کتاب 'مارشل ٹیٹو اور جمہوریۂ یوگوسلادیہ' بھی شائع کی تھی (۱۹۴۶ء) ان کی ایک کتاب کشمیر اور اس سے متعلق ہندوستانی موقف کی وضاحت میں "مسئلہ کشمیر" کے عنوان سے بھی چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ 'دنیا کی مسلم حکومتیں'، 'سرخ چین کے رہنما' (ریڈ سٹار اوور چائنا کا ترجمہ) بھی ان کی تصانیف ہیں۔ بچّوں کے لیے بھی کچھ کتابیں لکھی

بھیں مثلاً گاندھی جی اور نیتاجی سبھاش بوس کی سوانح عمریاں، سات تارے، سچ جھوٹ، دو موتی، سرخ بچے وغیرہ۔

سیاسیات کے بعد ان کی دلچسپی کا دوسرا موضوع اسلامیات تھا۔ وہ دلّی کے قدیم ماہنامے 'دین دنیا' میں نہایت باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ ان کی ایک کتاب 'سیرۃ صحابہ' چھپ چکی ہے؛ یہ ان کی وسعت مطالعہ اور نکتہ آفرینی پر دال ہے۔

۱۹۶۵ء میں وہ کشمیر حکومت کے پرچے 'خیابان' کے مدیر ہو کر سرینگر چلے گئے۔ وہاں تقریباً تین برس کے قیام کے بعد ۱۹۶۸ء میں ڈیرہ دون آئے یہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔

۲۰ نومبر ۱۹۷۰ء (۱۹ رمضان ۱۳۹۰ھ) بروز جمعہ سحری کے بعد دماغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال ہوا۔ راجپور روڈ (ڈیرہ دون) کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔ اپنے بھتیجے اعزاز احمد (خلف پروفیسر افتخار احمد) کو گود لے لیا تھا؛ وہی ان کے وارث ہوئے۔

○

ناشاد کانپوری، سری دھر پرشاد نگم

غالب نے ایک مرتبہ کہا تھا:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

کم و بیش یہی صورت ناشاد کانپوری کے ساتھ پیش آئی جن کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا۔ ان کا خاندان (نگم کائستھ) دراصل قنوج کا رہنے والا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے شروع میں ان کے جدِ اعلیٰ نقلِ مکان کر کے کانپور آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں انھوں نے خاصی جاداد پیدا کر لی تھی۔ خاندان میں سب سے پہلے ۱۸۴۶ء میں منشی درگا پرشاد فوج کی ملازمت میں داخل ہوئے؛ یہ ناشاد کے پردادا منشی کالکا پرشاد کے والد تھے (دادا کا نام تلجا پرشاد تھا) اس کے بعد فوجی ملازمت گویا خاندانی پیشہ بن گئی۔ خود ان کے والد رائے صاحب گوکرن پرشاد رسالدار (کمیشن افسر) تھے (ف دسمبر ۱۹۲۱ء)۔ دونوں چچا بھی فوج میں تھے۔ ناشاد کے بڑے بھائی منشی گجادھر پرشاد بھی فوج میں ملازم تھے۔ ناشاد ۸ اپریل ۱۹۰۸ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان دنوں ان کے والد تعینات تھے۔ ابتدائی

تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اس کے بعد محبوب کالج، سکندر آباد (دکن) میں داخلہ لیا جہاں ابتدا سے ان کے والد کا تبادلہ ہو گیا تھا؛ دسویں درجے تک یہاں پڑھتے رہے۔ انٹر کا امتحان نظام کالج، حیدرآباد سے دیا۔ اب یہ کانپور چلے آئے، بی اے کی تعلیم یہیں حاصل کی۔ اخیر ۱۹۳۱ء میں ایم اے (انگریزی) کی سند آگرہ یونیورسٹی سے لی اور اسی سال نومبر میں سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے گھاٹم پور تحصیل (ضلع کانپور) میں نائب تحصیلدار کے عہدے پر تقرری ہوئی۔ بتدریج ڈپٹی کلکٹری تک ترقی پائی۔ ۱۹۶۴ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

خاندان کی روایت فوج کی تھی، لیکن فارسی (اور اردو) سے کائستھ خاندانوں کا شغف بھی روایتی ہے۔ ناشاد کے دادا فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ناشاد نے گویا شاعری ورثے میں پائی۔ شروع میں جناب گنگادھر ناتھ فرحت کانپوری سے مشورہ رہا۔ اپنے وطن کے مشہور ماہانہ رسالے 'زمانہ' (کانپور) میں نثری مضامین لکھتے رہے؛ اسی دور میں چند فکاہیہ مضامین بھی قلمبند کیے تھے۔ کلام بھی 'زمانہ' کے علاوہ ساقی، آجکل وغیرہ میں چھپتا رہا۔ اسی زمانے کا ایک مقطع ہے، جس میں جناب فرحت کی استادی کا اعتراف کیا ہے:

فکرِ نشاط آج ہے سحر آفریں
فیضِ فرحت کا یہی اعجاز ہے

مدتوں بعد ملازمت کے دوران میں جناب شام موہن لال جگر بریلوی سے ملاقات ہوئی، تو ان سے اصلاح لینے لگے۔ اب بہت دن سے فارغ الاصلاح ہو چکے تھے، لیکن آخر تک استاد کے عاشق زار اور جاں نثار رہے۔

غزل اور رباعی پر زیادہ توجہ رہی۔ پہلا مجموعہ (کیفِ سرمدی) ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں چھپا تھا۔ ایک زمانے بعد مزید اضافوں سے اسے "سرودِ سرمدی" کے عنوان سے شائع کیا۔ (لکھنؤ ۱۹۶۸ء) اس میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ سب کچھ موجود ہے۔ بجد پختہ اور بلند تر

خزینہ کلام ہے؛ کہیں ابتذال یا عریانی کا شائبہ تک نہیں۔ چھوٹی بحروں میں سہل ممتنع شعر کہنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

۴ نومبر کو دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کی ہدایت کی۔ ۳ دسمبر کو معدے میں درد کی شکایت کی، تو اسپتال بھیج دیے گئے۔ یہیں ہفتے کے دن ۵ دسمبر ۱۹۷۰ء رات کے ساڑھے گیارہ بجے دل کی حرکت بند ہو جانے سے رحلت کی۔ آخر تک بقائے ہوش و حواس خاندان کے افراد سے باتیں کرتے رہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

عکسِ رنگیں ہے نگاہِ شوق کا
اور شرحِ عالمِ ایجاد کیا

دل میں اک موجِ رنگ و بو اٹھی
آج یہ کس کی یاد آئی ہے

ہر نفس پیامِ محبت ہے، ہمنشیں!
یہ زندگی نہیں ہے، عبادت ہے ہمنشیں!

نظر آتے ہیں وہ کچھ مہرباں سے
گلہ کس کو ہے اب عمرِ رواں سے

دیکھتے ہیں تری نگاہوں کو
غم کے مارو دل کی زندگی کیا ہے!

بدگمانی کو بھی خدا سمجھے
کیا کہا میں نے، آپ کیا سمجھے
بدگمانی سہی بدگمانی ہے
تم محبت کو مدعا سمجھے

ہوں، تو میں ہوں برا زمانے میں
آپ اچھے ہیں! خیر، کیا کہیے
زندگی کٹ گئی خوش و ناخوش
اس کے آگے اب اور کیا کہیے
حالِ ناشاد پوچھتے کیا ہو
دل بھر آتا ہے؛ آہ، کیا کہیے!

عشق کی عظمتوں سے ناواقف
کر رہے ہیں ابھی جبیں سائی

میں تو کہتا ہوں، روگ ہے دل کا
اب تمھیں کہہ دو، ہے محبت کیا؟

جانے، کیا آج ہونے والا ہے
دل دھڑکتا ہے کیوں، خدا جانے

جس پہ لاکھوں مسرتیں صدقے
ایک ایسی بھی غم کی رات ہوئی

کاٹتا ہو جو عمر رو رو کے — اس کو کیا، دن ہوا کہ رات ہوئی
چاند تارے بھی اب تو سونے لگے — اے غمِ ہجر! کتنی رات ہوئی

ترے در سے اٹھ تو جاؤں، تو ہی منصفی سے کہہ دے
ہے مری جبیں کے قابل، کوئی اور آستانہ

ایک دل کی کلی نہ کھل پائی — پھول لاکھوں کھلے، بہار آئی

ناشاد کے سوا بھی بہت جاں نثار ہیں — کیوں یاد آئی آپ کو، اس خاکسار کی

جب بات بات پر وہ رہ رہ کے یاد آئیں — ناصح! تو ہی بتا دے، کیونکر انھیں بھلائیں
ہاں، چھوڑ دیں وہ الفت، لیکن یہ ہو سکے گا — وہ ہم کو بھول جائیں، ہم یاد بھی نہ آئیں
ناشاد کیا کہا یہ، کس نے کہا یہ تم سے — وہ یاد کر رہے ہیں، کیا خوب مان جائیں

اپنی خبر جو چاہے کوئی — کچھ بھی کرے، دل نہ لگائے

لطف و کرم کی تاب کسے ہے — رہنے بھی دو، اب دلجوئی

سجدے کرتے ہیں رات دن، لیکن — بندگی عمر بھر نہیں ہوتی

تم کسی کے نہیں زمانے میں — اک زمانہ مگر تمہارا ہے

سب ہے دل آنے کی بات — عشق نہ جانے جات کجات
تم سچے، یوں ہی جھوٹا — کون بڑھائے تم سے بات
عشق کا بھی کیا کھیل ہے، پیارے! — پیچھے بازی، پہلے مات
حال نہیں ناشاد کا اچھا — اب ہے اس پر بھاری رات

یہ مانا، ناشاد برا ہے — تم نے کوئی ایسا دیکھا؟

تذکرہ تھا گردشِ ایام کا — آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے

جان کر کون آگ سے کھیلے! — جان دے کون عاشقی کر کے!

دل سے کب تک بات بنائیں — ان کا کیا! وہ آئیں، نہ آئیں

ترکِ محبت کر دیں، لیکن — اس پر بھی جب وہ یاد آئیں
ہے بھی کچھ، یا کچھ بھی نہیں ہے — یوں ہی کب تک دھوکا کھائیں

سن کے ناشاد! پیار کی باتیں — یاد کیا آیا، آنکھ بھر آئی

کہنے کی بات اور ہے، کہنے کو کوئی کچھ کہے — سچ تو یہ ہے کسی سے بھی رسمِ وفا نبھی نہیں
رہ گئی دل کی دل میں بات، یونہی گزر گئی حیات — بات کچھ ایسی تھی نہیں، تم نے مگر سنی نہیں
دین پر اس کی شک نہ کر، ہاتھ ذرا دراز کر — دیکھ تو اس سے مانگ کر، اس کے یہاں کمی نہیں

وفا پر بھی مری کیا کیا گماں تھے — عجب وہ دن تھے، جب تم مہرباں تھے

یہ تجھ سے کس نے کہا، کچھ بتا تو، کس نے کہا — پیامبر! وہ یہاں آئینگے، یہاں، کب تک؟

حالِ ناشاد ان سے کیا کہیے — منھ سے نکلی، ہوئی پرائی بات

حالِ ناشاد سن کے فرمایا — یوں بھی ہوتا ہے، کوئی بات نہیں

یہ مانا حالِ دل اچھا نہیں ہے — پشیماں آپ ہوں، ایسا نہیں ہے
انھیں ہر بار ہم یوں دیکھتے ہیں — کہ جیسے آج تک دیکھا نہیں ہے
بہت جی چاہتا ہے، دیکھنے کو — بہت دن سے تمھیں دیکھا نہیں ہے

نگہِ ناز کہہ گئی سب کچھ — اور کہنے کو کچھ کہا بھی نہیں

لب تک آکر جو رہ گئی ہر بار — کہہ نہ پائے ہم ان سے بات وہی

ناشاد! تیرے چہرے کا کیوں رنگ اڑ گیا — اے خانماں خراب! کہاں کی ہوا لگی؟

○

آغا خلش کاشمیری، طفیل احمد

آغا خلش امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ مدرسی پیشہ تھے۔ سعادت حسن منٹو (ف جنوری ۱۹۵۵ء) نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں ان سے کچھ پڑھا تھا۔ جب افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کی شہرت ہوئی، تو بمبئی کے مشہور فلمی رسالے "مصور" کے مالک محمد نذیر صاحب نے انھیں اس کی ادارت کی پیشکش کی۔ منٹو نے اس شرط پر اسے قبول کرنے کی حامی بھری کہ میرے استاد آغا خلش کو بھی ادارۂ تحریر میں شامل کیا جائے۔ اس میں منٹو کی استاد پرستی اور سعادتمندی کا جذبہ ضرور تھا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ بڑی وجہ یہ تھی کہ منٹو کو اپنی زبان اور بیان پر پورا بھروسا نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ آغا خلش اگر ادارۂ تحریر میں آگئے، تو اس پہلو سے اطمینان رہیگا۔ یہ آزادی سے پہلے کا قصہ ہے۔

تو یہ تھے آغا خلش، زبان و بیان کے ماہر، شاعر اور شعر فہم، صحافی اور ادیب۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا جو مزاج تھا کہ "نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا" وہ شاید عمر بھر کبھی امرتسر سے باہر قدم نہ رکھتے، لیکن لکھے کو کون مٹا سکتا ہے، یوں وہ امرتسر سے بمبئی پہنچ گئے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس کے بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ منٹو پاکستان سدھارے اور مالک محمد نذیر

وہاں جو بنی آدم کی آخری منزل مقصود ہے۔

اب مصوّر، خلش کی زندگی کی گویا واحد دلچسپی بن گیا۔ اردو کے پرچوں کی جو حالت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ نذیر صاحب کے انتقال کے بعد مصوّر بھی رُو بانحطاط ہو گیا۔ اشتہار ملنا بند ہو گئے۔ چونکہ خلش صاحب دنیائے فلم کے خداؤں کے سامنے سربسجود نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے پرچہ ان کی سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ اس کے باوجود حوصلہ نہیں ہارے۔ کیا کیا مصیبت نہیں اٹھائی انھوں نے اس کے لیے۔ بیوی کے تن پر ڈھنگ کا کپڑا نہیں، گھر میں پیٹ بھر کھانے کو آٹا نہیں، مالکِ مکان کے دینے کو کرایے کے دام نہیں، لیکن یہ مردِ قلندر مصوّر کے لیے مانگے تانگے سے انتظام کر لیتا اور اسے چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا۔

آخر تا بکے، پریشان رہنے لگے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پریشانی اب ناقابلِ برداشت ہو گئی؛ ورنہ پریشان تو وہ سدا کے تھے۔ اس پر انھوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ سحری کے بغیر رمضان کے پورے روزے رکھے، کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ عید کے دن بیمار ہو گئے۔ صبح اٹھے اور بخار کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیا۔ یہ گویا سرسام کو دعوت تھی۔ دوستوں نے بیہوشی کی حالت میں جے جے اسپتال کے خیراتی وارڈ میں پہنچا دیا۔ وہیں ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء رات کے ساڑھے آٹھ بجے جاں بحق ہو گئے۔

جس دن مرے ہیں، ان کی بیوی کے پاس ساری جمع جتھا لے دے کے ۳۹ روپلے تھے۔ دوستوں نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور اگلے دن ۱۶ دسمبر سہ پہر کو انھیں ناریل باڑی (بمبئی) کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

لاولد فوت ہوئے۔ ۷۰ برس کے قریب عمر پائی۔ جناب نوراللہ نوری (تلمیذ جلیل مانکپوری) نے تاریخِ وفات کہی:

نہ کسی میں آ گئی یہ ادا، نہ کسی کی ہو گئی یہ روش	تری یاد ہم کو ستائے گی، نہ مٹے گی دل سے خلش خلش!
کوئی پوچھے تجھ سے جو سالِ غم، تو یہ کہنا اس سے بچشمِ نم	یہ ہے سالِ مرگِ دلِ حزیں! بسنہ عیسوی ہے "غمِ خلش"

۱۹۷۰ء

اردو زبان ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ لغات اور محاورات کے مصادر و مآخذ میں مبصرانہ مہارت تھی۔ زبان میں وہ کوئی بدعت بلکہ جدت تک بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے، اور اس معاملے میں ہر کسی سے الجھنے کو تیار رہتے تھے۔ معلومات اتنی وسیع اور معتبر تھیں کہ وہ کسی پر اعتراض کرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ اسی لیے شاید ان کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع نہیں تھا۔ جنازے کے ساتھ مٹھی بھر آدمی تھے، ۲۵-۳۰ سے زیادہ کسی صورت میں نہیں ہونگے۔

نمونۂ کلام میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

ان کو کیا نہ وعدۂ فردا نے شرمسار
رکھا کہیں کا بھی نہ ہمیں اعتبار نے

ہم کو منانا پڑ گئی اب میکدے کی خیر
چپکے سے شیخ جی جو لگے ہیں پدھارنے

کافر دل ہے مسلمان، بڑی مشکل ہے
تنگری میں بھی ہے ایمان، بڑی مشکل ہے

ڈر فقط یہ ہے کہ مر جائے نہ اپنا پانی
راہ میں پڑتی ہے ڈھلوان، بڑی مشکل ہے

سو گئی سایۂ دیوار میں قسمت میری
در پہ بیدار ہے دربان، بڑی مشکل ہے

جان نثار دل کا یہ دل گردہ ہے، تو جان بچا
جان سے جانا مری جان! بڑی مشکل ہے

شوق برباد ہے، فریاد و تمنا مردہ
بزم دل ہو گئی ویران، بڑی مشکل ہے

موت ہے لذت ایذا طلبی پر طاری
مشکلیں ہو گئیں آسان، بڑی مشکل ہے

سخت جانی کی بندھی وعدۂ فردا سے ہوا
پر خطا ہو گئے اوسان، بڑی مشکل ہے

ہم نے مانا ہے پریشانی خاطر کا سبب
زلف خود بھی ہے پریشان، بڑی مشکل ہے

آدمیت کی علامت ہے خلش البتہ
آدمی کون ہے، پہچان، بڑی مشکل ہے

پسند آیا ہے دل میرا، تو اپنے پاس رہنے دو
مجھے ساری خدائی گر برا کہتی ہے، کہنے دو

جگر کا سوز، دل کا داغ، دو تمغے ہیں الفت کے
محبت کی سجاوٹ کو، مجھے کافی ہیں گہنے دو

خدا رکھے، اکیلے ہو، اکیلے تم ہزاروں میں ہزاروں دکھ اکیلی جان پر مجھ کو بھی سہنے دو
مجھے اجڑے ہوئے دل کی زمیں سیراب کرنا ہے گھڑی بھر کے لیے آنکھوں کے دریاؤں کو بہنے دو

لباسِ شرم ہے بیشک مضافِ جامۂ ہستی
خلشؔ کی آدمیت نے بھی کپڑے ہیں یہ پہنے دو

○

دیا بریلوی۔ نارائن داس ٹنڈن

۱۹۰۱ء میں بریلی (محلہ بہاری پور) پیدا ہوئے۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان تجارت پیشہ تھا، کپڑے کی آڑھت کا کاروبار تھا؛ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔
جب ۱۹۲۴ء میں ان کے والد لالہ بہاری سرن ٹنڈن (کھتری) کا انتقال ہوا، تو نہ صرف کاروبار کا بلکہ پورے خاندان کی دیکھ بھال کا بار بھی ان کے کندھوں پر آپڑا۔ انھوں نے اسے مردانہ وار اٹھایا؛ کام کو ترقی دی اور اس میں بہت کامیاب رہے۔ خوب دولت پیدا کی، جس سے ان کا شہر کے معزز اور با اثر لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔
انھوں نے پرانے طرز کی اردو فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ ہنوز مڈل کے درجوں میں پڑھتے تھے کہ اپنے استاد منشی رگھبیر دیال کے اردو فارسی کے دلآویز طریقۂ تعلیم اور شعر خوانی سے متاثر ہو کر ۱۹۱۵ء میں شعر کہنے لگے۔ بہت دن تک کسی کو اس کا علم نہیں ہوا۔ دو سال بعد جب منشی رگھبیر دیال کو اس کا پتہ چل گیا، تو انھوں نے مشورہ دیا کہ اپنے کلام پر ماسٹر بلدیو پرشاد سوزن سے اصلاح لیا کرو۔ سوزن مرحوم قوم کے کائستھ، بڑے پختہ مشق اور زود گو شاعر تھے؛ عین محفلِ مشاعرہ میں بیٹھے بیٹھے پوری غزل کہہ لیتے تھے۔ ابتدا میں مولانا حسن رضا خاں

حسن بریلوی تلمیذ داغ (ف اکتوبر ۱۹۰۸ء) سے کچھ استفادہ کیا تھا، لیکن باقاعدہ اصلاح منشی رام بہادر لال جویا آنولی (ف ۱۹۴۸ء) سے لی۔ بریلی کے بیشتر ہندو شاعر سوزن کے شاگرد ہیں۔ عمر کے آخری ایام میں دماغ کا توازن بگڑ جانے سے یونہی بازاروں میں گھوما پھرا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ دیا نے سوزن سے استفادے کا اعتراف ایک قطعے میں بھی کیا ہے:

کچھ تو عرفانِ تغزل، کچھ شعورِ فن کا فیض
طبع کی کچھ جدّتیں، کچھ دانشِ روشن کا فیض
اب حدِ احساس میں ہے منزلِ شعر و سخن
رہبرِ فکرِ دیا ہے حضرتِ سوزن کا فیض

استاد نے ۱۹۳۵ء میں فارغ الاصلاح کر دیا تھا، بلکہ اس کے بعد اپنے مبتدی تلامذہ کو بھی ان سے مشورہ کرنے کی ہدایت فرماتے۔ دیا مرحوم عام طور پر مشاعروں میں نہیں جاتے تھے۔ ایک تو گروہ بندی سے نفرت تھی، اسی پر ہر کہ و مہ کو جو داد دی جاتی ہے، اس سے بہت منغض ہوتے تھے۔ ہاں، خاص احباب کی محفل میں خوب چہکتے تھے۔ طوعاً و کرہاً کبھی مشاعرے میں جاتے، تو بڑے وقار سے ہلکے ترنم میں پڑھتے، یوں معلوم ہوتا تھا، گویا خود اپنے کلام کی کیفیت میں محو ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی کہتے تھے۔ دیا تخلص ایسا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں جگہ آسانی سے استعمال ہو سکتا ہے۔

پرانی وضع کی تعلیم اور اساتذہ کی تربیت کے زیر اثر غزل سے مزاولت ہونا ہی چاہیے تھی: اس کے علاوہ انھوں نے آزاد نظمیں بھی کہیں اور مشاعروں میں سنائیں۔ انتخابِ کلام "شامِ بہاراں" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (لکھنؤ ۱۹۶۷ء)، اس میں غزلیات، نظمیات، قطعات سبھی کچھ ہے۔ ہندی کلام غالباً شائع نہیں ہوا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۰ء کو بریلی میں انتقال ہوا۔ فشارِ دم (بلڈ پریشر) کے پرانے مریض تھے، لیکن موت کا

نوری سبب فالج ہوا۔

ان کے دم قدم سے بریلی میں اردو ادب شعرگوئی کا چرچا تھا۔ زیادہ شاگرد بنانے کے قائل نہیں تھے، اس میں اہلیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ جناب گوپیشور زرائن مہرا وکیل بریلی، مہر تخلص ان کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔

اب نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں، جو ان کے مجموعۂ کلام "شام بہاراں" سے ماخوذ ہیں:

مجھ پہ جب رازِ دلِ مضطر کھلا
اک تماشا بن گیا میرا سکوں

ہے درِ رحمت، دیا سب پر کھلا
رندِ میخانہ ہو، یا شیخِ حرم

جس کو دیکھو، وہ پارسا نکلا
وعظ کعبے میں، گھر میں مینوشی

درد بھی دل کا آسرا نکلا
اپنے شکووں پہ ہے دیا، نادم

نہیں دنیا میں کوئی ناتواں کا
دلیلِ زندگی ہمت، دیا ہے

ایسے گستاخ غباروں سے مجھے کیا لینا!
جن کی پرواز میں پنہاں ہے فریبِ منزل

ہر اک ادا پسند سہی، اعتبار کیا!
کیف بہار کیا ہے، مذاقِ بہار کیا

زباں بیچ ڈالی، دہن بیچ ڈالے
یہ ہے آج کل اہلِ دنیا کا ایماں

گلوں نے حسیں پیرہن بیچ ڈالے
بہاروں نے بیچا ہے نازِ بہاراں

نئی بندگی ہے، نیا آستانہ
ترا شکریہ، انقلابِ زمانہ!

سنائیں، تو کس کو سنائیں فسانہ
نہ پہلی سی باتیں، نہ پہلا زمانہ

ترکِ مے بجا آسان نہیں
ترکِ مے کی بات

جلوؤں کا ایمان نہیں
اس کو غم، اُس کو تسکیں

ہوتا اطمینان نہیں،
دل میں ہیں ان کے جلوے

شامِ غم بھی بے سرو سامان ہے
اب نہ وعدہ ہے، نہ کچھ پیمان ہے

درد ہے غم ہے، ترا ارمان ہے
عشق نے کیا کیا عطا کی نعمتیں

سوچ کر کہیے کہ مشکل ہے عمل
بات کہہ دینا بہت آسان ہے

کعبہ ہے، بتکدہ ہے، نقشِ قدم کسی کا
معراجِ زندگی ہے سجدوں کی انجمن میں

میں تو دیوانہ ہوں، ویرانہ ہے میری جنت
جن میں رہتی ہیں بہاریں وہ جہاں کیسے ہیں

دنیا کی آرزو، کبھی عقبیٰ کی جستجو
بزمِ غمِ حیات بھی تنہا نہ رہیگی

وعدہ کی بات چھوڑیے، وعدہ سکوں نہیں
وہ دن نہ ہے نصیب، تمنّا نہ رہیگی

غم نے عطا کیا، دیا! احساس زندگی
اک دردِ لا دوا کی دوا آج ہوئی ہے

تمھارے در سے کیفِ دوام ملتا ہے
ہر ایک درد نہیں دردِ جاوداں کی طرح

کبھی گلوں کا فسانہ، کبھی بہار کی بات
قفس میں، زندگی گذری ہے آشیاں کی طرح

رہِ حیات میں تیرا کرم، غمِ منزل!
ہمیشہ ساتھ رہا میرے پاسباں کی طرح

بہت اکتا گیا دیر و حرم سے
کسی کا سنگِ در ہے، اور میں ہوں

عزیزوں نے دیا کچھ اور کاندھا
بہت لمبا سفر ہے، اور میں ہوں

مسکرا کر یہ کہا: آپ کو دیکھا ہے کبھی
نام جب میں نے بتایا، تو برا مان گئے

فخرِ صد ناز تھی خاموشِ تمنّا میری
حالِ دل ان کو سنایا، تو برا مان گئے

کتنے دیوانے ہیں ہم، سودا کہاں کا سر میں ہے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس کو، جو ہمارے گھر میں ہے

رسوا ہے ادھر شمعِ سوزاں، بدنام اُدھر پروانے ہیں
یہ محفل ہے دیوانوں کی، اس راز کو کوئی کیا جانے!

چشمِ نمناک! کہاں ہیں وہ لہو کے آنسو؟
رنگ بھرتے تھے جو برسات کے آئینے میں

کچھ پتا چل نہ سکا، حدِ نظر تک جس کا
اس کو دیکھا ہے خیالات کے آئینے میں

بہارِ گل میں، نہ رنگ و بوئے بہار میں ہے
شعورِ زندگی جتنا خلوصِ خار میں ہے

یہی ہے دادِ تحشر! ذرا سی مجبوری
زباں کی بات ابھی دل کے اختیار میں ہے

یہ بہاریں بھی تجھی سے ہیں، خزاں بھی تجھ سے
ہم بہرِ عیش، بہرِ غم تیرے داماں میں رہے

فکرِ بہار، خوفِ نشیمن، وطن کا غم — دنیا کی ہر بہار ہمارے چمن میں ہے

وہ رنگِ تبسم، وہ حسنِ تغافل — مرے غم کو تو نے کہاں سے صدا دی

وہ ہونگے جنھیں جستجوئے سکوں ہے — مری زندگی ہے، مری نامرادی

ہے اتنی سی تعبیرِ خوابِ دیا کی — کسی نے کسی کو کہانی سنا دی

باسط اوجینی، نیاز محمّد خان

اوجین کے ایک جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ تھے؛ ۲۴ فروری ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا، لیکن ان کے والد غلام محمد خان (ف ۱۹۶۸ء) نے، نہ معلوم کس ترنگ میں اپنی ساری جاداد عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کر دی، حد یہ کہ اپنے پاس بسر اوقات تک کے لیے کچھ بھی نہیں رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ باسط صاحب کی ابتدائی عمر بڑی تنگی ترشی میں گزری، اور اسی باعث تعلیم بھی نامکمل رہ گئی؛ بمشکل آٹھویں درجے تک پڑھ سکے۔ یہ کمی کسی حد تک انھوں نے بعد کو ذاتی مطالعے سے پورا کرنے کی کوشش کی؛ اور یوں اردو اور ہندی دونوں پر پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔

چونکہ ان کے والد غلام محمد خان صاحب نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تحریک میں ہمیشہ قوم پرور رویہ اختیار کیا تھا، باسط بھی نوجوانی سے سیاست میں حصّہ لینے لگے۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے اچھوتوں کو برابر کے حقوق دلانے کی مہم چلائی، تو باسط نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس میں انھیں خود اپنے خاندان کے اکثر افراد، اور خاص کر مسلم لیگ کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے کسی کی پروا نہ کی اور جواب میں کہہ دیا:

وہ ہو کعبہ یا کہ مندر، تو غرض نہ رکھ کسی سے
تجھے آدمی بنا دے، وہ حرم قبول کر لے

کانگریسی خیالات کا مؤید ہونے کی وجہ سے، نہ صرف مخالفت کسی طرح کم نہ ہوئی، بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر انھیں ترکِ وطن کرنا پڑا۔ اب انھوں نے بمبئی کی راہ لی۔ یہاں انھوں نے ۱۹۴۵ء میں ’ناخدا‘ نام کا ایک ہفتہ وار پرچہ جاری کیا۔ تین برس بعد ۱۹۴۸ء میں بعض احباب کی دعوت پر بھوپال پہنچے۔ وہ مختلف اوقات میں بھوپال کے کئی رسائل و جرائد مثلاً ہفتہ وار بکار، روزنامہ ندیم، ہفتہ وار اُجالا (ہندی) نیا قدم (ہندی) سے بحیثیت نائب مدیر اور مترجم وابستہ رہے۔ اپنے دورانِ قیام میں وہ بھوپال کے سماجی اور تعلیمی حلقوں میں بہت سرگرم تھے۔ خاصی مدت تک مدھیہ پردیش کانگریس کمیٹی کے مرکزی دفتر میں بھی ملازم رہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انھیں سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ نہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حالات بدستور ناموافق تھے؛ ہر نیا دن اپنے ساتھ نئی مشکلات لاتا۔ لیکن اس سے ان کی پیشانی پر کبھی بل نہیں آیا۔ انھوں نے اول روز جو راہ اختیار کر لی تھی، استقلال اور انجام سے بے پروا ہو کر اس پر گامزن رہے۔ ان کا آخری زمانے کا ایک شعر ہے:

یہ بات دوسری ہے کہ کچھ تھک گئے ہیں ہم
لیکن ہمارے حوصلے منزل کے پاس ہیں

ان کی مستعدی اور جذبۂ خدمتِ خلق کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب یک لخت مدھیہ پردیش کی حکومت نے دفاتر کی زبان ہندی کر دی، اور اردو دان ملازم اس سے بہت سراسیمہ ہوئے کہ اب کیا ہوگا، تو باسط صاحب ان کے آڑے آئے۔ انھوں نے ہندی پڑھانے کو ایک شبینہ اسکول جاری کر دیا، نصاب کے لیے خود ایک کتاب ”آسان ہندی“ لکھ کر چھاپی۔ اور یوں دن رات کی محنت سے مختصر مدت میں سرکاری ملازموں کو (اور غیر ملازموں کو بھی)

اتنی ہندی سکھا دی، جس سے وہ اپنا منصبی کام ہندی میں سرانجام دینے کے قابل ہو گئے۔
اردو کے فروغ کے لیے انھوں نے بھوپال میں بعض احباب کے تعاون سے ایک "بزمِ سخن" بھی قائم کی تھی۔ چین اور پاکستان کے ساتھ لڑائی کے زمانے میں اس بزم نے کل ہند مشاعرے منعقد کیے، اور ان سے جو آمدنی ہوئی، وہ ملک کے دفاعی چندے کی نذر کر دی۔
لمبے عرصے تک مسلسل کثرتِ کار اور کافی آمدنی کے فقدان اور پریشان حالی نے رفتہ رفتہ ان کی تندرستی کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں اور تپِ دق نے آدبوچا۔ اب یہ مرض لاعلاج نہیں رہا۔ لیکن ڈھنگ کے علاج کے لیے بھی تو روپیہ درکار ہے؛ اور یہی ان کے پاس تھا نہیں۔ سب سے پہلے اس کا ہلکا سا حملہ ان کے قیامِ بمبئی کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس پر دوستوں نے انھیں ٹاٹا میموریل اسپتال میں داخل کر دیا۔ یہاں سے وہ بظاہر اچھے ہو کر گھر آ گئے؛ لیکن واقع میں روگ جڑ سے نہیں گیا تھا۔ بھوپال میں دن رات کی جفاکشانہ زندگی سے وہ دبے ہوئے اثرات پھر ابھر آئے۔ پہلے بھوپال کے اسپتال میں علاج ہوتا رہا۔ جب کچھ افاقہ ہوا، تو یہاں سے اپنے وطن اوجین کے اسپتال میں منتقل ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اسی میں ۱۷ دسمبر ۱۹۷۰ء صبح نو بجے اپنے مکان پر انتقال ہو گیا؛

اسی دن عصر کے بعد عیدگاہ قبرستان میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے قریب دفن ہوئے۔ اولادِ جسمانی میں ایک لڑکا (اعجاز شمس) اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔
سیاست کی طرح شعرگوئی کا شوق بھی کم عمری میں پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں عبدالرحیم حسرت قریشی (ف ۱۹۶۰) کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ اور پھر خود بزورِ بازو وہ مقام پیدا کر لیا کہ آج بھوپال اور مالوے میں ان کے بیسیوں صاحبِ دیوان شاگرد موجود ہیں۔ افسوس ان کا اپنا مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ مدت ہوئی، ان کے شاگرد صہبا قریشی صاحب نے ان کے سو شعر ایک کتابچے میں شائع کیے تھے (بھوپال ۱۹۴۸ء) دیوان "نقشِ آرزو" کے عنوان سے مرتب موجود ہے۔ ہندی میں بھی ایک کتاب "جیون ریکھا" (اپنے حالات میں)

غیر مطبوعہ رہ گئی۔ اس کے علاوہ بہت کلام مختلف رسائل میں بھی منتشر حالت میں پڑا ہے۔
نمونے کے طور پر چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

محبت کو زمانہ عین راحت جب سمجھتا ہے — محبت میں مری حالت الٰہی! ادیدنی کیوں ہو!

کاشانۂ حیات کی تاریکیوں کا حل — تاروں سے پوچھتے ہیں، کبھی چاندنی سے ہم

زندہ دلی کسی کی جفاؤں نے چھین لی — اب اہتمام عرض تمنّا نہیں رہا

میری بدبختی کے باعث غرق کشتی ہو گئی — کچھ نہیں طغیانیِ امواج سے شکوہ مجھے

وارفتگیِ شوق نے بیخود بنا دیا — ہم انتہائے منزلِ جاناں نہ کر سکے

ذوق سجودِ عشق کا اللہ رے احترام! — سر کو اٹھا سکے نہ ترے آستاں سے ہم

عشق کے سوز و ساز سے قلب کو آشنا تو کر — اب بھی وہی ہیں شوخیاں حسن کے التفات میں

اکتسابِ مآلِ غم کے لیے — زندگی ہے، مگر بہت کم ہے
انتہائے وفا شعاری بھی — اک دلیلِ فریبِ پیہم ہے

یہ سجدہ عارفانہ بڑے کام کے ہیں، لیکن — وہی سجدہ بجھتا ہے، جو صنم قبول کر لے

محفل سے لاکھ دور سہی دل کے پاس ہیں — طوفاں بدوش ہیں بھی تو ساحل کے پاس ہیں
یہ بات دوسری ہے کہ کچھ تھک گئے ہیں ہم — لیکن ہمارے حوصلے، منزل کے پاس ہیں
بیمارِ غم کو جامِ خوشی بھی عطا کیا — ایسے کمال بھی مرے قاتل کے پاس ہیں
شعر و ادب کی شمع جلائی ہے اس لیے — پروانۂ ادب تری محفل کے پاس ہیں

غم بھی مجھے ملا ہے خوشی بھی ملی مجھے
باسطؔ! یہ دو خزانے مرے دل کے پاس ہیں

○

شاغل جیپوری، احتزام الدین احمد عثمانی

ان کا سلسلۂ نسب ۳۵ واسطوں سے حضرت عثمان خلیفۂ سوم سے ملتا ہے۔ خاندان کا مسقط الراس گازرون من مضافات شیراز تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ مولوی درویش محمد متقی بدایوں تھے، جہاں سے ان کے ایک بیٹے مولوی امین الدین ۱۱۶۴ھ میں قاضی مقرر ہو کر نارنول (پنجاب) چلے آئے۔ اس طرح خاندان کی ایک شاخ نارنول میں بس گئی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دنیا دگرگوں ہوگئی تھی۔ کئی اور شرفا کی طرح شاغل کے تایا مولوی محمد عثمان تسلیم (خلف قاضی حبیب الدین) کو بھی تلاش روزگار میں وطن سے نکلنا پڑا۔ تسلیم اچھے عالم اور اردو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کا کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ بہت ہے۔ منجملہ ان کے مثنوی حدیقۃ المذہب بھی ہے، جو انھوں نے مسدس حالی کے جواب میں لکھی تھی، یہ چھپ چکی ہے (اودھ ۱۳۰۵ھ) انھوں نے کلام پر اصلاح اپنے ماموں مولانا رشید الدین فاروقی متخلص بہ منتظر و فائز (ف ۱۸۸۶ء) سے لی تھی۔ فائز پہلے سے اورینٹل کالج، جیپور میں مدرس اوّل ہو کر چلے گئے تھے۔ تسلیم بھی ۱۸۵۸ء میں یہاں کے مدرسۂ تعظیمیہ میں مدرس اوّل ہو کر آئے اور پھر مدت العمر گویا جیپور کے ہو کے رہ گئے۔

کچھ دن اس مدرسے میں کام کیا تھا کہ ریاست کے مفتی ہو گئے۔ ان کا انتقال اپنے وطن نارنول میں ۲۲ اپریل ۱۸۸۴ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۳۰۱ھ) کو ۵۴ سال کی عمر میں ہوا۔ وہیں اپنے خاندانی قبرستان میں آسودۂ خواب ابدی ہیں۔

تسلیم کے ایک چھوٹے بھائی محمد احتشام الدین تھے۔ یہ بھی شاعر تھے، شوکت تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ریاست جیپور کے محکمۂ پولیس میں ملازمت کی اور ترقی کے مدارج طے کرکے کورٹ انسپکٹر مقرر ہو گئے؛ اس زمانے میں پوری ریاست میں صرف ایک ہی کورٹ انسپکٹر ہوتا تھا۔ ان کا ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو جیپور میں انتقال ہوا؛ وہیں گھاٹ دروازہ کے باہر کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کی ایک کتاب سلسلۃ المذہب طبع ہو چکی ہے۔

شاغل صاحب انھیں مولوی محمد احتشام الدین کے صاحبزادے تھے۔ ہفتے کے دن ۴ دسمبر ۱۸۹۶ء (۲۸ جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ) کو جیپور میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں منتہی تھے اور یہ اپنے خاندان کے مختلف بزرگوں سے پڑھی تھی؛ کچھ عربی بھی جانتے تھے۔ والد کی حیات میں انھیں کبھی کوئی کام کرنے کی فکر نہیں ہوئی۔ جب ان کا سایہ سر سے اٹھ گیا (۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء) تو اب یہ چونکے۔ خوش قسمتی سے والد کی ملازمت آڑے آئی اور یہ کوتوال مقرر ہو گئے۔ (۱۴ جنوری ۱۹۱۷ء) ملازمت کا پورا دور پولیس کے محکمے ہی میں گذرا، اور یہیں سے آخری مرتبہ ۱۹۵۱ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد کوئی دو برس تک مسلم ہائی اسکول میں اردو فارسی کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ شدید اور طویل علالت کے باعث یہاں سے فارغ ہوئے تو پھر کوئی کام نہیں کیا۔ خدا کے فضل سے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ایک زمانے سے قبض کی شکایت تھی۔ جاڑوں میں نزلہ بھی دائمی رفیق تھا۔ اب کے ان دونوں امراض نے شدت اختیار کر لی اور اسی میں ۸ جنوری ۱۹۷۱ء صبح سات بجے دار فانی کو خیرباد کہا۔ بیرن گھاٹ دروازہ (جیپور) کے قبرستان میں آخری خواب گاہ نصیب ہوئی۔

انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

اولادِ جسمانی میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار رہیں۔ بڑے ابوالفضل محمود الدین عثمانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (شعبۂ سیاسیات) میں ملازم ہیں اور چھوٹے ڈاکٹر ابوالفیض اسلام الدین عثمانی گورنمنٹ کالج، ٹونک میں اردو کے مدرس۔

گھر بھر کا ماحول، علم و فضل اور شعر و شاعری کا تھا، چنانچہ یہ بھی چھوٹی ہی عمر میں شعر کہنے لگے۔ اس ہی اولاً چند دن اپنے رشتے کے بڑے بھائی اساس الدین احمد تسنیم (ف ۱۳۴۳ھ) سے اصلاح لی اور پھر انھیں کے کہنے پر میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی (ف اکتوبر ۱۹۳۱ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ مائل خود امراؤ میرزا انور کی وفات (۱۳۰۲ھ) کے بعد شاغل صاحب کے تایا تسلیم سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ شاغل تخلص رکھنے کا باعث یہ ہوا کہ ایک تو یہ استاد کے تخلص مائل کا ہمقافیہ تھا، دوسرے اس سے ان کے آغازِ شاعری کا سال برآمد ہوتا ہے یعنی ۱۳۳۱ھ۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ شاغل نے شاعری پر کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی۔ محض تفننِ طبع سے کبھی کچھ کہہ لیتے تھے اور اسے بھی محفوظ رکھنے کا التزام نہیں تھا۔ وہ نثر بھی لکھتے تھے۔ ان کی متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں بعض محکمۂ پولیس کے انتظام اور قاعدے قانون سے متعلق ہیں۔ زیادہ اہم دو علمی کتابیں تذکرۂ شعرائے جےپور (دلی ۱۹۵۸ء) اور صحیفۂ خوشنویساں ہیں (دلی ۱۹۶۳ء)؛ یہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی بہت اچھے خوش نویس تھے، ابھی پارسال (۱۹۷۰ء) اپنے دیوان کا پہلا حصہ شائع کیا تھا۔ اس کی کتابت بھی انھوں نے خود کی تھی! ان کی تحریر ایسی عمدہ اور روشن اور خوشخط ہوتی تھی، جیسے موتی پروئے ہوں۔ بہت کچھ غیر مطبوعہ بھی رہ گیا۔ ان کے مرنے سے ایک شریف انسان اور اردو کا ایک شیدائی ہم سے جدا ہو گیا۔

نمونۂ کلام میں کچھ اشعار درجِ ذیل ہیں:

دل اختیار کا، نہ جگر اختیار کا — اب دیکھیں حشر کیا ہو شبِ انتظار کا
دونوں ہی وقت سخت ہیں میخوار کے لیے — آنا بہار کا ہو کہ جانا بہار کا
شاغل ہے، اور شغلِ مے خوشگوار ہے — اللہ رے، فیضِ ساقیِ فصلِ بہار کا

کیوں ڈریں، اس کے بعد کیا ہو گا — اب ہی کیا کم ہے، جو سوا ہو گا
پوچھتے کیا ہو، حالِ شاغل کا — میکدے میں کہیں پڑا ہو گا

نہ وہ آئے، نہ موت آئی، نہ صبر آیا، نہ دل ٹھہرا — شبِ فرقت نہ کام آیا مرے آہ و بکا کرنا

یہی آسان تھا، زاہد! کہ شیخِ وقت بن بیٹھے — مگر انسان بننا پیر و مرشد! سخت مشکل ہے

ہم پر کبھی ساقیِ کوثر کا کرم تھا — اپنا بھی کبھی شیشۂ دل ساغرِ جم تھا
اب کون ہے، ویران ہے دنیائے محبت — پروانے کی اک ذات تھی، یا شمع کا دم تھا
اس کی نگہِ ناز کا، اللہ رے تصرف! — پڑتے ہی سراخانۂ دل رشکِ حرم تھا

ہاتھ میں جام، سبو دوش پہ، آنکھیں مخمور — کوئی شاغل سا زمانے میں مسلماں دیکھا
کعبہ ہو، کلیسا ہو کہ بتخانہ ہو، شاغل! — میخانے سے بڑھ کر نہیں سامانِ محبت

دنیا و دیں سے دور، صواب و خطا سے دور — اس کے قریب ہو کے، ہوئے ماسوا سے دور

کعبہ میں، کلیسا میں، اسے ڈھونڈ کے آخر — حد یہ ہے کہ آ پہنچے ہیں اب کوئے بتاں تک

الفت بھی ہے کیا چیز، شکایت کی کوئی بات — نکلی بھی اگر دل سے، تو آئی نہ زباں تک

وہ اگلا سا، ہمدم! زمانہ کہاں — چمن ہی نہیں آشیانہ کہاں
جو نکلوں قفس سے، ٹھکانہ کہاں — یہاں کے سوا آب و دانہ کہاں

آہیں اثر کریں، نہ دعائیں اثر کریں — یارب! جہانِ عشق میں کیونکر اثر کریں!

کیا کہا آپ نے، پھر تو کہو اک بار نہیں — ہم وفادار نہیں، تم تو جفاکار نہیں؟

تا عرش بریں حسنِ بشر دیکھ رہے ہیں — ہم وسعتِ دامانِ نظر دیکھ رہے ہیں

پیرِ مغاں کے ساتھ، نہ شیخِ زماں کے ساتھ — اپنا تو کارواں ہے، غمِ کارواں کے ساتھ

قدر ہوتی نہیں ہے ناموں کی — بلکہ ہوتی ہے نیک کاموں کی
عاشقی ہو کہ شعر گوئی ہو — کس کو فرصت ہے ایسے کاموں کی
قوم کا کام کر نہیں سکتے — فکر جن کو ہے اپنے ناموں کی
سر جھکاتے رہے، جو ساری عمر — ان کو خواہش ہے اب سلاموں کی

اب تو ساقی بھی کہہ اُٹھا، شاغل!
"فکر کیجیے، حضور! داموں کی!"

یہ بھی کم بات نہیں ہے ہر گز — ظلم پر اس کو ندامت ہی سہی
آیئے، شیخِ حرم سے مل لیں — نہ سہی فیض، زیارت ہی سہی

دل کس کو دے دیا ہے، بتاؤ تو کیا ہوا؟ — شاغل! نظر جو آتے ہو تم بیقرار سے

اسی کا نام محبت ہے شاید، اے شاغل! — کہ کھینچتی ہے کوئی چیز دل کے اندر سے

عشق صادق ہو تو خود راہنما ہوتا ہے — خضر بھی ورنہ جو مل جائیں تو کیا ہوتا ہے!
دیکھ کر رنگ حریفانِ زمانہ شاغل! — شکوہ ہوتا ہے، مگر شکوہ سے کیا ہوتا ہے

جو ہو تمیز، تو سب کچھ ہے بزمِ عالم میں — یہی بہشتِ بریں ہے، یہی جہنم ہے
حرم میں، دیر میں، دل میں، کہاں نہیں پھر بھی — تری تلاش میں مصروف ایک عالم ہے
مزید لطف و عنایت کی فکر کیوں کیجیے — تمھاری ایک نگاہِ کرم ہی کیا کم ہے
جو ہو قبول، تو کافی ہے ایک ہی سجدہ — نہ ہو قبول، تو بیکار شکرِ پیہم ہے

فصلِ بہار آتے ہی کیا رنگ ہو گیا — دامن کا ہوش ہے، نہ خبر آستیں کی ہے
دنیا سے واسطہ بھی نہیں، شیخِ وقت کو — اور فکر بھی جناب کو روئے زمیں کی ہے

عابد لاہوری، سید عابد علی

پچھلی صدی میں شیعی فرقے کے ایک مشہور فرد ارسطو جاہ سید رجب علی شاہ ہوئے ہیں۔ وہ ہماری زبان کے بے مثل انشا پرداز محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے شاگرد تھے یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد آزاد بے سرو سامانی کے عالم میں دلّی سے نکلے، تو انھوں نے استاد زادے کی دلدہی کی اور انھیں اپنے پاس رکھا۔

ارسطو جاہ، غالب کے مکتوب الیہم میں بھی ہیں۔ وہ ۱۸۰۶ء میں تلونڈی (ضلع جگراؤں، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ تلونڈی کا علاقہ ان کے بزرگوں کو حکومت مغلیہ کی طرف سے بطور جاگیر ملا تھا۔ لیکن سکھ حکومت نے انھیں یہاں سے بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد یہ لوگ جگراؤں میں آکر بس گئے۔ سید رجب علی شاہ نے وطن کے علاوہ دلّی کالج میں بھی تعلیم پائی، اور چندے یہاں ریاضی کے مدرس بھی رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں وہ دلّی ہی میں تھے، اور اس زمانے میں شہر سے پہاڑی دھیرج پر مقیم انگریز افسروں کو اطلاعات پہنچاتے رہے تھے۔ ان شاندار خدمات کے صلے میں انھیں بعد کو دس ہزار نقد انعام اور "خان بہادر" اور "ارسطو جاہ" کے خطاب ملے۔ اور جگراؤں میں تین ہزار سالانہ کی

جاگیر بھی۔ نیز انھیں لفٹننٹ گورنر پنجاب کا میر منشی مقرر کیا گیا۔ ان کا ۹ ستمبر ۱۸۶۹ء (۲ جمادی الثانی ۱۲۸۶ھ) کو انتقال ہوا۔

ارسطو جاہ کے بیٹے سید حسن شاہ تھے۔ یہ مدتوں پنجاب کے محکمۂ پولیس میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ ان کے بیٹے سید غلام عباس نے فوج کی ملازمت کو ترجیح دی۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ ملک کے مختلف مقامات میں مقیم رہے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے؛ صفیر تخلص تھا۔ خدا نے اولادِ جسمانی میں انھیں یکے بعد دیگرے پانچ بیٹے عطا فرمائے، لیکن سب صغر سنی میں داغِ جدائی دے گئے۔ جس زمانے میں وہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں تعینات تھے، ان کے ہاں ۱۲ ستمبر ۱۹۰۶ء کو اللہ آمین سے بھر (چھٹا) بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام انھوں نے عابد علی رکھا۔ خدا نے اسے زندہ رکھا اور وہ فخرِ خاندان ثابت ہوا۔ یہی اردو زبان کے مشہور شاعر اور ادیب، مصنف اور مترجم سید عابد علی ہیں، جن کا پچھلے دنوں لاہور میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد خدا نے سید غلام عباس کو اور تین بیٹے اور چار بیٹیاں دیں، اور بحمدہٖ یہ سب آج تک حیات ہیں۔

عابد صاحب کی ابتدائی تعلیم ڈیرہ اسمٰعیل خان ہی میں ہوئی اور وہ چھٹے درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد رنگ محل (لاہور) کے مشن ہائی اسکول میں آ گئے، دسویں درجے کی سند یہاں سے پائی؛ ۱۹۲۳ء میں بی اے پاس کیا اور ۱۹۲۵ء میں وکالت کا امتحان۔ اب انھوں نے گجرات (پنجاب) میں وکالت شروع کی۔ میں نے ۱۹۲۴ء میں وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول، وزیر آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ انٹر کالج، گجرات میں داخلہ لیا تھا۔ چونکہ میں یہاں دیر سے پہنچا تھا، اس لیے مجھے کالج کے ہوسٹل میں جگہ نہیں ملی تھی، اور میں شہر ہی میں ایک کرایے کے کمرے میں مقیم تھا۔ رفتہ رفتہ واقفیت کا حلقہ وسیع ہوا، تو بعض دوستوں کے ساتھ میں یہاں کی بزمِ سخن کے ہفتہ واری مشاعروں میں بھی جانے لگا۔ عابد صاحب ان مشاعروں میں بحیثیت شاعر شریک ہوتے تھے۔ اختر شیرانی

(ف ۱۹۴۸ء) سے ان کی دانت کاٹی روٹی تھی اور دونوں ہم مشرب و ہمراز تھے۔ ان دنوں وہ بھی اکثر لاہور سے گجرات آیا کرتے تھے اور انھیں کے مہمان ہوتے تھے۔ عابد صاحب کا یہ شعر اسی عہد کا ہے:

گلپاش و زرنگار ہے گجرات کی زمیں
ہے اس جگہ قیام میری مستِ ناز کا

غرض میں نے عابد صاحب کو (اور اختر شیرانی کو بھی) پہلی مرتبہ یہیں گجرات میں دیکھا۔ اس زمانے کا گجرات سراسر شعر و نغمہ تھا۔ یہاں کے در و دیوار جنتِ نگاہ و فردوسِ گوش، کا مصداق تھے اور ہر کوچہ اوراقِ مصور کا نمونہ۔ وکالت بڑی غیور بیگم ہے، یہ کسی سوت کو پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ ہمہ تن اس کے ہو کے نہ رہ جائیں تو آپ اور خواہ کچھ بھی ہو جائیں، کامیاب وکیل نہیں بن سکتے۔ عابد صاحب کے تو وکالت کے ساتھ ایک چھوڑ دو دو علتیں لگی تھیں، شاعری اور اختر شیرانی۔ ایسے میں بھلا وکالت کیا چلتی! قصہ کوتاہ، ایک سال بعد وہ لاہور واپس سدھارے۔ شاعر اور ادیب تو وہ تھے ہی، لاہور کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ 'نونہال' اور 'ہزار داستان' رسالوں کی ایڈیٹری انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کی تھی۔ گجرات سے واپس آکر انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) کی سند لی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی (ف جنوری ۱۹۵۱ء) دیال سنگھ کالج، لاہور میں صدر شعبۂ فارسی و اردو تھے۔ انھوں نے دستگیری کی اور یہ ان کے معاون کی حیثیت سے دیال سنگھ کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ اس طرح اب علم کی دنیا میں بھی نام آنے لگا۔ دیال سنگھ کالج میں چار سال کام کیا تھا کہ یہاں سے فورمین کرسچین (ایف سی) کالج، لاہور میں صدر شعبۂ السنۂ شرقیہ ہو کر چلے گئے۔ وہ اس کالج میں ۱۹۴۲ء تک رہے۔

۱۹۴۹ء میں تاجور مرحوم دیال سنگھ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو اب عابد صاحب دوبارہ یہاں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ تقسیمِ ملک تک، وہ اس عہدے پر

متمکن رہے اور پاکستان بننے پر کالج کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ لیکن اس عہدے پر وہ زیادہ دن نہیں رہے، رفتہ رفتہ منتظمین سے اختلاف پیدا ہو گیا اور بالآخر ۱۹۵۴ء میں انھیں مستعفی ہونا پڑا۔
تقسیمِ ملک کے بعد حکومتِ پاکستان نے 'مجلس ترقی ادب' نام کا ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد اردو کے کلاسیکی سرمایے کی اشاعت اور بازیافت تھی۔ سید امتیاز علی تاج مرحوم (ف اپریل ۱۹۷۰ء) اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ عابد صاحب ان کے دست راست تھے۔ مجلس کی طرف سے ایک موقر ماہی رسالہ 'صحیفہ' بھی شائع ہونے لگا؛ عابد صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔
غرض کہ یہاں کا ماحول اور مشغلہ سراسر علمی اور ان کے مزاج کے موافق تھا۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے بھی تعلقات پیدا ہو گئے۔ یوں بھی لاہور اسٹیشن کے کرتا دھرتا ان کے شاگرد اور دوست ہی تھے، اس لیے ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ عابد صاحب کو موسیقی میں بھی ماہرانہ درک تھا۔ اس سے متعلق ان کی متعدد تقریریں لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھیں۔ فروری ۱۹۶۷ء میں وہ مجلس ترقی ادب کی ملازمت سے الگ ہو گئے، لیکن اس کے بعد بھی اس سے غیر رسمی طور پر وابستہ رہے۔ ان دنوں اس کی فرمائش پر ایک کتاب عروض سے متعلق مرتب کر رہے تھے جس کے لیے غالباً سات سو روپیہ ماہانہ وظیفہ انھیں ملتا تھا۔ صحت بہت دن سے خراب تھی۔ ایک زمانے سے محض مورفیا کے ٹیکوں کے سہارے جی رہے تھے۔ گھریلو پریشانیاں بھی ساتھ تھیں؛ آمدنی کم اور خرچ بے پناہ۔ افسوس، ان کا ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء صبح کے وقت لاہور میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اہل تشیع کے معروف قبرستان مومن پورہ (میکلوڈ روڈ) لاہور میں مدفن نصیب ہوا۔
انھیں نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ترجمے میں بھی اچھی مہارت تھی۔ چونکہ زبان کا مزاج پہچانتے تھے اور شعر کا مذاق بہت اچھا تھا، اس لیے تنقید کے میدان میں بھی بند نہیں تھے۔ انھوں نے ڈرامے اور افسانے بھی لکھے۔ پیرالوتی کی مشہور کتاب "الیفرڈ ڈائٹ" کا ترجمہ اردو میں داستان کے عنوان سے کیا تھا۔ اسی طرح ول ڈیوراں کی کتاب "ہسٹری آف فلاسفی" کا

ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے۔ بعض ناولوں کا ترجمہ بھی کیا تھا مثلاً قیامت کی رات، بشر ہے کیا کہیئے وغیرہ۔ ان کے ترجمے پر کہیں اردو کا گمان نہیں ہوتا۔ ان کی تصنیفات کی فہرست خاصی طویل ہے، پچاس سے کم نہیں ہونگی۔

انھوں نے تمام اصنافِ نظم میں لکھا ہے۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں حفیظ جالندھری کے گیتوں اور نظموں کی دھوم تھی، اور رہی سہی کسر اختر شیرانی نے پوری کر دی تھی۔ پنجاب کے نوجوان شعرا ان دونوں سے بہت متاثر ہوئے۔ عابد صاحب بھی انھیں لوگوں میں تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں انھوں نے بھی ابتدا میں گیت اور نظمیں لکھیں۔ لیکن اب ایک زمانے سے صرف غزل کہتے تھے اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ خوش گلو بھی تھے، پڑھنے کا انداز دلکش اور سامعہ نواز تھا۔ ان کی ابتدائی منظومات میں اقبال کے ارادی تتبع کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ اردو میں ساقی نامے کی ترویج میں ان کا بہت ہاتھ ہے، اگرچہ اس میں انھیں تقدّم کا فخر حاصل نہیں ہے، یہ نفیس لکھنوی کا حصّہ ہے۔

عابد صاحب نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی تو وہی گجرات کی بیگم (بلقیس) تھیں۔ عابد صاحب کی ساری اولاد اسی بیوی سے ہوئی (سات بیٹیاں اور ایک بیٹا مینوچہر)۔ سب بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے، اور وہ اپنے گھر بار کی ہیں۔ اکلوتا لڑکا آج کل لاہور میں اسسٹنٹ کمشنر ہے۔ ان کی دوسری بیوی محمودہ تھیں۔ اس شادی کے جلد بعد ہی بلقیس نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ لیکن محمودہ کی بھی ان سے نہیں نبھی، اس نے طلاق لے لی۔ تیسری بیوی محجوب تھیں۔ یہ بیگم امروہہ کے ایک مہاجر خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ یہ شادی انھوں نے پچاس سال کی عمر میں کی تھی۔ وہ آخری دم تک اسی بیوی کے ساتھ رہے، اور اسی کے ہاں ان کا انتقال ہوا۔

اب ان کے چند شعر سنیئے:

سب کے جلوے نظر سے گزرے ہیں
وہ نہ جانے، کدھر سے گزرے ہیں

موجِ آوازِ پائے یار کے ساتھ
نغمے دیوار و در سے گزرے ہیں

آج آیا ہے اپنا دھیان ہمیں
آج دل کے نگر سے گزرے ہیں

گھر کے گوشے میں تھے کہیں پنہاں
جتنے سیلاب گھر سے گزرے ہیں

جہاں کشود نوا پر خزاں کے پہرے ہیں
وہیں بہار غزل خواں ہے، دیکھیے کیا ہو!

سبو اٹھا کہ یہ نازک مقام ہے، ساقی!
نہ اہرمن ہے، نہ یزداں ہے، دیکھیے کیا ہو!

ہوا کا رنگ یہ ہے، آشیاں تو ایک طرف
قفس بھی شاخ پہ لرزاں ہے، دیکھیے کیا ہو!

ہمیں ہیں پیرِ مغاں کافروں کے، اے غالبؔ!
ہمیں کو دعوئ ایماں ہے، دیکھیے کیا ہو

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں، کب دن میرے پھرتے ہیں؟
وہ تو بچارے خود ہیں بھکاری، ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

جن گلیوں میں ہم نے سکھ کی سیج پہ راتیں کاٹی تھیں
ان گلیوں میں بیاکل ہو کر سانجھ سویرے پھرتے ہیں

روپ سروپ کی جوت جگانا، اس نگری میں جوکھم ہے
چاروں کھونٹ بگولے بن کر، گھور اندھیرے پھرتے ہیں

جن کے شام برن سایے ہیں، میرا من سستاتا تھا
اب تک آنکھوں کے آگے، وہ بال گھنیرے پھرتے ہیں

کوئی ہمیں بھی یہ سمجھا دو، ان پر دل کیوں ریجھ گیا!
تیکھی چتون، بانکی چھب والے، بہتیرے پھرتے ہیں

اک دن اس نے نین ملا کے، شرما کے مکھ موڑ لیا تھا
تب سے سندر سندر سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں

اس نگری کے باغ اور من کی، یارو! لیلا نیاری ہے
پنچھی اپنے سر پہ اٹھا کر اپنے بسیرے پھرتے ہیں
لوگ تو دامن سی لیتے ہیں؛ جیسے ہو جی لیتے ہیں
عابد! ہم دیوانے ہیں، جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

غمِ دوراں، غمِ جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا
وصفِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا
شرع و آئین کی تعزیر کے باوصف، شباب
لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا
عشق کی طرزِ تکلّم، وہی چپ ہے کہ جو تھی
لبِ خوشگوئے ہوس محوِ بیاں ہے کہ جو تھا
سنگِ طفلاں سے زرانچ کے رہے قصرِ بلند
یہ وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

گردشِ جام نہیں رک سکتی
جو بھی، اے گردشِ دوراں! گذرے
صبحِ محشر، ہے بلاسے ظاہر
کسی صورت، شبِ ہجراں گذرے
کوئی برسا، نہ سرِ کشتِ وفا
کتنے بادل گہر افشاں گذرے
ابنِ آدم کو نہ آیا کوئی راس
کئی آذر، کئی یزداں گذرے
وہ جو پروانے جلے، رات کی رات
منزلِ عشق میں آساں گذرے

آیا ہمارے جینے کا انداز سب کو یاد
جب ذکرِ جاں نثاریِ پروانہ ہو چکا
انھیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت
انھیں کو عرضِ وفا ناگوار گذری ہے
حریمِ شوق مہکتا ہے آج تک، عابد!
یہاں سے نکہتِ گیسوئے یار گذری ہے
عام ہو فیضِ بہاراں تو مزا آجائے
چاک ہوں سب کے گریباں، تو مزا آجائے

واعظو! میں بھی تمھاری ہی طرح مسجد میں — بیچ دوں دولتِ ایماں، تو مزا آ جائے
ساقیا! ہے تری محفل میں خداؤں کا ہجوم — محفل افروز نہ ہو انساں تو مزا آ جائے

دنیا میں اپنی صبحیں، نہ شامیں — دل کے اندھیرے دل کے اُجالے
اے ہمصفیرو! گلشن قفس ہے — آنکھوں پہ پہرے، ہونٹوں پہ تالے
میخوار، ساقی! قطرے کو ترسیں — برسیں چھما چھم ساون کے جھالے
فصلِ بہاراں، گویا دلھن ہے — پھولوں کا آنچل، چہرے پہ ڈالے

اہرمن یار، نہ یزدان محرم — یہی تقدیرِ بشر ہے، ساقی!
گیسوے یار ہیں گوشالِ کار — ہر شبِ غم کی سحر ہے، ساقی!
زندگی آنچ ہے انگاروں کی — عاشقی، رقصِ شرر ہے ساقی!

یوں بڑھی ان سے راہ و رسمِ وفا — کہ مجھے بھی کوئی خبر نہ ہوئی
میرا مرنا تو، ان پہ کیا کھلتا! — میرے جینے کی بھی خبر نہ ہوئی

بت کے راندے ہوئے، اللہ کے ٹھکرائے ہوئے — آخرکار درِ پیرِ مغاں تک پہنچے
رہ گئے یار قتیلِ غمِ دوراں ہو کر — ہم سے کچھ سوختہ جاں کوئے بتاں تک پہنچے
دامنِ یار کی راہوں سے گزر کر آخر — دستِ گستاخ سرِ تاجوراں تک پہنچے
چاند اترا مرے کاشانے میں عابد! کل رات — دیکھیے، رات کی یہ بات کہاں تک پہنچے

اے دوست! موجِ رنگ سے بنتے نہیں چمن — اے دوست! موجِ خوں کی طلبگار ہے بہار
نوکِ زبانِ خار کی دیکھی نہیں ادا — غافل کو وہم ہے، گل و گلزار ہے بہار

عجیب بری شے ہے، دل کو مضطرب کروں — یا دفورِ عشرت سے، یا غمِ تمنا سے

مدت کے بعد آئے ہیں اے راہبر! جہاں — میرا قیاس ہے کہ، چلے تھے وہیں سے ہم

یوں تو میٹھی زباں، ہے ظالم کی — آنکھ میں رنگِ التفات نہیں

لب سے ہوتی ہوئی آنکھوں سے ہنسی جاتی ہے — اے بتو! پیار کے اسلوب جدا ہوتے ہیں
کون پروانوں کو سمجھائے کہ مرنے کے سوا — اور بھی چند مقاماتِ وفا ہوتے ہیں

روشن صدیقی، شاہد عزیز

اگرچہ بعض تذکروں میں ان کی تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپی ملتی ہے، لیکن یہ غلط ہے، ان کا صحیح سال ولادت ۱۹۰۹ء ہے۔ مرحوم نے خود ایک مرتبہ میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ جنوری/فروری ۱۹۴۱ء میں نگار (لکھنؤ) نے تذکرۃ الشعرا نمبر شائع کیا، تو نیاز نے ان سے بھی حالات طلب کیے تھے۔ خدا معلوم، کیسے وہاں تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کی جگہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپ گئی۔ اس کے بعد چونکہ سب لکھنے والوں نے حالات وہیں سے نقل کیے، اس لیے یہی تاریخ عام طور پر تسلیم کر لی گئی، حالانکہ یہ غلط ہے۔

بہرحال، روشن مرحوم ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کو جوالاپور (ضلع سہارنپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد بھی شاعر تھے اور شاہد تخلص کرتے تھے۔ وہ ملا محمد اکرم غنیمت کنجاہی کی مثنوی "نیرنگ عشق" کے عاشق تھے۔ اس مثنوی کا مطلع ہے:

بنام شاہد نازک خیالاں
عزیز خاطر آشفتہ حالاں

اسی سے انھوں نے شاہد تخلص اختیار کیا تھا؛ اور اب جو خدا نے بیٹا دیا، تو اس کا نام انھوں نے

شاہد عزیز رکھ دیا۔ مثنوی نیرنگ عشق کے بھی دو کردار ہیں، شاہد اور عزیز۔
گھر کا ماحول مذہبی تھا ہی، تعلیم بھی اسی نہج پر ہوئی۔ اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی بھی اچھی جانتے تھے اور یہ ان کے وطن جوالاپور سے گورو کل کے قرب کا فیضان تھا۔ بعد کو سنسکرت اور انگریزی سے بھی کچھ واقفیت پیدا کرلی تھی۔
روش تقسیم ملک تک جوالاپور میں رہے۔ یہاں وہ بانس کا کاروبار کرتے تھے اور اس سے ان کی گذر بسر کے لیے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ آزادی کے ساتھ فساد آئے، جوالاپور میں بھی بہت سخت ہنگامہ ہوا۔ اسی میں روش کا مکان بھی نذر آتش ہو گیا۔ یہ جان بچا کر مراد آباد پہنچے اور یہاں مولوی مظہر جلیل صاحب کے مکان میں پناہ لی۔ مولوی صاحب روش صاحب سے اتنے خوش تھے کہ جب روش کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا، اور ایک زمانہ بعد انھوں نے دوسری شادی کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا، تو موصوف نے اپنی بیٹی (سعیدہ) ان کے عقد نکاح میں دے دی۔ روش صاحب ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک مراد آباد میں رہے۔
ان کی بیوی کی ایک خالہ میرٹھ میں تھیں۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں یہ خاندان میرٹھ منتقل ہو گیا اور محلہ مشائخان میں انھیں کے مکان میں رہنے لگا۔
جوالاپور سے نکلنے کے بعد روش نے ساری عمر شعر کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ درمیان میں کوئی چار سال کے لیے (۱۹۵۹ء۔ ۱۹۶۳ء) آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ اردو میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے، لیکن کجا شاعر، کجا دفتر کی بکواس۔ وہ اس گون کے آدمی نہیں تھے۔ یہاں کا نظام اوقات اور دفتری زندگی کی پابندیاں، یہ بھلا کہاں ان کے بس کی بات تھی! بالآخر پرچہ گزرا کہ یہ کام پر توجہ نہیں دیتے وقت سے دن دن بھر غائب رہتے ہیں۔ انجام کار انھیں الگ کر دیا گیا۔ اسی ملازمت کے دوران میں وہ برسلز (بلجیم) کے سہ سالہ جشن شعر میں ہندستان سے اردو کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے، یوں یورپ کے بعض مقامات دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے شاہجہانپور گئے۔

رات کو مشاعرے میں کلام سنا رہے تھے کہ دل کا شدید دورہ پڑا اور تھوڑی دیر بعد ساڑھے چار بجے علی الصباح (۲۳ جنوری) اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے۔ لاش اگلے دن میرٹھ لے گئی اور انھیں درگاہ شاہ ولایت میں (عبدالسمیع بیدل تلمیذِ غالب کی قبر کے پاس) سپردِ خاک کیا گیا۔ حکیم کلب علی صاحب امروہوی نے جو مرحوم کے مخلص دوستوں میں سے ہیں، قطعۂ تاریخ کہا؛ اس کے آخری تین شعر ہیں:

جب بھی ہو جائیگی شائستگیٔ ذہن وضمیر
ہوگا اس عہدِ سعادت میں نمودار روشؔ

یاد کرتی ہے تجھے وادیٔ کشمیر بہت
تجھ کو روتے ہیں وہاں کے در و دیوار روشؔ!

چل دیا سوئے نشاطِ ابدی آج کی رات
'ہائے' وہ صیدِ محبت، وہ وفادار روشؔ

(۱۳۹۰ھ)

قمر سنبھلی کا قطعۂ تاریخ بھی قابلِ ذکر ہے:

اٹھ گیا، اف! روشؔ سا اہلِ سخن
بزمِ اردو سیاہ پوش ہوئی

اے قمر! لکھ یہ مصرعِ تاریخ
"آہ، شمعِ ادب خموش ہوئی"

اعجاز صدیقی نے عیسوی قطعۂ تاریخ کہا ہے؛ اس کا آخری شعر ہے:

کہو اعجاز! بلبِ آہ سے تاریخِ وفات
مشعلِ بابِ سخن، نامِ روشؔ صدیقی
(۱۹۷۰+۱=۱۹۷۱)

روشؔ بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، اور ان میں آغاز ہی سے پختگی کے آثار تھے۔ کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی، تھوڑا بہت مشورہ کیا، تو اپنے والدِ مرحوم سے۔ کلام میں تصوف اور ویدانت کے اثرات بہت گہرے اور نمایاں ہیں؛ اور یہ ان کے ماحول کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میرا تخلص 'روشؔ' فارسی کا لفظ نہیں ہے، یہ سنسکرت کا روی ایش (یعنی سورج دیوتا) ہے جو ان کے کسی فاضل سنسکرت ہندو دوست کا عطیہ تھا۔ بہت ابتدا ہی میں ان کے کلام کی پختگی سے بعض اصحاب کو دھوکا ہوا اور وہ انھیں کوئی سن رسیدہ شخص سمجھنے لگے تھے۔ یہ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ن۔ م۔ راشد نے جو اس وقت صرف چودھری نذر محمد راشد تھے، روشؔ سے اصلاح بھی لی۔ روشؔ نے ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء میں بہادرپور کے ایک صاحب

سید مبارک شاہ جیلانی (ف ۱۲ نومبر ۱۹۶۹ء) کے ساتھ مل کر ایک ماہی پرچہ "لالۂ صحرا" بھی جاری کیا تھا، لیکن اس کا صرف ایک شمارہ نکل کر رہ گیا۔ وہ نظم بہت اچھی لکھتے تھے۔ شروع میں چند غزلیں کہیں، لیکن اس کے بعد انھوں نے مدتوں اپنے آپ کو نظم ہی کے لیے وقف رکھا، اور اس میں امتیاز پیدا کیا۔ ان کی بعض نظمیں (مثلاً کارواں، مرثیۂ گاندھی وغیرہ) اردو کی آبرو کہی جانے کی مستحق ہیں۔ افسوس کہ کارواں، نظم والے کتابچے (بمبئی ۱۹۵۰) اور ایک مجموعہ غزلیات محرابِ غزل (دلی ۱۹۵۹ء) کے علاوہ ان کا اور کلام شائع نہیں ہوا۔ ان کا سرمایۂ سخن یقیناً دو تین مجموعوں سے زیادہ کا ہوگا۔

ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ ہے۔ فارسی کی شگفتہ اور دلآویز ترکیبیں ایسی برجستگی اور چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ مزہ آجاتا ہے۔ لیکن شاعر سے بھی زیادہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ مرنجاں مرنج، نیک نفس، پابندِ صوم وصلوٰۃ، دیندار۔ میں انھیں ۲۰، ۲۵ برس سے جانتا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کے اکثر شاعروں کی عام روش کے خلاف میں نے کبھی ان کی زبان سے کسی کے خلاف ایک کلمہ تک نہیں سنا؛ یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہاں مرحوم کی ایک سخن گسترانہ بات یاد آگئی:
پچھلی جنگِ عظیم کے دوران میں حفیظ جالندھری حکومت ہند کے اس محکمے کے کرتا دھرتا تھے جس کے ذمے گانے بجانے اور کھیل تماشے کے ذریعے سے حکومت کے فوجی پراپیگنڈے کا کاروبار تھا۔ بعد کو ان کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں سرکار کی طرف سے انھیں 'خان بہادر' کا خطاب عطا ہوا۔ اس پر روش نے ایک قطعہ کہا تھا، جس میں اقبال کے اس مشہور شعر کی تلمیح ہے:

آ، تجھ کو بتاؤں میں، تقدیرِ اُمم کیا ہے	شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

روش کا قطعہ ہے:

اقبال کے عرفاں میں تقدیرِ اُمم یہ ہے	شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر
رقاصِ حکومت کی معراج یہ کہتی ہے	طاؤس و رباب اوّل، اعزاز و خطاب آخر

شعری حلقوں میں بھی ان کے فن اور انسانیت کے باعث ان کا وقار تھا۔ خدا اپنے فضل و کرم

سے انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

اب کچھ شعر سنیے، جو ان کے مطبوعہ مجموعۂ کلام 'محراب غزل' سے ماخوذ ہیں:

مرا ذوقِ سفر ہے بے نیازِ جادہ و منزل
نہ کوئی راہبر میرا، نہ کوئی راہزن میرا

بھری مینا سے کچھ، پھر کچھ ملائی چشم ساقی نے
بڑی رعنائیوں کے ساتھ مجھ تک دورِ جام آیا

چراغِ صبح سے کچھ گفتگو تھی بے ثباتی پر
تصور میں یکایک چہرۂ خورشیدِ شام آیا

تغافل کو کرم سمجھا ہے ہم نے
نہیں آساں ہمارا بھول جانا

خود آرائی ہے، اظہارِ محبت
خود آگاہی، محبت کا چھپانا

خلوصِ زندگی ہے، کج کلاہی
فریبِ مصلحت ہے، سر جھکانا

میری تنہائی تھی اک دنیائے ویراں کا حجاب
جانِ محفل! تو نے کیوں یہ رازِ افشا کر دیا

حسن کے رخ پر تو، اے منصور! پردہ ہی رہا
عشق کی مجبوریوں کو تو نے رسوا کر دیا

وہاں ہزار تغافل، شریکِ نازِ سکوت
ہزار شوق یہاں، شوقِ گفتگو کے سوا

گمانِ بادۂ عشرت مرے سبو پہ نہ کر
ہے اس میں زہر بھی شامل، مرے لہو کے سوا

خطا معاف، مری لغزشوں کا محرمِ راز
کوئی نہیں ترے لطفِ بہانہ جو، کے سوا

کوئی نسبت نہ ہو ساقی سے، تو میخانہ بھی خاک
لطفِ ساقی ہو، تو خاکِ درِ میخانہ بہت

محبت سے پہلے یہ عالم نہ تھا
کہاں آگئے ہم محبت کے بعد

اب اس سے کیا غرض، یہ حرم ہے کہ دیر ہے
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

شایانِ جرمِ عشق نہ تھی قیدِ زندگی
جی شاد ہو گیا رسن و دار دیکھ کر

رنج و راحت میں ہے اک ربطِ لطیف
سرخوشی ہے شاہدِ غم کا لباس

نقابِ رخ سرکتا جا رہا ہے
مگر وہ خود ہوئے جاتے ہیں روپوش

یہ نازِ کم سخنی و بصد کم آمیزی
کوئی ہوا تو سہی آج زینتِ محفل

یوں تو ہر خوابِ تمنا ہے محبت افروز — فکرِ تعبیرِ تمنا، ہے محبت کا زوال

بات اتنی سی ہے اے محوِ حجاباتِ نظر — حسنِ افکار میسر ہو، تو دنیا ہے حسیں

مجھ سے پوشیدہ نہیں، پردۂ تقدیر کا راز — جو ترے دل میں نہیں، وہ تری قسمت میں نہیں

سکوتِ عشق ہو، یا اضطرابِ شوق، روش! — حجابِ راز میں پنہاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں

روش! کون لے اب محبت کا نام — بڑی ذلتیں ہیں، بڑی خواریاں

رگوں میں شعلۂ حسرت، نہ برقِ آرزو دل میں — کہاں سے روشنی ہو، ان خردمندوں کی محفل میں

حرم نے کر دیا ہے محرمِ آدابِ نظارہ — چلیں، اب دیر میں نظارۂ حسنِ بتاں کر لیں

مرا تو حال ہی کیا ہے، مرا تو ذکر ہی کیا — ترے سکوں میں بھی رنگِ فغاں ملا مجھ کو

ہزار دیر و حرم ہیں سجود آمادہ — جبیں ملی کہ ترا آستاں ملا مجھ کو

اے فقیہہِ شہر! کیا اس کا علاج — چشمِ ساقی بھی ہے پیمانے کے ساتھ

تیر فرہاد نے یہ رازِ نہاں فاش کیا — کہ شکستِ دلِ کہسار نہیں کوہ کنی

اے روش! پاسِ وضع میں شامل — احترامِ تغیرات بھی ہے

دیارِ لالہ و گل بھی نہیں مقامِ سکوں — ہنوز گرمِ سفر کاروانِ شبنم ہے

مآلِ تلخیِ عشرت سے بے خبر ہے حیات — ابھی تو شکوۂ آغازِ تلخیِ غم ہے

یہی ہے وقت، روش! نذر کر متاعِ سکوں — ادائے زلفِ پریشاں کچھ اور برہم ہے

ذیل کی تین غزلیں ان کے مطبوعہ مجموعے "محرابِ غزل" کے بعد کا کلام ہے:

زندگی کی پیچ و خم ہر گام پر ہمت شکن — کام آتا ہے یہاں، اہلِ جنوں کا بانکپن

حسنِ بے پروا نے توڑا ہے تمنا کا طلسم — حیلۂ پرویز ہو یا سادگیِ کوہکن

کھل ہی جائیگا کبھی یہ راز تجھ پر ہم نشیں! — میں تو خود ہی پیرہن ہوں، تجھ میں بوئے پیرہن

کس قدر رنگیں ہے افسانہ مرے افکار کا — ساغرِ گل رنگ و دستِ ساقیِ گل پیرہن

رفتہ رفتہ ارتقائے حسنِ تنہائی ہوا — اک تحیر ہے، نہ خلوت ہے، نہ کوئی انجمن

میں نے کیا کیا رنگ دیکھے دلنوازی کے تری
دل شکن، مینا شکن، ایماں شکن، پیماں شکن

میری خاموشی سے خوابیدہ تھی روحِ کائنات
میں نے اک نالہ کیا اور جاگ اٹھے دشت و دمن

شک نہیں تیرے خلوصِ دوستی میں، ہم نشیں!
آہ مجھ سے ہی گریزاں ہے مرادِ دیوانہ پن

ہے مرے ہر لفظ کی تزئین، صدیوں کا سکوت
حسن خاموشی سے سیکھے میں نے آدابِ سخن

کیا یہ کہہ دوں ہے مرے دل کی متاعِ گم شدہ
اے نگارِ ناپشیماں تیرے ماتھے کی شکن

شامِ غربت میں کھلے اسرارِ میخانہ، روشؔ!
مدتوں چھلکا کیا پیمانۂ صبحِ وطن

حاصلِ عمر، خراباتِ مغاں کیا کہیے
ہوش آیا ہے تو آیا ہے کہاں کیا کہیے

ہے صنم خانۂ کونین تقاضائے سکوت
شوخیِ جنبشِ لبہائے بتاں کیا کہیے

علمِ حاضر کی کہانی سے خموشی ہی بھلی
کچھ جو کہیے تو بجز وہم و گماں کیا کہیے

حسن تھا محتسبِ شہر سے میخانے کا
کیوں پریشاں ہے صفِ بادہ کشاں کیا کہیے

لبِ جو، حلقۂ گل، موجِ صبا، فکرِ غزل
اور مفہومِ حیاتِ گذراں کیا کہیے

ہم تو ناداں تھے کہ خلوت گہِ دل سے نکلے
کوئی غارت گرِ محفل ہے کہاں کیا کہیے

حق ادا ہو نہ سکا راہ کے کانٹوں کا، روشؔ!
ساتھ تھا قافلۂ گل بدناں کیا کہیے

ناز فرما ہے فروغِ شعلۂ رخسارِ دوست
سر جھکا دے اے ہجومِ حسرتِ دیدارِ دوست

عشق کہتا ہے کہ ہے دشمن کی غمخواری بھی شرط
یہ تو آساں ہے کہ کوئی دوست ہو غمخوارِ دوست

حادثہ کچھ سخت گذرا ہے مسیح و خضر پر
سرنگوں بیٹھے ہیں زیرِ سایۂ دیوارِ دوست

عشق نے سلجھا دیے سب زندگی کے پیچ و خم
یہ سلیقہ ہے عطائے گیسوئے خمدارِ دوست

حرفِ انکارِ محبت کی دل آویزی نہ پوچھ
جیسے سچ مچ مل گئی ہو دولتِ اقرارِ دوست

جان دیتے ہیں جو نادیدہ جمالِ یار پر
دیکھ ان کو بھی ذرا اے طالبِ دیدارِ دوست

ذکرِ دنیا، فکرِ عقبیٰ گم ہوئے اس شغل میں
زندگی کو ہم نے سمجھا اہتمامِ کارِ دوست

اس ہجومِ بے نیازی میں بہت یوسف ہیں گم
اک ذرا پاسِ ادب اے دل سرِ بازارِ دوست

حسنِ تہذیبِ غزل کچھ اور ہے اے نکتہ داں
جا کہیں سے لا جنونِ شوخیِ گفتارِ دوست

زندگی کی رات آنکھوں میں کٹے گی اے روشؔ
سہل مت جانو پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

مجھ سا آشفتہ نوا اور مصرعۂ غالبؔ روشؔ!
کچھ نہ کچھ کہنا پڑا آخر کہ تھا اصرارِ دوست

عقیل جعفری خیرآبادی، سید عقیل احمد

مشہور مصنف اور صحافی رئیس احمد جعفری (ف ۱۹۶۸ء) کے بڑے بھائی تھے۔ ان کا سالِ ولادت غالباً ۱۹۰۶ء تھا۔ اگرچہ مسقط الراس سیتاپور تھا، لیکن ان کی پرورش اپنی ننھیال خیرآباد کی مردم خیز بستی میں ہوئی۔ والد سید ناظر حسین کا ان کی کمسنی میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے یہ دونوں بھائی خیرآباد چلے گئے۔ مشہور شاعرِ خمریات ریاض خیرآبادی (ف ۱۹۳۴ء) ان کے نانا سید نیاز احمد کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، انھیں دونوں کی نگرانی میں عقیل احمد اور رئیس احمد کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ لیکن چونکہ والد کے انتقال کے بعد گھر کی مالی حالت سقیم ہو گئی تھی، اس لیے تعلیم پر کافی توجہ نہ دی جا سکی۔

شروع میں سیاست سے دلچسپی رہی اور خیرآباد میونسپل بورڈ کے چیرمین بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی خاندانی روایت اور ماحول کے زیرِ اثر جلد ہی شعر و ادب کی طرف آ گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ ایک مدت بعد ۱۹۴۵ء میں بمبئی چلے گئے، جہاں رئیس احمد جعفری پہلے سے مقیم تھے۔ جب ملک تقسیم ہوا تو یہ بھی ان کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ یہاں انھوں نے کراچی میں محمد علی اکیڈمی قائم کی تھی۔ خیال تھا کہ اسے نشری ادارہ بنا لیں گے،

لیکن بعد کو اسے رئیس احمد کے سپرد کر دیا، اور اپنے لیے ایک اور بکڈپو بنالیا۔ وہیں کراچی میں ۲۶/۲۷ جنوری کی درمیانی شب میں انتقال کیا۔

ان کی سب سے پہلی تصنیف غالباً نثر ریاض خیر آبادی تھی، جو حیدر آباد کے کسی ناشر نے شائع کی تھی کراچی کے زمانۂ قیام میں تین چیزیں شائع ہوئیں۔ مکالمات ابوالکلام، جوش و ہوش اور مجموعۂ کلام جوش و ہوش، قطعوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ جوش ملیح آبادی کا الحاد اور زندی الم نشرح ہے وہ ان موضوعات پر وقتاً فوقتاً بیباکی سے لکھتے رہتے ہیں۔ عقیل نے انھیں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مضامین کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ منتشر اور غیر مرتب شکل میں موجود ہے۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے

ذیل میں نمونے کے طور پر ان کی چار رباعیاں دی جارہی ہیں۔ جو انھوں نے جوش کے جواب میں کہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جوش ہی کے الفاظ میں ردوبدل کرکے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا جذبۂ حمیتِ دین اپنی جگہ، لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی:

مرتے ہیں ترقی پہ فنا کے بندے
انسان ہیں یا حرص و ہوا کے بندے
چل اور دکھا راہِ مستقیم اُن کو
اے احسنِ تقویم، خدا کے بندے

اے ملحدِ بےعلم و عمل، مخربِ دیں!
اے جنتِ ارضی میں جہنم کے مکیں
سوتے ہوئے فتنوں کو جگانے والے
تجھ کو بھی نہیں قربِ قیامت کا یقیں

جب حشر کی تردید ہی کرتے گزری
تو کس لیے عمر آپ کی ڈرتے گزری
کر لیجیے، اس کا بھی جہنم میں شمار
جو عمر کہ ہائے ہائے کرتے گزری

موقوف ہوئی بانگِ جرس، اے ساقی!
وہ آگیا اب عرش، بس، اے ساقی!
صد شکر ہوا خاتمہ بالخیر، عقیل!
باقی نہیں اب کوئی ہوس، اے ساقی!

وکیل اختر، وکیل احمد اختر خان

اس جواں سال ادیب کا ۹ فروری ۱۹۷۱ء کی دوپہر کلکتہ میں انتقال ہوا۔ اور افسوس، اس طرح ایک اور بن کھلا غنچہ بادِ مخالف کی نذر ہو گیا۔

ان کا اصلی نام عقیل احمد اختر خان تھا، لیکن بعد کو کسی وجہ سے بدل کر عقیل کی جگہ وکیل لکھنے لگے۔ ان کے والد کا نام سبحان خان تھا۔ وکیل اختر ایک قریہ تھوری (ضلع گیا، بہار) میں ۳۰ مئی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی۔ یہاں سے کلکتہ پہنچے اور مدرسہ عالیہ سے ۱۹۵۲ء میں اسکول فائنل کرنے کے بعد سنٹرل کالج کلکتہ سے بی اے اور پھر اسی یونیورسٹی سے تاریخ تمدنِ اسلامی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ کینسر کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے سے بظاہر ٹھیک ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرض جڑ سے نہیں گیا تھا۔ ایم اے کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول، کلکتہ میں پڑھانے لگے؛ چندے بعد ۱۹۶۷ء میں کلکتہ مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں مرض عود کر آیا اور اب کے جان لیوا ثابت ہوا۔

شاعری کالج کے زمانے میں شروع کی؛ اور آغاز میں اپنے کالج کے استاد پروفیسر عباس علی خان

بیخود (ف ۱۹۶۹ء) ہی سے اصلاح بھی لی۔ بعد کو انھوں نے اپنے آپ پر اعتماد کرکے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں جدت اور نیا آہنگ ہے۔ آگے بڑھنے کے بہت امکانات تھے۔ اگر زندگی وفا کرتی، تو یقیناً ترقی کرتے، لیکن موت سے کسی کو مفر نہیں۔ مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں مرتب نہیں ہوا، اور غالباً کلام مقدار میں کچھ زیادہ بھی نہیں۔ ان کے احباب اسے سمیٹ کر 'دائروں کی شکست' کے عنوان سے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں:

مندروں مسجدوں اور گرجوں شوالوں کو تم
جس طرح چاہو مسمار کردو
اس لیے کہ
تم تو روز ازل سے
کتنے معبود کتنے معابد بناتے —
— مٹاتے، مٹاتے بناتے چلے آرہے ہو
اس لیے کہ تمھیں اب
خلاؤں میں بھی قصر سازی کا فن آچکا ہے
مگر اپنے ذہن رسا
زعم تحقیق و تخلیق سے پوچھ کر یہ بتاؤ
روز اول سے اب تک
خون کا کوئی قطرہ بنایا ہے تم نے؟

گر کوئی راہبر نہیں ہوتا — کارواں دربدر نہیں ہوتا
ہم نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں — جن کے چہرے پہ سر نہیں ہوتا
صرف درسی کتاب پڑھنے سے — آدمی دیدہ ور نہیں ہوتا

سنگ وہ پھینکتا ہے اوروں پر — جس کا شیشے کا گھر نہیں ہوتا
سچ کا پودا لگا کے دیکھ لیا — اس میں کوئی ثمر نہیں ہوتا
دوسروں پر کیا کرو تنقید — تم سے کچھ اور گر نہیں ہوتا
ہائے وہ لوگ جن کی نظروں میں — فرقِ عیب و ہنر نہیں ہوتا
حسن والوں پہ کچھ نہیں موقوف — کون اب خود نگر نہیں ہوتا

خرد کی آندھیاں، ان کا تغافل اپنی مجبوری — تمناؤں کی لو مدھم نہ کرتے ہم، تو کیا کرتے

منکرِ عیش و طرب ہے، یارو! — دل کا اب حال عجب ہے، یارو!

نہ غیر بھائے، نہ اپنا لگے بھلا مجھ کو — مرے شعور نے کیسا بنا دیا مجھ کو
کوئی سبب ہے سرِ رہگزر جو بیٹھا ہوں — سمجھ رہے ہو، تو سمجھو شکستہ پا مجھ کو

اب نیند کہاں آنکھوں میں شعلہ سا بھرا ہے — یہ تپتے ہوئے ہونٹوں کو تکنے کی سزا ہے

یوں تو تنہائی میں گھبرائے بہت — مل کے لوگوں سے بھی پچھتائے بہت

عجب خامشی اس کے ہونٹوں پہ تھی — عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا

زندگی دستِ تہِ سنگ رہی ہو برسوں — یہ زمیں ہم پہ بہت تنگ رہی ہو برسوں

یہ نہیں معلوم کہ کیا بات تھی — رو رہے تھے میرے ہمسائے بہت

کسی صورت کوئی صورت نکالو — مجھے بے موت مرنے سے بچا لو

اس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے — جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے

ہر قدم راہِ طلب میں دل یہ کہتا جائے ہے — جو خرد سے مشورہ لے ہے وہ دھوکہ کھائے ہے
جو کبھی کرنا ہو وہ کر گزرئیے دل کی رائے ہے — سوچنے والا ہمیشہ سوچتا رہ جائے ہے
یادِ حسنِ یار میں اس دل کی کیفیت نہ پوچھ — "آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے"
اس کی بزمِ ناز سے اختر اٹھوں میں جب کبھی — یوں لگے ہے جیسے دل سینے میں بیٹھا جائے ہے

وہ آ بھی جائے تو اس کو کہاں بٹھاؤں گا — میں اپنے گھر میں تو رہتا ہوں بے گھروں کی طرح

میاں بشیر احمد

لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ باغبانپورہ ہے۔ یہاں کی میاں فیملی اپنی وجاہت، تمول، ترقی پسندی اور ملکی خدمات کے لیے معروف ہے۔ اسی خاندان کے ایک گلِ سرسبد میاں شاہدین ہمایوں ہوئے ہیں۔ یہ کسی زمانے میں پنجاب چیف کورٹ کے جج رہے تھے، اس لیے عام طور پر آنریبل جسٹس میاں شاہدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ جسٹس شاہدین کے والد مولوی نظام الدین بڑے فاضل بزرگ تھے اور دادا مولوی قادر بخش جیّد عالم اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں شاہی خاندان کے نونہالوں کے استاد اور اتالیق رہے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے؛ نادر تخلص تھا۔

جسٹس شاہدین بھی شعر کہتے تھے، ہمایوں ان کا تخلص تھا۔ ان کا مجموعۂ کلام "جذبات ہمایوں" کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد نے شائع کیا تھا۔

ہمایوں کا ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو انتقال ہوا۔ اقبال نے تاریخ وفات کہی:

درگلستانِ دہر، ہمایونِ نکتہ سنج　　آمد مثالِ شبنم و چوں بوے گل رمید
می جُست عندلیبِ خوش آہنگ سالِ او　　"علامۂ فصیح" ز ہر چار سُو شنید
(۱۳۳۶ = ۴ × ۳۳۴)

انھیں میاں شاہدین کے اکلوتے بیٹے میاں بشیر احمد تھے، جن کا ابھی پچھلے دنوں ۳ مارچ ۱۹۷۱ء شام کے وقت لاہور میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت ۸۰ سال کی عمر تھی۔ میاں بشیر احمد مرحوم کے ساتھ گویا ہماری پچھلی نسل کی شرافت اور متانت، وضعداری اور خرد نوازی کا جنازہ اٹھ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میاں بشیر احمد ۲۹ مارچ ۱۸۹۳ء کو اپنے خاندانی مکان، باغبانپورہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کے ابتدائی مراحل لاہور میں مکمل کیے۔ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کالج (لاہور) سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد ولایت چلے گئے۔ وہاں واڈھم کالج، آکسفرڈ سے ۱۹۱۲ء میں بی اے آنرز (تاریخ) کی سند لی؛ وہ اس سال کے تاریخ کے تمام طلبہ میں اوّل آئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان دیا۔ اس میں کامیابی کے بعد واپس وطن چلے آئے۔ اور کچھ دیر یہاں اعزازی طور پر اسلامیہ کالج میں تاریخ پڑھاتے رہے تھے۔

شعر بھی کہتے تھے۔ زار تخلص تھا۔ پہلے مدتوں 'ابجد خوان' کے پردے میں سر عبدالقادر (ف ۱۹۵۰ء) کے ماہنامے مخزن میں نثری مضمون بھی لکھتے رہے۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں اپنے والد مرحوم کے تخلص کی مناسبت سے ماہنامہ 'ہمایوں' جاری کیا۔ اس کے سرلوح یہ شعر چھپتا تھا، جو ہمایوں مرحوم ہی کا تھا:

اٹھو، وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہمایوں ہماری زبان کا صفِ اوّل کا رسالہ تھا۔ کیا یہ کچھ کم امتیاز کی بات ہے کہ اس میں کوئی ایسی نظم یا غزل کبھی نہیں چھپی، جس میں لفظ 'بوسہ' استعمال ہوا ہو۔ یہی احتیاط اور رکھ رکھاؤ میاں بشیر احمد کی پوری زندگی کی علامت ہے۔ ہمایوں ۳۵ سال تک اردو کی شاندار خدمات سرانجام دینے کے بعد ۱۹۵۷ء میں بند ہو گیا۔

میاں بشیر احمد نے اردو کی ترویج کے لیے ۱۹۳۶ء میں 'انجمن اردو پنجاب' کی بنیاد رکھی تھی۔
اس کا اصل مقصد نوجوانوں میں علم و ادب کا ذوق اور تحقیق کا شغف پیدا کرنا تھا۔
وہ مختلف اوقات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رکن، پنجاب یونیورسٹی لاہور، کے فیلو (۱۹۳۶ء
۱۹۴۰ء) انجمن ترقی اردو کی منتظمہ کے رکن بھی رہے۔

یہ زمانہ سیاسی تگ و دو کا تھا اور پھر ان کے خاندان میں تو سیاست اور مسلم لیگ کے دن رات
چرچے رہتے تھے۔ سر میاں محمد شفیع ان کے چچا اور خسر بزرگوار تھے۔ (ان کی بیگم گیتی آرا سر محمد
شفیع کی چھوٹی صاحبزادی اور جہاں آرا بیگم شاہ نواز کی چھوٹی بہن ہیں) مسلم لیگ کے
مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور کی (جس میں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی تھی)
مجلس انتظامیہ کے سکرٹری میاں بشیر احمد ہی تھے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ
کی مرکزی عاملہ کے رکن بھی رہے؛ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۹ء پنجاب مجلس واضع قوانین کے بھی رکن
تھے۔ خضر حیات خاں ٹوانہ کی وزارت کے خلاف تحریک میں بھی شریک تھے، اور اس سلسلے
میں نوبت قید و بند تک پہنچی تھی۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد وہ ۱۹۴۹ء میں ترکیا میں
اپنے ملک کے سفیر مقرر ہوئے۔ ترکیا اور پاکستان کے درمیان دوستانہ معاہدے پر انھیں کے
عہد سفارت میں دستخط ہوئے تھے۔

انھوں نے ابتدائی ایام میں (آج سے کوئی چالیس سال پہلے) اپنے فلسفیانہ مضامین کا ایک
مجموعہ 'طلسم زندگی' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں روزمرہ کے واقعات سے جو بصیرت افروز
نتائج اخذ کیے ہیں، وہ انھیں کا حصہ تھا۔ کتاب کی ظاہری شکل و صورت بھی بہت دیدہ زیب
تھی، جو ان دنوں اردو کتابوں کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ اپنے والد کی سوانح عمری انگریزی
میں مرتب کی تھی؛ اس میں ان کی تقریریں بھی شامل ہیں۔ ایک کتاب 'کارنامہ اسلام'
بھی ہے۔ اسلامی سیاست سے متعلق بھی "مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل" ایک کتاب
موجود ہے۔ مضامین کا بہت بڑا ذخیرہ 'ہمایوں' کے صفحات میں محفوظ ہے۔

اولادِ جسمانی میں ایک بیٹا (منظر بشیر) اور دو بیٹیاں (رفعت جہاں اور ثروت جہاں) ان سے یادگار رہیں۔ انتقال ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو لاہور کے مکان (المنظر) میں ہوا تھا لیکن لاش اگلے دن (۴ مارچ) باغبانپورہ گئی۔ جہاں ان کے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

عبدالقادر سروری (پروفیسر)

پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کے والد حاجی محمد سرِ خزانۂ عامرہ، حیدرآباد میں بحیثیت متاد قلیل مشاہرے (غالباً بارہ روپے) پر ملازم رہے۔ یہاں ان کے ذمے وظیفہ خواروں کے نام پکارنے کا کام سپرد تھا۔ اس قلیل آمدنی پر بھی قناعت اور خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سروری صاحب ان کی دوسری بیوی کے بطن سے ۱۹ اگست ۱۹۰۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی و اردو کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے علاتی بھائی مولوی محمد جعفر سے پائی۔ اسکول جانے کے قابل ہوئے، تو مختلف مدارس سے ہوتے ہوئے بالآخر سٹی ہائی اسکول سے دسویں درجے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے ۱۹۲۷ء میں ایم اے (اردو) اور ۱۹۲۹ء میں ایل ایل بی (یعنی وکالت) کے امتحان پاس کیے۔ ایم اے میں مرحوم ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ان کے ہم جماعت تھے۔ یونیورسٹی میں اس وقت صدرِ شعبۂ اردو مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (ف ۱۹۲۸ء) تھے؛ ڈاکٹر سید سجاد (ف کراچی ۲۴ فروری ۱۹۵۵ء) بھی یہیں تھے۔ اسی سال سلیم نے بیماری کے باعث لمبی رخصت لی تھی اور ان کی جگہ مولوی عبدالحق صدر شعبہ مقرر ہوئے تھے۔ سلیم جاتے وقت سفارش کر گئے کہ

سروری صاحب کو شعبے میں مددگار پروفیسر مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ سروری صاحب اسی سال جامعۂ عثمانیہ میں مددگار پروفیسر اردو کے عہدے پر فائز ہو گئے اور اس طرح اب انھیں مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ یہاں ۱۹۴۲ء تک رہے۔ ۱۹۴۲ء میں سروری صاحب کا میسور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی صدارت اور پروفیسری پر تقرر ہو گیا۔ انھوں نے اپنے چھ سال کے دورانِ قیام میسور میں اس یونیورسٹی میں اردو کی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے بہت کام کیا۔ ایم اے کے درجے کھلوائے، جس سے شعبے کا کام وسیع تر ہو گیا۔ اردو کے نصاب کے لیے کتب تیار کروائیں، تاکہ تعلیم کا معیار بلند ہو۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی مادرِ تعلیمی میں صدرِ شعبہ کی جگہ خالی ہوئی، تو اس کی پیشکش انھیں کی گئی، جس پر وہ حیدر آباد واپس آ گئے۔ وہ تیرہ برس بعد ۱۹۶۱ء میں یہیں سے پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا سرینگر میں انتقال ہو گیا۔ جہاں وہ جون ۱۹۶۱ء سے اردو اور فارسی کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اب اصحابِ مجاز کی نظرِ انتخاب سروری صاحب پر پڑی، اور یوں ۱۹۶۳ء میں وہ سرینگر پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ جاڑوں کی تعطیلات کے زمانے میں اپنے وطن چلے آتے تھے۔ چنانچہ اب کے بھی تین ماہ حیدر آباد میں قیام رہا۔ وہ ۵ مارچ کو حیدر آباد سے سرینگر کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں دلّی اور جموں قیام کیا اور ۹ مارچ کو سرینگر پہنچے۔ اگلے دن (۱۰ مارچ) یونیورسٹی گئے۔ اسی رات دل کا دورہ پڑا، جو مہلک ثابت ہوا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء رات ساڑھے دس بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔ ۱۲ مارچ قبل از نمازِ جمعہ جنازہ اٹھا اور ان کے مسکن (جواہر نگر) کے قریب ہی ایک ویران سے قبرستان میں انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جناب نور اللہ حیدر آبادی (تلمیذ جلیل مانکپوری) نے نو کے تخرجے سے حسبِ ذیل تاریخ وفات کہی ہے:

وہ ادیبِ نامور، وہ پیکرِ خُلق و کرم	ہے بجا گر اس کے غم میں خون آنکھوں سے بہے
نو برس وہ اور جی جاتے، تو ہوتا سال یہ	عبدِ قادر سروری کشمیر سے جنّت گئے

(۱۹۸۰ - ۹ = ۱۹۷۱)

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی ان کی طالبعلمی کے زمانے (۱۹۲۶ء) ہی میں ہوگئی تھی لیکن یہ بیگم ڈیڑھ سال بعد اپنے پیچھے ایک دودھ پیتی بچی چھوڑ کر داغِ مفارقت دے گئیں۔ زبیدہ کلثوم ایم۔اے (عربی)، جو ونیتا مہاودیالہ، حیدرآباد میں عربی پڑھاتی ہیں، وہی بچی ہیں۔ دوسرا نکاح انھوں نے بہت دن بعد ۱۹۳۴ء میں کیا تھا۔ ان سے بھی ماشاءاللہ تین لڑکے اور دو لڑکیاں یادگار ہیں۔

سروری صاحب کو اردو تصنیف و تالیف کا شوق زمانۂ طالبعلمی سے تھا۔ سلیم مرحوم اپنے طلبہ سے بہت محبّت کرتے تھے اور ہونہار نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ یہ امرِ واقع ہے کہ زور اور سروری کا تصنیفی شوق سلیم ہی کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا۔ بلکہ سروری صاحب نے اپنے والد کے نام کی رعایت سے سروری کی نسبت بھی سلیم کے ایما پر اختیار کی تھی۔

سروری صاحب کی سب سے پہلی تصنیف "دنیائے افسانہ" ہے، یہ انھوں نے ایم اے پاس کرنے کے بعد شائع کی تھی (حیدرآباد، ۱۹۲۷ء)۔ اس کا دوسرا حصہ بعد کو شائع ہوا (۱۹۲۹ء)، جس میں "کردار اور افسانہ" سے متعلق بحث ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے بعض احباب سے دوسری زبانوں سے منتقل کرواکے افسانوں کے چار مجموعے بھی شائع کیے تھے: قدیم افسانے، چینی اور جاپانی افسانے از افتخار الدین و فیض محمد (۱۹۳۰ء)، انگریزی افسانے، فرانسیسی افسانے از عزیز احمد (۱۹۳۲ء)۔ وہ ایک زمانے تک حیدرآباد کے ماہنامے مکتبہ کے مدیر رہے تھے۔ یہ افسانے پہلے وقتاً فوقتاً وہیں شائع ہوئے، بعد کو انھیں کتابی شکل دے دی گئی۔ جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوئے، تو انھوں نے "جدید اردو شاعری" تصنیف کی (۱۹۳۲ء)۔ ایک لحاظ سے یہ کتاب حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" کا تتمہ ہے۔ یہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ دلّی اور لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

اسی زمانے میں جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے اپنی انجمن طیلسانین قائم کی تھی؛ اس کا اپنا مجلّہ بھی تھا۔ شروع میں غالباً پانچ برس تک (۱۹۳۷ء۔ ۱۹۴۱ء) زور مرحوم اس کے مدیر رہے۔ اس کے بعد ایک سال (۱۹۴۲ء) یہ سروری صاحب کی ادارت میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر زور اوائل ۱۹۳۱ء میں یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے اور جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ اردو ہی میں ان کا بھی تقرر ہوا۔ جیسا کہ بیان ہوا، مولوی عبدالحق اس زمانے میں صدرِ شعبہ تھے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے سکتر اور انجمن کے شہرہ آفاق تماہی رسالے 'اردو' کے مدیر بھی تھے۔ خدا معلوم کیونکر، دکن کے ادیبوں کو یہ بدگمانی پیدا ہوگئی کہ مولوی صاحب موصوف مقامی مصنّفوں کی مناسب حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ زور اور سروری کے زمانۂ طالبعلمی سے باہمی دوستانہ تعلقات تھے۔ انھوں نے اس خیال کو ہوا دی اور اپنے احباب کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد طے کیا کہ دکنی اور دکنیات اور دکنی ادیبوں کے فروغ کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت جنوری ۱۹۳۱ء میں 'ادارۂ ادبیاتِ اردو' کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے اولین بانی پانچ شخص تھے: ڈاکٹر محی الدین قادری زور (ف ستمبر ۱۹۶۲ء)، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، نصیر الدین ہاشمی (ف ستمبر ۱۹۶۴ء)، اور مولوی عبدالقدیر صدیقی، مدرّس شعبۂ دینیات، جامعۂ عثمانیہ (ف اوائل ۱۹۳۲ء)۔ کہا نہیں جا سکتا کہ ان اصحاب کا شک و شبہہ کس حد تک جائز اور صحیح تھا۔ لیکن پچھلے ۴۰ سال میں اس ادارے نے اردو کی ترقی و ترویج، تصنیف و تالیف اور مخطوطات کے تحفظ و تدوین کے سلسلے میں جو شاندار خدمات سر انجام دی ہیں، وہ تاریخِ ادبِ اردو کا روشن باب ہیں، اور اردو والوں کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے سروری صاحب کی یہ کتابیں شائع ہوئیں: سراج

کے کلام کا انتخاب، سراج سخن (۱۳۵۵ھ)، سراج اور اس کی شاعری، اردو مثنوی کا ارتقا (۱۹۴۰ء)؛ افسانوں کا مجموعہ: رات کا بھولا اور دیگر افسانے (۱۹۴۲ء)؛ اردو کی ادبی تاریخ (۱۹۵۰ھ)۔ ایک کتاب "زبان اور علم زبان" مجلس تحقیقات، حیدرآباد نے شائع کی تھی (۱۹۵۶ء)۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ابھی پارسال شائع ہوا ہے۔

نواب یوسف علی خاں سالارجنگ سوم (ف ۱۹۴۶ء) حیدرآباد کے پشتینی امیر تھے۔ سالارجنگ میوزیم انھیں نے جمع کیا تھا۔ وہ علم وادب اور فنونِ لطیفہ کے بڑے رسیا اور پارکھ تھے؛ دکنی زبان کے کئی انمول رتن اپنے کتابخانے میں جمع کیے تھے۔ بعض احباب کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۳۵ء میں 'مجلسِ اشاعتِ دکھنی مخطوطات' قائم کی، جس کا مقصد اس کے نام سے عیاں ہے۔ سروری مرحوم بھی اس کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے اس مجلس کے لیے یہ کتابیں مرتب کیں: پھولبن از ابن نشاطی (۱۳۵۰ھ) قصۂ بلینظیر از صنعتی (۱۳۵۷ھ)، کلیاتِ سراج (۱۳۵۷ھ)۔

انھوں نے اپنے قیامِ میسور کے زمانے میں نواب حیدر علی خاں (ف ۱۷۸۲ء) کے منشی مہتاب رائے سبقت کی بیاض 'مہتاب سخن' کے عنوان سے مرتب کی تھی۔ میسور میں ایک صوفی بزرگ شاہ صدرالدین گذرے ہیں۔ ان کا تصنیف کردہ ایک رسالہ 'مرآۃ الاسرار' دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے۔ سروری صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

سرینگر (کشمیر) کے قیام کا ثمرہ تین کتابیں تھیں: کشمیر کے دو ادیب، دو بھائی (پنڈت ہرگوپال خستہ اور سالک رام سالک) (حیدرآباد ۱۹۶۵ء) اور کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ (حیدرآباد ۱۹۶۸ء)۔ انھوں نے ریاست کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ آخری ملاقات کے دوران میں انھوں نے بتایا تھا کہ تقریباً ۹۰۰ صفحات لکھے جا چکے ہیں، اس کا مسودہ کلچرل اکیڈمی، سرینگر کی تحویل میں ہے۔ اسے جلد شائع کر دینا چاہیے۔

قیس بنارسی، منشی شیومورت لال

ان کے بزرگوں کا وطن ضلع جونپور کا قصبہ منڈیاہوں (ضلع جونپور) تھا۔ یہاں ان کی کچھ زمین تھی اور کھیتی باڑی ذریعۂ معاش تھا۔ قیس کے والد منشی گنپت سہائے تقریباً ایک صدی پیشتر اس گاؤں سے نقلِ مکان کر کے بنارس چلے آئے تھے۔ وہ قوم کے سریواستو (کائستھ) اور پیشے کے لحاظ سے عرائض نویس تھے اور اس فن کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس سے انھوں نے خاصی بڑی جائداد پیدا کی تھی۔

قیس ۱۹۰۳ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کوئنز کالج پہنچے، لیکن یہ وہ زمانہ ہے، جب انگریزی حکومت کے خلاف ہماری جنگِ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ قیس نے بھی ترکِ موالات کی تحریک پر لبیک کہا اور تعلیم چھوڑ، کانگریس میں شامل ہو گئے۔ اس سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اس کے بعد تعلیم کا رشتہ پھر کبھی استوار نہ ہو سکا۔

شعر و شاعری سے دلچسپی بھی اسی زمانے میں پیدا ہوئی، لیکن صرف پڑھنے اور سننے کی حد تک۔ ایک مشاعرے میں اتفاق سے ملاقات بنارس کے مشہور اہلِ دل شاعر شاہ سرن

لال صوفی (ف جون ۱۹۳۶ء) سے ہوگئی۔ صوفی ہمارے مرحوم وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری (ف جنوری ۱۹۶۶ء) کے حقیقی ماموں تھے! شاستری جی کی تعلیم و تربیت بھی صوفی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی۔ وہ ایک زمانے تک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پیشکار بھی رہے تھے۔ صوفی خود رحمت بنارسی (ف ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵-۱۹۳۶ء) تلمیذ داغ کے شاگرد تھے۔ غرض نوجوان قیس کی صوفی سے ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اندر کی خوابیدہ شعری قوتیں بیدار ہوگئیں۔ انھوں نے قیس تخلص اختیار کیا، اور صوفی سے اصلاح لینے لگے۔

چونکہ والد کے ترکے سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، اس لیے فکرِ معاش ان کے شوق کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ شاعری اور شراب ان کے دو شوق زندگی کے ساتھ تھے۔ آخر میں کچھ پریشان سے رہنے لگے تھے۔ اس پر اتر پردیش کی حکومت نے ان کا ۷۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ (ادبی) مقرر کر دیا تھا۔

افسوس کہ کلام شائع نہیں ہوا، حالانکہ ضخیم کلیات موجود ہے۔ اگرچہ سب اصناف سخن — غزل، نظم، رباعی، قطعہ — میں طبع آزمائی کی، لیکن ان کا اصلی میدان غزل تھی۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۱ء کو بنارس میں انتقال کیا۔ احباب اور شاگردوں کا بہت بڑا حلقہ ان کے سوگواروں میں ہے۔

ان کے کلام میں جذبے کی شدت اور والہانہ پن ہے، جو اثر سے خالی نہیں۔ پڑھنے میں بھی ایک وارفتگی کا عالم تھا۔ چند شعر سنیے:

میری مینائے تغزل سرفرازِ آرزو
اے بتِ ایماں شکن! کیا ہے یہ رازِ آرزو؟

اب تو میں آ ہی گیا ہوں آستانے پر ترے
کہہ بھی دے کیونکر ادا ہو گی نمازِ آرزو!

کتنے جذبے موجزن ہیں دیدہ و دل میں مرے
کتنے نغموں سے بھرا ہے میرا سازِ آرزو!

تیرے جلوے، میرے سجدے، تیرا عالم، میرا دل
اس پہ بھی ہوتا نہیں ہے امتیازِ آرزو

میں وہی ہوں قیس جو تیری بدولت آج بھی ہر حقیقت کو سمجھتا ہے مجازِ آرزو

اے قیس! نوشتے کا ہر اک جام پیے جا کچھ بھی تو نہیں گردشِ ایّام، پیے جا
کر ترکِ خودی، صبح سے تا شام پیے جا اک نعرۂ مستانہ ہے انجام، پیے جا
جس زیست میں کچھ غم نہیں، وہ زیست ہے تیری ہر سانس تجھے دیتی ہے پیغام، پیے جا
تیرے ہی لیے ساری فضا جھوم رہی ہے تیرے لیے ہے وجد کا ہنگام، پیے جا
تجھ کو تو انالحق کی صدا ڈھونڈ رہی ہے منصور کے سایے میں سرِ بام، پیے جا
ان ہوش کے بندوں میں ترا نام نہیں ہے گمنام ہی اچھا ہے، تو گمنام، پیے جا

نگاہ تو نے ڈال دی تو زندگی نئی ملی نگاہ تو نے پھیر لی، فسانہ ختم ہو گیا
جفا پرست دوست کو وفا پرست کیا کریں مزاجِ حسن ہی تو ہے، بدل گیا بدل گیا

اگر شعورِ عشق ہے، تو زندگی حسین ہے خوشی ملی، تو کیا ہوا، جو غم ملا تو کیا ہوا

اے مری جانِ تغزل! اک ادائے دلبری اب تو ایمانِ محبت ہے، نگاہِ کافری
اے مری جانِ تمنا! اے مری جانِ نظر! قبلۂ تسلیم تیری خود نمائی، خودسری
پھر تری موجِ تبسم کی طرف رقصاں ہو دل پھر فریب آرا ہوئی تیری نگاہِ ساحری
پھر مجھے لے جا کے اس منزل پہ پہنچا دے جہاں ہر نظر ہے فتنہ پرور، ہر ادا جادوگری

ہم اہلِ غم ممات کو حیات کہتے آئے ہیں ستم کی ہر ادا کو التفات کہتے آئے ہیں
خوشی ملی خوشی سہی، جو غم ملا تو غم سہی تمھاری دین کو تبرکات کہتے آئے ہیں

جہاں کے ذرّے ذرّے میں تمھارا حسن ہی نہاں
اسی جہاں کو لوگ بے ثبات کہتے آئے ہیں
جنوں کو ساتھ میں لیے، بیخودی کے ساز پر
ہمیشہ قیس اپنے دل کی بات کہتے آئے ہیں

متفرق اشعار

نہ پوچھ مجھ سے ابھی، صبحِ زندگی کیا ہے
تجھے بتاؤنگا، اے دوست! اپنی شام کے بعد

غنچہ و گل تو ملے، بوئے محبت نہ ملی
دوست بھی ایسے ملے، جن سے طبیعت نہ ملی

امید پہ دنیا قائم ہے، اور مجھ کو کوئی امید نہیں
جو مجھ کو ملا دیتی تم سے، قسمت میں مری وہ عید نہیں

مانا کہ گلوں کے دامن میں یہ رات بسر ہو جائیگی
جب صبح کی کرنیں پھوٹینگی اے قطرۂ شبنم! کیا ہوگا؟

ملتے نہیں مزاج دلِ بیقرار کے
دیوانہ جب سے کہہ دیا تم نے پکار کے

انھیں کو پیار کیا میں نے تیرے دھوکے میں
جہاں جہاں تری پرچھائیاں ملیں مجھ کو

مریم ذلت کی پکار آج بھی ہو اسی طرح
عیسیٰ! ترے صلیب کی رات بہت اداس ہے

اختر تلہری، سید اختر علی

ضلع شاہجہانپور میں ایک قصبہ تلہر ہے؛ یہیں شیعہ سادات کے ایک ممتاز دینی گھرانے میں ۱۲ اپریل ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے خاندان کے ماحول اور روایات کے پیشِ نظر مذہبی رہی اور اس میں تکمیل کے درجے تک پہنچے۔ وہ مدرسۂ عالیہ رامپور کے فارغ التحصیل تھے۔ عربی، فارسی کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی اتنی اچھی مہارت پیدا کر لی کہ انگریزی کی اعلیٰ اور دقیق کتابوں سے بلا تکلّف وہ استفادہ کر سکتے تھے۔ ان تینوں زبانوں میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ذریعۂ معاش مدرّسی تھا۔ وہ ۱۸ برس تک جوبلی کالج لکھنؤ میں پڑھاتے رہے اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ افسوس کہ انھیں سازگار ماحول میسر نہ ہوا اور ان کی قابلیت اور جولانیِ طبع کو اپنے جوہر دکھانے کے لیے پورا میدان نہ ملا، ورنہ جس پایے کے وہ محقّق اور ادیب، نقاد اور ماہرِ لغات تھے، ہماری زبان کا دامن ان کی نگارشات سے مالا مال ہو سکتا تھا۔

جوبلی کالج میں ان کے ہمکاروں میں حامد اللہ افسر (اردو) اور علی عباس حسینی (تاریخ)

اور خواجہ اطہر حسین (انگریزی) تھے۔ خواجہ اطہر حسین نے ایک زمانے میں ماہانہ ادب (لکھنؤ) میں کچھ مزاحیہ مضامین بھی لکھے تھے، جن میں سالی، سرود، ہمسایہ وغیرہ نے خاصی شہرت پائی۔ ادب کے ایڈیٹر اعظم حسین تھے۔

اسی زمانے میں شیعوں میں دو فریق ہو گئے: علما، اور جدیدی۔ اختر بیحد آزاد خیال تھے اور قدامت کے مخالف؛ چنانچہ انھوں نے جدیدی گروہ کی تائید کی۔ اطہر حسین اور علی عباس حسینی بھی اس میں ان کے ساتھ تھے۔ انھیں ایام میں اطہر حسین نے معجزے کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں روایتی نظریے سے انحراف تھا۔ اس کا جواب شیعوں کے کالج سلطان المدارس کے مدرّس مولوی سیّد عبدالحسین منطقی نے دیا۔ پھر تو سخت رن پڑا۔ اس مناقشے میں اطہر حسین کو سارا مواد اختر صاحب نے مہیا کیا تھا۔

اگرچہ حکومت کے ملازم تھے، لیکن شدید قوم پرور؛ مدّتوں روزنامہ سرفراز (لکھنؤ) میں "سیرِ دلبراں" عنوان کا مزاحیہ کالم "گل افشاں کے قلم سے" لکھتے رہے۔ حسینی بھی کبھی کبھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان مضامین میں یہ لوگ جی کھول کر حکومت کے خلاف لے دے کرتے تھے۔ سرفراز شیعہ کانفرنس کا اخبار تھا، اور خواجہ اسد اللہ اسد اس کے ایڈیٹر تھے۔ کانفرنس میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا اور وہاں دو پارٹیاں بن گئیں۔ اس کشمکش میں اسد کی نوکری کے ماتھے گئی۔ اسد نے خیال کیا کہ اختر اور حسینی بھی ان کے مخالف ہیں۔ انھوں نے بدلہ لینے کی خاطر ان کے وہ مسودات جن میں ان لوگوں نے حکومت پر نکتہ چینی کی تھی، حکومت کے حوالے کر دیے۔ پھر کیا تھا، تہلکہ مچ گیا اور دونوں ملازمت سے الگ کر دیے گئے۔ شیعی رؤسا کا حکومت میں بہت رسوخ تھا۔ ان کے دوستوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ بارے، حکومت نے برطرفی کا حکم واپس لے لیا اور بات تبادلے پر ٹل گئی ـــ حسینی غازی پور بھیجے گئے اور اختر شاہجہانپور۔

وہ مدتوں سرفراز میں "محاسبے" کے عنوان کے تحت "مبصّر" کے نام سے تبصرے اور

علمی، ادبی نکات بھی لکھتے رہے۔ لغت پر ماہرانہ قدرت تھی اور حافظہ بے پناہ تھا۔ مراجع کے دیکھے بغیر، قلم برداشتہ ایسا ماقلّ ودلّ لکھتے تھے کہ اعتراض کسی کے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے کئی معرکے یادگار ہیں، جن میں حامد اللہ افسر اور مجنوں گورکھپوری سے چپقلش خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

مذہب کے بارے میں ان کی رواداری ضرب المثل تھی۔ اختلاف خواہ ملک کے دو طبقوں میں ہو، یا مسلمانوں کے دو گروہوں میں، وہ ان دونوں کے مخالف تھے۔ ان کی تحریریں اسی نظریے کی ترجمان تھیں۔ ان کی کتابیں ابتلائے عظیم (۱۹۲۵ء)، شہادتِ عظمیٰ (۱۹۳۰ء)، مذہبی تصورات (۱۹۵۳ء)، علوی تصورات (۱۹۵۴ء)، مولانا مودودی کا اسلامی نظریۂ سیاست، شعر و ادب، تنقیدی شعور (۱۹۵۷ء) مقالاتِ تلہری، اور انگریزی کتاب آئیڈل کنگ جہاں ان کے علم کی وسعت کی آئینہ دار ہیں، وہیں ان کے فکر کی گہرائی پر بھی برہانِ قاطع ہیں۔ ان کے سینکڑوں مضامین مختلف رسائل و جرائد میں منتشر پڑے ہیں۔ خاص طور پر اقبال کی شاعری اور فلسفے پر انھوں نے بہت اہم سلسلۂ مضامین قلم بند کیا تھا۔ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے؛ اختر تخلص تھا۔ افسوس کہ مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔

وہ بہت دن سے بیمار چلے آرہے تھے۔ انھیں مدت سے فشارِ دم کا تکلیف دہ عارضہ لاحق تھا۔ اور جب اس کا دورہ پڑتا تھا، وہ از کار رفتہ ہو جاتے تھے۔ پارسال اپریل میں دل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ جب حملہ ہوا، تو بلرامپور اسپتال، لکھنؤ میں علاج کی غرض سے داخل ہوئے اور اچھے ہو کر واپس مکان پر آگئے۔ لیکن اب سیدھا ہاتھ اور پاؤں مفلوج ہو گئے۔ ساتھ ہی پیٹ میں ایک گلٹی نمودار ہو گئی، جو ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق کینسر ثابت ہوئی۔ جب حالت خراب ہونے لگی، تو دوبارہ بلرامپور اسپتال چلے گئے، وہیں بدھ کے دن ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء صبح پونے چھ بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔ اسی

دن جسدِ خاکی شاہجہاںپور منتقل کیا گیا، جہاں شام کو خاندانی قبرستان واقع محمد گڑھی میں تدفین عمل میں آئی۔

دو بیٹے (آفتاب اختر اور سہیل اختر) اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔ بڑے بیٹے آفتاب اختر گاندھی انٹر کالج، شاہجہاںپور میں مدرس ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

میرا سجدہ قیدیِ سنگِ درِ جانانہ ہے — توبہ! ذوقِ بادہ، رہینِ شیشہ و پیمانہ ہے
مسکراتا ہی رہے جو حادثاتِ دہر پر — ایسا دیوانہ حقیقت میں بڑا فرزانہ ہے
پا رہے ہیں اس سے اک تازہ حیات اہلِ چمن — وہ ترے شوریدہ سر کا نغمۂ مستانہ ہے
ہے شہیدانِ وفا کی خاک اور سجدے مرے — کیش اپنا بندگیِ ہمتِ مردانہ ہے
عقل و دانش کے جنوں کی بدحواسی کچھ نہ پوچھ — ہے کبھی پیشِ نظر کعبہ کبھی بت خانہ ہے
تو نے خود ہی تو خیالِ ماسوا کو دی جگہ — ورنہ تیرا دل تو اس کا خاص خلوت خانہ ہے
کھول ڈالے باتوں ہی باتوں میں اسرارِ حیات — یوں تو کہنے کو یہ مردِ باخدا دیوانہ ہے
دین سے مطلب نہیں، دنیا سے میں بیگانہ ہوں — سامنے آنکھوں کے اختر جلوۂ جانانہ ہے

نہیں ہو برشِ تیغِ جفا وہ میرے قاتل کی — نگاہِ حسرت آگیں دیکھ لی کیا اپنے بسمل کی
مرا عشقِ جنوں مشرب ستم سے دب نہیں سکتا — ہیں زندانِ بلا میں وہی آزادیاں دل کی
ابھی گرداب کی طوفاں نفس موجوں سے لڑنا ہے — ابھی مجھ کو نہیں ہے فکرِ عشرت گاہِ ساحل کی
مقدر اس کا ہے پامالِ گامِ رہرواں ہونا — خبر کیا خاکِ جادہ کو طربہائے منازل کی
کہیں سے تیشۂ فرہاد مل جائے تو لطف آئے — بہت یاد آرہی ہے اس بتِ شیریں شمائل کی
بچھاتا ہو زمانہ راہ میں کس شوق سے آنکھیں — ذرا توقیر دیکھو اپنے پابندِ سلاسل کی
بہارِ گلشنِ ہستی سمائے کیا نگاہوں میں! — حیاتِ مختصر دیکھے ہوئے ہوں شمعِ محفل کی
گلوں کا رنگ و بو جنت بداماں ہی سہی، لیکن — مرے کانوں سے ٹکراتی ہیں فریادیں عنادل کی
مٹادی عشق نے آخر مری وہ شانِ خودداری — چلا ہوں پھر اسی ظالم سے کہنے داستاں دل کی

خبر بھی ہے تجھے، اے مہرِ طلعت، کہکشاں رفعت! | ترے جلووں کی ہیں مشتاق نظریں اہلِ محفل کی
ہے، اخترؔ! ذوق خود ہی رہنما اس صعب منزل میں | مجھے حاجت نہیں فنِ قوافی و فواصل کی

جنّت جو تھی، مرے لیے جنّت نہیں رہی | یعنی چمن مزاجِ طبیعت نہیں رہی
پامالِ حادثات، ہے گلچینِ نظر | میرے خیال و فکر میں ندرت نہیں رہی
بادِ بہار ہے تو خراماں چمن چمن | لیکن گلوں میں پہلی سی نکہت نہیں رہی
اس انقلابِ دہر کی نیرنگیاں نہ پوچھ | دنیائے رنگ و بو کی وہ صورت نہیں رہی
شوریدگیِ فکر کی، اللہ رِی جرائتیں! | حدبندیِ مجاز و حقیقت نہیں رہی
جب سے سنی ہے طور و تجلّی کی داستاں | تم سے نظر ملانے کی ہمت نہیں رہی
اب بتکدے سے کعبہ کی جانب ہی میرا رخ | کیا وہ صنم نوازِ طبیعت نہیں رہی
اک لعلِ شب چراغ، ہے ضَوریز و ضَوفگن | اب میرے غمکدے میں وہ ظلمت نہیں رہی
یہ پیش بندیاں ہیں کسی انقلاب کی | نسرین و یاسمین کی وہ رنگت نہیں رہی
ہندوستاں کا مہر ہے، اخترؔ! عروج پر | وہ سرورانِ عصر میں نخوت نہیں رہی

قطعات

بلند حوصلگی

گرداب کے نظّارے سے، او کانپنے والے! | بپھری ہوئی موجوں میں بھی گھر کر میں ہنسا ہوں
ہے سیلِ حوادث جو بلا خیز، تو کیا ڈر | میں برق سے، آندھی سے، سمندر سے لڑا ہوں

خوش منش رند

خوش منش رند ہیں اب دیر و حرم کی زینت | زاہدِ تنگ نظر کے لیے ناداں ہی سہی
دانشِ عصر، ہے کیا ان کی روش پر خنداں! | محرمِ راز تو ہیں، چاک گریباں ہی سہی

دماغ نظرتِ خود دار، ہمنشیں! مت پوچھ | کسی کا دَر سہی، جھکتی نہیں جبیں میری
غرورِ اہلِ ریاست پہ مسکراتا ہوں | ہے ان کے عرش سے بالا کہیں زمیں میری

حبیب اشعر دہلوی، حکیم حبیب احمد

حکیم حبیب احمد اور حکیم اجمل خاں مرحوم یک جدّی تھے۔ وہ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، ہر طرح کی فراغت تھی، اس لیے جوانی تک بہت عیش و آرام سے بسر ہوئی۔ اگرچہ قرآن، عربی، فارسی سب علوم کی تعلیم خاص اساتذہ سے حاصل کی تھی، لیکن طبیہ کالج سے تکمیل کے بعد اپنی خاندانی روایات کے پیشِ نظر طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا، تو یہ بھی لاہور چلے گئے۔ اس کے بعد گردشِ روزگار نے گویا ان کا گھر دیکھ لیا۔ وہ اطمینان اور فارغ البالی جو شروع سے ان کے گھر کی لونڈی تھی، دلّی چھوٹتے ہی ساتھ چھوڑ گئی۔ لاہور میں مطب قائم کیا، اور کئی مرتبہ؛ مختلف اخباروں میں طبّی کالم لکھتے رہے؛ اپنا ماہانہ طبّی اور ادبی، رسالہ "حاذق" نکالا؛ متعدد عربی کتابوں کے مستند ترجمے شائع کیے؛ فلموں کے لیے کہانیاں لکھیں — لیکن اتنے پاپڑ بیلنے کے باوجود معاشی تنگی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ نہ طبابت کے پیشے میں کوئی کامیابی نصیب ہوئی، نہ ادب و شعر نے کوئی فائدہ پہنچایا۔

۱۵ جون ۱۹۷۱ء رات کو لاہور میں قیدِ حیات و بندِ غم دونوں سے نجات ملی۔ خاندانِ شریفی کے ذاتی قبرستان گلبرگ، لاہور میں سپردِ خاک ہوئے۔

مشہور لبنانی مصنف اور شاعر خلیل جبران کی متعدد کتابوں کے ترجمے کیے تھے، جو چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: ٹوٹے ہوئے پر، شیطان، دلھن کی سیج، بنفشہ کا پھول، ریت اور جھاگ، اشک و شبنم، پکار۔ ان کے علاوہ مصری افسانہ نگار مصطفیٰ لطفی منفلوطی کے یہ ترجمے چھپے ہیں: رخسانہ، تاج، شہناز، مصر کے دوسرے شہرہ آفاق مصنف محمد حسین ہیکل کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے مثلاً عمر فاروق اعظم۔

شعر بھی کہتے تھے، اشعر تخلص تھا۔ ان کا مختصر مجموعۂ کلام 'راز و نیاز' کے عنوان سے قبلِ تقسیمِ ملک شائع ہوا تھا (دلی ۱۹۳۹ء)۔ کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

بطورِ نمونہ ان کا کچھ کلام ملاحظہ ہو:

روح فرسا کوئی نالۂ دلِ ناشاد کریں ۔۔۔ آ تجھے آج غمِ عشق سے آزاد کریں

اہلِ دل جلوؤں میں ان کے آج، اشعر کھو گئے ۔۔۔ بیقرارانِ ازل کو بھی قرار آ ہی گیا

نہ ہو مسرت میں غم کا پہلو، تو زندگی میں مزا نہیں ہے

میں اس کو دل ہی نہیں سمجھتا، جو درد سے آشنا نہیں ہے

بتو! یہ بیداد بے سبب کیوں، کرم کی امید پر غضب کیوں؟

تم ایسے پیش آ رہے ہو ہم سے، ہمارا جیسے خدا نہیں ہے

زمیں بھی دشمن، فلک بھی دشمن، تمام عالم خلاف، لیکن

مجھے تو اس بات کا ہے رونا، تمھیں بھی خوفِ خدا نہیں ہے!

مرے حق میں الٰہی! یہ جفائے دوست کیا کم ہے

مری تقدیر سے وابستہ دورِ آسماں کیوں ہو!

جوشِ وحشت میں چھٹا دہر بھی، سجدے بھی گئے ۔۔۔ کام کی باتیں بھی نذرِ ہوسِ نسیاں ہو گئیں

اب یہی دل ہو پریشان و پشیماں کیا کیا | اسی کمبخت نے ربط اس سے کیا خود پیدا
أنا الحق، قُم باذنی، لَن ترانی، نالہ بلبل | کئی عنوان سے مشہور ہوا اک داستاں اپنی

دنیا کو دیکھ دیدۂ بینا لیے ہوئے | ہر ذرہ ہے جہانِ تماشا لیے ہوئے
تو، اور میرے سایے سے بھی تجھ کو اعتراض | میں، اور دل میں تیری تمنا لیے ہوئے

اب ہم ہیں، اور کشمکشِ اضطرابِ دل | وہ دن گئے کہ دعویٔ صبر و قرار تھا
شاید ہے انتہائے محبت اسی کا نام | تم پاس تھے، تو اور بھی دل بیقرار تھا

ہر ذرہ ہے سطرِ نور یہاں، ہر پتا ہے نخلِ طور یہاں
اب جائیے بھی، تو جا کر سوئے وادیٔ ایمن کیا کیجے
یہ موجِ چمن، یہ موسمِ گل، صیاد بہ ایں بھی زور نہیں
اس وقت ہے ایک اک شاخ یہاں شایانِ نشیمن، کیا کیجے

دل میں خوفِ خدا تو ہے، اشعرؔ! | میں اگر پارسا نہیں، نہ سہی
سو سو بناؤ ہیں، ترے اک اک بگاڑ میں | بس چھیڑ چھیڑ کر تجھے دیکھا کرے کوئی
ہو گیا ترکِ محبت کو زمانہ، اشعرؔ! | خواب کی طرح کبھی اس کا خیال آتا ہی

محمد حبیب (پروفیسر)

لکھنؤ کے ممتاز خاندان شیوخ کے نام لیوا تھے۔ اس خاندان نے زندگی کے ہر شعبے میں مشاہیر پیدا کیے ہیں۔ پروفیسر حبیب کے والد جناب محمد نسیم (ف ۱۹۵۵ء) اپنے زمانے کے مشہور دیوانی وکیل تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے اور تینوں نے اپنے اپنے میدان میں بڑا نام پایا۔ بڑے محمد وسیم تھے۔ یہ اپنے والد سے بھی بڑے نامی وکیل ہوئے۔ تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں کافی دن ایڈوکیٹ جنرل کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کا ۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ دوسرے یہی پروفیسر محمد حبیب تھے؛ اور تیسرے سب سے چھوٹے پروفیسر محمد مجیب، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ ہیں۔ خدا انھیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

پروفیسر محمد حبیب ۶ جون ۱۸۹۵ء کو اپنے آبائی مکان (قیصر باغ، لکھنؤ) میں پیدا ہوئے؛ (یہ مکان اب منہدم ہو چکا ہے) ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں ایم اے او کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے اور یہیں سے ۱۹۱۶ء میں بی اے کیا، اس سال یہاں سے درجہ اول میں پاس ہونے والے وہ واحد طالبعلم تھے۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہو کہ

۱۹۱۵ء میں اپنے اسکول کے قرآن کی پڑھائی، معانی، تشریح وغیرہ کے امتحانِ مقابلہ میں وہ اوّل آئے تھے اور ممتحنین (مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابو الکلام آزاد) نے انھیں پہلا انعام دیا۔

یہاں سے بی اے کرنے کے بعد وہ ولایت گئے اور نیو کالج، آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں بی اے (آنرز) کی سند پائی؛ یہاں مشہور مورّخ سر ارنسٹ بارکر ان کے استاد تھے۔

اب پنڈت موتی لال نہرو کے بلاوے پر وہ ہندستان آئے۔ پنڈت جی چاہتے تھے کہ وہ ان کے جاری کردہ انگریزی روزنامہ انڈی پنڈنٹ (لکھنؤ) کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو جائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ واپسی پر وہ علی گڑھ ہی میں ۱۹۲۲ء میں پہلے ریڈر اور سال بھر بعد ۱۹۲۳ء میں پروفیسر شعبۂ تاریخ ہو گئے۔ جب پولیٹکل سائنس کا شعبہ کھلا، تو وہ اس نئے شعبے میں پروفیسر مقرر ہوئے؛ تاریخ کے لیے کسی اور صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ حبیب صاحب ایک مرتبہ علی گڑھ پہنچ کر پھر عمر بھر یہاں سے نہیں نکلے۔

ان کی پوری زندگی علم کی خدمت میں بسر ہوئی؛ خاص طور پر تاریخ ان کا موضوع رہا۔ انھیں ہندستان کے عہدِ وسطیٰ (اسلامی دور) کی تاریخ سے خاص شغف تھا۔ اور ان کا اس کے ماہرین میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں آج جو اس عہد کی تاریخ سے اتنی دلچسپی لی جا رہی ہے اور یہ دور خاص طور پر مطالعے اور تحقیق کا موضوع بن گیا ہے، تو اس میں مرحوم پروفیسر حبیب کی مساعی کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ نہیں۔ اور جو ہیں، وہ بھی بیشتر اسی عہد کے متعلق ہیں۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے، وہ مستند ہے اور ہم آج تک اس پر اضافہ نہیں کر سکے۔ ان کی کتاب سلطان محمود غزنوی پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے جرأت اور بےخوفی سے سلطان محمود کے کردار اور عمل کو خلافِ اسلام قرار دیا۔ اس پر معترضین نے ان کی بہت مخالفت کی؛ خاص طور پر اردو اخباروں میں بڑے جوشیلے مضامین چھپے۔ لیکن

انھوں نے اس کی ذرّہ برابر پروا نہ کی اور اپنے نقطۂ نظر پر سختی سے قائم رہے۔ چنانچہ جب اس کتاب کا ۱۹۵۲ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، تو اس میں ایک لفظ کی کمی بیشی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں مہمّات علاء الدین خلجی (۱۹۲۶ء)؛ حضرت امیر خسرو دہلوی (۱۹۲۷ء)؛ ہندستان ماقبلِ حملۂ غوری (۱۹۳۰ء)؛ نظم و نسقِ ایران (۱۹۳۲ء)؛ دلّی سلطنت کا سیاسی نظریہ؛ اسلامی تصوف کا آغاز (شانتی نکیتن یونیورسٹی میں نظام لیکچرز (۱۹۳۶)؛ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۴۸ء) ہیں۔ یہ سب کتابیں اولاً انگریزی میں شائع ہوئیں؛ بعد کو ان میں سے بعض کے اردو ترجمے بھی ہوئے۔ ابھی پچھلے سال انھوں نے تاریخِ ہند (عہدِ سلطنت) پروفیسر خلیق احمد نظامی کی شراکت میں شائع کی تھی۔ اس میں مغلیہ دور سے پہلے کی سلطنتِ دلّی (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے حالات پوری شرح و بسط سے بیان ہوئے ہیں، نیز صوبائی حکمران خاندانوں کا تذکرہ بھی ہے۔ پار سال (۱۶-۱۷ مارچ ۱۹۷۰ء) انھوں نے دلّی یونیورسٹی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی سیرت اور تعلیمات سے متعلق اردو میں نظام لیکچر دیے تھے۔ یہ ہنوز کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ ان پر بھی بعض حلقوں سے اعتراض کی آواز اٹھی تھی۔ لیکن جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، اس کے اعلان میں انھوں نے کسی کے ڈر سے کبھی تذبذب کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے میدان میں اسی امتیاز کے باعث انھیں انڈین ہسٹری کانگرس کی صدارت پیش کی گئی (۱۹۴۶-۱۹۴۷ء)۔

وہ بہت دن سے ضیاء الدین برنی کی مشہور تاریخ فیروز شاہی کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ عرصے سے صحت بھی خراب چلی آ رہی تھی اور کتاب ضخیم ہے۔ اس لیے ترجمے کا کام بہت آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ قدرتاً انھیں تشویش تھی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میری دلی تمنّا ہے کہ میں مرنے سے پہلے یہ ترجمہ مکمل کر لوں۔ خدا نے ان کی سُن لی۔ یہ ترجمہ ان کے انتقال سے تین چار دن قبل پورا ہوا۔

انھوں نے کسی زمانے میں انگریزی میں افسانے بھی لکھے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ :

Desecrated Bones and Other Stories

کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔

غرض وہ اپنے کام کے لیے جیے۔ انھوں نے ساری عمر علم اور طالبعلم کی خدمت میں گزار دی۔ اپنے شاگردوں سے بیحد محبت تھی اور وہ ان کی دامے، درمے، قدمے ہر طرح مدد کرتے رہتے تھے۔ کئی طلبہ ان سے باقاعدہ وظیفہ پاتے تھے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے امتحان کے پرچے جانچنے کی ساری آمدنی وہ اسی کارِ خیر میں صرف کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ جب کوئی طالبعلم ان سے ملنے کو جاتا، تو وہ اندر سے جیب میں روپیہ اور ہاتھ میں کاغذ قلم لیے برآمد ہوتے کہ آنے والا یا تو مالی امداد کے لیے آیا ہوگا یا کسی جگہ کے لیے سفارشی خط لینے کو۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آگیا :

چند سال اُدھر کی بات ہے، مسلم یونیورسٹی میں کوئی جلسہ ہوا۔ جلسے کی صدارت اس زمانے کے وائس چانسلر جناب طیب جی فرما رہے تھے اور حبیب صاحب کو تقریر کرنا تھی جیسا کہ دستور ہے، صدرِ جلسہ مقرّر کا تعارف کرانے کو کھڑے ہوئے۔ طیب جی علی گڑھ جانے سے پہلے ملک کی فارن سروس کے ممتاز رکن تھے، اور اسی باعث ہماری وزارتِ خارجیہ میں سکتر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ بیشک، حبیب صاحب کو اپنے طلبہ سے بہت محبّت ہے، لیکن بسا اوقات وہ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا لحاظ نہیں کرتے۔ چنانچہ میرا تجربہ ہے کہ جب میں وزارتِ خارجیہ میں تھا تو ایک ہی اسامی کے لیے متعدد نوجوان میرے پاس پہنچتے اور ہر ایک کے ہاتھ میں حبیب صاحب کا سفارشی خط ہوتا۔ اس پر قہقہہ بلند ہوا۔ ان کے بیٹھ جانے کے بعد حبیب صاحب اٹھے۔ فرمایا: وائس چانسلر صاحب کی تقریر آپ نے سنی، اس پر مجھے ایک پرانی بات یاد آگئی۔ جب میں یہاں نیا نیا آیا، تو ایک دن دفتر پہنچنے پر وائس چانسلر صاحب سر شاہ محمد سلیمان

کا ایک گشتی مراسلہ موصول ہوا۔ لکھا تھا: دیکھا گیا ہے کہ یونیورسٹی کے طلبہ عام طور پر نماز باجماعت نہیں پڑھتے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ خود پنجوقتہ مسجد میں آکر نماز پڑھیں، تاکہ ان کی مثال سے طلبہ کو بھی باجماعت نماز ادا کرنے کی ترغیب ہو۔ میں اس زمانے میں نماز روزے کا بہت پابند تھا، اور اس میں شاذ و نادر ہی قضا ہوتی تھی۔ میں نے جب یہ گشتی مراسلہ دیکھا، تو مجھے اس مداخلتِ بیجا پر بہت غصہ آیا۔ میں نے اس پرو وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں لکھا کہ نماز کا معاملہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ہے، میں اسے جیسے چاہوں، پڑھوں۔ میں کسی شخص کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میرے اور میرے خدا کے درمیان حائل ہو۔ چنانچہ اس دن سے میں نے مسجد کی نماز ترک کر دی۔ کچھ اسی طرح کی بات آج موجودہ وائس چانسلر صاحب نے کہی ہے۔ میں ان سے صرف اتنا کہونگا کہ میں کسی شخص کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ میرے اور میرے طلبہ کے درمیان حائل ہو۔ اس پر پہلے سے بلند تر قہقہہ پڑا۔

جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے، تو انھیں ایمریٹس پروفیسر مقرر کیا گیا اور ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔

اسی جذبے کے تحت انھوں نے ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ "شمع" آگرہ سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ اس کا مقصد بھی اپنے ایک معذور وکیل دوست کی مدد کرنا تھا۔ یہ غالباً دو برس تک جاری رہا۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے، وہ اس کے مضامین کی بلندی اور طباعت و کتابت کے اونچے معیار کی شہادت دینگے۔

وہ سیاست کے آدمی نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعض اوقات عملی سیاست میں حصّہ لیا! ۱۹۲۶ء میں وہ یوپی کی مجلس واضع قوانین کے لیے سوراجیہ پارٹی کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے ہوئے اور سلطانپور حلقے سے منتخب ہو گئے۔ وہ ۱۹۳۱ء تک اس اسمبلی کے رکن رہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں وہ اقوام متحدہ دیوانی میں

ہندستانی وفد کے ساتھ پیرس گئے تھے؛ وہ اس وفد کے دوسرے لیڈر تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ہمارے یونسکو وفد (پیرس) کے بھی رکن تھے۔ ۱۹۵۱ء ہی میں ایک خیرسگالی وفد چین گیا تھا۔ پنڈت سندر لال اس کے لیڈر تھے۔ پروفیسر حبیب اس وفد میں شامل تھے۔ پروفیسر مجیب بھی اس وفد کے رکن تھے۔ مجیب صاحب نے واپسی پر اس سفر سے متعلق ایک کتاب بھی انگریزی میں لکھی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں حبیب صاحب رومانیہ کی حکومت کی دعوت پر بوڈاپسٹ بھی گئے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جب ہندستان کے صدر اور نائب صدر کا انتخاب ہوا، تو بعض دوستوں کے اصرار پر حبیب صاحب نے نائب صدر کے عہدے کے لیے اپنا نام دے دیا تھا، لیکن یہ اسی وقت جب انھیں اطمینان دلایا گیا کہ ان کے منتخب ہو جانے کا کوئی احتمال نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں علی گڑھ کا قیام کسی صورت میں ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ جب وہ واقعی ہار گئے، تو بہت خوش تھے اور اطمینان کا سانس لے کر فرمایا کہ شکر ہے، رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گزشت۔

طبیعت بیحد مرنجاں مرنج پائی تھی۔ ان کی سادگی اور بےنفسی کے بیشمار واقعات زبانزد ہیں۔ خدا کے اس نیک بندے کا ۲۲ جون ۱۹۷۱ء شام کے آٹھ بجے علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ اگلے دن جنازہ اٹھا اور یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اپنے پیچھے جسمانی یادگار دو بیٹے چھوڑے: بڑے کمال حبیب، یہ پاکستان میں ہیں۔ چھوٹے عرفان حبیب صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ہیں۔

تسکین قریشی، محمد یٰسین

ان کا خاندان دراصل سہسوان کا رہنے والا تھا۔ سورون (ضلع ایٹہ) کے مغلوں اور سہسوان کے قریشیوں میں آپس میں رشتے داریاں ہوتی تھی۔ چنانچہ تسکین صاحب کی سگڑ دادی سورون کی تھیں۔ ان کے دو لڑکے تھے، بڑے رفعت اللہ اور ایک ان سے چھوٹے۔ والدہ ان دونوں کو ساتھ لے کر اپنے میکے سورون آگئیں۔ یہی رفعت اللہ جناب تسکین کے پر دادا تھے۔ یہاں منجملہ اور اراضی کے گوجر پوران کی جاگیر میں تھا، اور یہ زمینداری کے خاتمے تک خاندان کے قبضے میں رہا۔ رفعت اللہ سہسوان جاتے آتے رہتے تھے۔ سورون کی مستقل سکونت تسکین کے دادا گل حسین صاحب کے زمانے سے شروع ہوئی۔ زمینداری، کاشتکاری ان کا ذریعۂ معاش تھی۔

تسکین کے والد سخاوت حسین صاحب نے پولیس میں ملازمت اختیار کرلی تھا ادری نید سے پنشن پائی۔ ان کا ۷۵ سال کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔ سورون ہی میں مدفن ہے۔

تسکین صاحب جنوری ۱۸۹۹ء میں سورون میں پیدا ہوئے۔ آگرہ گورنمنٹ

اسکول سے ۱۹۱۷ء میں دسویں درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے سینٹ انڈریوز کالج، گورکھپور میں داخلہ لیا۔ ان کے بڑے بھائی عبدالواسع اس زمانے میں گورکھپور میں ایڈیشنل کلکٹر تھے؛ انھیں کے ساتھ قیام رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ گورکھپور میں تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ ہوا ہی اس لیے تھا کہ بڑے بھائی وہاں مقیم تھے۔

۱۹۲۱ء میں پولیس کے محکمے سے ملازمت مل گئی اور ترقی کرتے کرتے اوّلاً پولیس ٹریننگ کالج میں پروفیسر ہوئے، اور آخر کار لکھنؤ میں سی آئی ڈی پبلک پراسیکیوٹر۔ یہیں سے ۱۹۵۲ء میں پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے جس دیانت داری اور احساسِ فرض اور وضعداری سے ملازمت کا زمانہ بسر کیا، اس پر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ نیل کے مٹکے سے بے داغ نکل آنا آسان، لیکن پولیس کی ملازمت سے صاف بچ نکلنا غیر ممکن؛ لیکن انھوں نے یہ کر دکھایا۔ خدا جسے توفیق دے! ملازمت کا زیادہ زمانہ سہارنپور میں بسر ہوا، یہاں چودہ برس (۱۹۳۰ء - ۱۹۴۳ء) قیام رہا۔ پنشن کے بعد مستقل قیام میرٹھ میں اختیار کیا۔

یہیں میرٹھ میں ۱۹۵۵ء میں میری ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ میں اس زمانے میں تلامذۂ غالب کی تکمیل کی فکر میں سرگرداں تھا۔ اس سلسلے میں میرٹھ بھی پہنچا۔ یہاں غالب کے دو شاگرد تھے: اسمٰعیل میرٹھی اور رنج میرٹھی۔ اسمٰعیل میرٹھی کے صاحبزادے جناب اسلم سیفی مدظلہ سے ملاقات ہوئی۔ ان سے دیر تک گفتگو رہی۔ جب میں نے سرِ شام اجازت چاہی، تو پوچھا: اب کہاں جائیںگے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے حکیم فصیح الدین رنج کے حالات کی تلاش ہے، اب انھیں کے ہاں جانے کا ارادہ ہے۔ فرمایا: میں ان کے پرپوتے حکیم سیف الدین احمد کو یہیں بلواتا ہوں، قریب ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ٹیلیفون کیا اور حکیم سیف سلّمہٗ پہنچ گئے۔ اسلم سیفی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا، اور چند منٹ بعد ہم اٹھ کر سیف صاحب کے مکان (اور مطب) پر آ گئے۔

تسکین صاحب وہیں پڑوس کے مکان میں رہتے تھے، بلکہ ان کا مسکن اسی احاطے میں تھا، جس میں سیف صاحب کا مطب ہے۔ سیف نے انھیں بلوایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تسکین صاحب بہت متین اور سنجیدہ مزاج آدمی تھے، بہت آہستہ آہستہ اور ایک ایک لفظ صاف صاف کہہ کر بات کرنے والے۔ یہ غالباً اُن کی مدۃ العمر کی پولیس کے محکمے کی ملازمت کا نتیجہ تھا۔ آخر میں انھوں نے میری درخواست پر بہت کچھ تکلف کے بعد اپنی دو غزلیں سنائیں۔ میں کلام کی بلندی پر دنگ رہ گیا۔

تسکین صاحب کو شعر و سخن سے دلچسپی بچپن کی بیت بازی سے شروع ہوئی۔ یوں سینکڑوں ہزاروں شعر یاد ہو گئے۔ کبھی کبھی بیت بازی کے دوران میں ناطقہ بند ہونے لگتا، تو یہ اپنی طرف سے ٹوٹے پھوٹے، ملا کے کچھ سنا دیتے۔ رفتہ رفتہ خود بھی شعر کہنے لگے۔ آغاز میں کلام اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد محفوظ کو دکھایا۔ محفوظ زیادہ تر نعت کہتے تھے۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ دیوان محفوظ کے عنوان سے موجود ہے۔ پھر ۱۹۱۶ء - ۱۹۱۷ء کے دو سال انھوں نے مولوی سید حسن مرتضیٰ اشفق عماد پوری (م ۱۹۴۴ء) سے اصلاح لی۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے شاگرد ہو گئے اور یہ سلسلہ عزیز کی وفات (۱۹۳۵ء) تک جاری رہا۔

تسکین کا کلام بہت بلند اور پایدار ہے۔ سارا کلام انتخاب معلوم ہوتا ہے، اس میں بھرتی کا شعر شاذ و نادر ہی نکلیگا۔ ۱۹۳۶ء میں حج کیا تھا۔ اس کے بعد کلام میں اور زیادہ ربودگی اور سنجیدگی آ گئی؛ نعت سے بھی شغف ہو گیا تھا۔ غزل ایسی اچھی کہتے ہیں کہ کسی معیار پر اسے جانچیے، آپ داد دینے پر مجبور ہو جائینگے۔ چونکہ وہ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے اور پراپیگنڈے کا فن نہیں جانتے تھے، اس لیے ان کی کما حقہٗ شہرت نہیں ہوئی۔ صرف زبان کی ان کے ہاں چنداں اہمیت نہیں تھی۔ اسی لیے خالص لکھنوی رنگ پسند نہیں تھا وہ شستہ اور متین کلام کے دلدادہ تھے اور تو

اور، اپنے استاد عزیز کی نوحہ خوانی بھی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ اسی لیے فانی بھی ان کے پسندیدہ شعرا میں نہیں تھے۔ اصغر سے متعلق انھیں شکایت تھی کہ ان کے کلام میں دلکشی نہیں، ثقیل ہے اور اس میں روانی ناپید ہے۔ اسی سے اندازہ کیجیے کہ ان کے اپنے کلام میں کیا ہوگا۔ وہ اپنی غزل سے متعلق کہتے ہیں:

خونِ دل رنگِ تغزل میں کیا ہے شامل

مٹ گیا ہوں، تو یہ اندازِ بیاں آیا ہے

جگرؔ اور حسرتؔ ان کے محبوب شاعر تھے۔ جگر سے ان کے ذاتی تعلقات بھی اتنے قریب کے تھے کہ مثالی کہے جاسکتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ جگر کا دوسرا مجموعۂ کلام "آتشِ گل" تسکین مرحوم ہی نے مرتب کیا تھا۔ وفات سے کوئی پانچ مہینے پہلے جگر نے ۲۶ مارچ ۱۹۶۰ء کو اپنے کلام کی طباعت و اشاعت اور اس کی آمدنی کی تقسیم سے متعلق ایک وقف 'جگر ٹرسٹ' کے نام سے قائم کیا تھا۔ انھوں نے اس کا واحد متولّی تسکین صاحب ہی کو مقرر کیا، اور انھیں اجازت دی تھی کہ اپنے بعد جسے چاہیں متولّی مقرر کر دیں۔ تسکین نے اپنی وفات سے پہلے غالباً کسی کو جانشین نامزد نہیں کیا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میں جب باہر چلا گیا، تو خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے جگر مرحوم کی زندگی میں ان سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا، جو نقوش (لاہور) میں چھپ چکا ہے۔ اس کی فرمایش بھی تسکین صاحب نے کی تھی۔ ہوا یہ کہ شمس الہدیٰ قیسی صاحب نے جو گونڈہ میں تحصیلدار تھے، جگر کی سوانحعمری لکھنے کی داغ بیل ڈال دی۔ انھوں نے جگر سے پوچھا کہ آپ کے حالات کے لیے کن احباب سے رجوع کروں۔ منجملہ اور احباب کے جگر نے میرا نام بھی بتایا۔ میں اس زمانے میں قاہرہ میں مقیم تھا۔ تسکین نے مجھ سے مضمون لکھوانے کا فرض اپنے ذمّے لیا۔ چنانچہ میں نے تعمیلِ ارشاد میں یہ مضمون لکھا تھا۔ جب میں برسلز (بلجیم) میں تھا، تو انھوں نے 'متاعِ تسکین'، کا پورا کلام خود

لکھ کر مجھے تحفتہً بھیجا تھا۔ یہ مجموعہ اس کے بہت بعد شائع ہوا۔

ابھی دو ڈھائی مہینے ہوئے، میں میرٹھ گیا۔ سیف صاحب کے ہاں پہنچا۔ انھوں نے حسب معمول ملازم سے کہا کہ تسکین صاحب کو اطلاع کر دو کہ مالک رام آئے ہیں جب تک وہ آئیں، سیف صاحب نے بتایا کہ مجھے اندیشہ ہے، انھیں گلے کا کینسر ہو گیا ہے لیکن یہ میری سنتے نہیں، کیا کیا جائے! اتنے میں تشریف لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آواز صاف نہیں ہے؛ کبھی کبھی درمیان میں لفظ سنائی نہیں دیتا، کمزور بھی بہت ہو رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ فرمایئے؛ طبیعت کیسی ہے؟ جواب دیا کہ حلق پر نزلہ گر رہا ہے، اسی نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے یا اسپتال میں اپنا مکمل معائنہ کیوں نہ کروا لیجیے؟ اس پر انھیں شبہہ ہوا۔ جھک کے کہنے لگے، نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ نزلے کا ایک مجرب نسخہ میرے پاس ہے، وہی استعمال کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اس پر مجھے جرأت نہ ہوئی کہ کچھ اور کہتا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہی مشورہ حکیم سیف صاحب مجھ سے پہلے دے چکے تھے۔ اسی لیے انھیں شبہہ ہوا کہ میں نے یہ انھیں کے کہنے پر کہا ہے۔

آخر وہی پیش آیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اطلاع ملی کہ جمعرات ۲۴ جون ۱۹۷۱ء صبح کے ۶ بجے آگرے میں انتقال ہو گیا۔ جب حالت بگڑنے لگی، تو انھیں علاج کے لیے سروجنی نائیڈو اسپتال، آگرہ میں داخل کیا گیا تھا۔ یہاں بہت تکلیف میں وقت گزارا۔ جب حالت مایوسی کی ہو گئی، تو اسپتال سے اٹھ کر اپنے چھوٹے بھائی فضل الرحیم صاحب افضل محلہ تاج گنج کے مکان پر آ گئے۔ یہیں وقت موعود آیا۔ مٹی بھی آگرے کی نصیب ہوئی۔ تاج محل کے قریب ہی مشرق کی طرف، شاہی زمانے کی بنی ہوئی، سید احمد بخاریؒ کی درگاہ ہے۔ اسی میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ

ہمارے دوست ڈاکٹر نور اللہ نوری نے ایک کے تعمیے سے عیسوی تاریخ کہی ہے:

ایک ملا یہ مصرعِ غم　　　خلد مکاں ہیں تسکیں قریشی

آ

(۱+۱۹۷۰=۱۹۷۱)

۱۹۱۸ء میں اپنے خاندان ہی میں شادی ہوئی تھی۔ لاولد فوت ہوئے۔

ان کا کلام چار مرتبہ چھپا:

سرمایۂ تسکین (اول): (بلند شہر ۱۹۲۶ء)

سرمایۂ تسکین (دوم): (سہارنپور ۱۹۳۷ء)

گلگونہ: (لکھنؤ ۱۹۵۲ء)

متاعِ تسکین: (لکھنؤ ۱۹۶۲ء)

انھوں نے مکاتیب جگر (دلی ۱۹۶۲ء) کے عنوان سے جگر کے وہ تمام خطوط بھی شائع کیے تھے، جو ان کے پاس محفوظ رہ گئے تھے۔ اس میں جگر کے ۷۰ خطوط ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں انھوں نے مولانا اسعد صاحب (ناظم مظاہر علوم، سہارنپور) کے ۲۸ خط صحائف اسعد کے نام سے، اور اپنے استاد عزیز لکھنوی کے ۱۶ مکتوبات عزیز کے عنوان سے تضمین کر دیے ہیں۔

ان کے پاس جگر کے خطوط کے علاوہ ان کی کچھ بیاضیں وغیرہ بھی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ سارا ذخیرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ کر دیا جائے، تاکہ آیندہ جگر پر تحقیقی کام کرنے والے طلبہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ کسی وجہ سے مسلم یونیورسٹی میں یہ انتظام نہ ہو سکا۔ اس پر انھوں نے یہ تمام چیزیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی کے حوالے کر دیں۔ یہاں یہ اشیا گوشۂ جگر، کے نام سے مرکزی کتابخانے میں رکھی گئی ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اب کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو، جو ان کے مجموعے 'متاعِ تسکین' سے لیا گیا ہے:

عشق میں عشق کا حاصل نہیں دیکھا جاتا
نہ دریا کبھی ساحل نہیں دیکھا جاتا
بے طلب بھی کبھی مل جاتی ہو منزل، تسکیں!
ہر کہیں جادۂ منزل نہیں دیکھا جاتا

کفر و دیں سب کی سیر کر آیا
کچھ نہ دل کے سوا نظر آیا
دل ہے بے آرزو نظر بے ذوق
تجھ کو جینا نہ عمر بھر آیا

جب کہیں تذکرۂ حسنِ دلآرام آیا
کوئی محفل ہو، ہر اک لب پہ ترا نام آیا
توبہ کے بعد ہی ساقی کا یہ پیغام آیا
میکدے سے جو گیا، پھر نہ کہیں کام آیا

عشق سے پہلے نہ سمجھے تھے، خوشی ہوتی ہے کیا
کیوں چمکتے ہیں ستارے، چاندنی ہوتی ہے کیا

کوئی خاموش ہے، کوئی نالہ بلب
اپنا اپنا جنوں، اپنی اپنی طلب
باہمہ جرأتِ شوق و جوشِ طلب
ہے مقامِ محبت، مقامِ ادب

جن کو جنوں نے کر دیا، عشق میں خانماں خراب
زیست بھی ان کی کامیاب، موت بھی ان کی کامیاب

تری نظر میں کائنات، میری نظر میں صرف تو
تیرا بھی حسن بےنظیر، میرا بھی عشق لاجواب

کہنے کو تو کہہ آئے غمِ دل، مگر اب تک
وہ نیم نظر یاد ہے، وہ چینِ جبیں یاد
صہبا، ہمہ سرمستی و ساقی، ہمہ آغوش!
کافر ہے، جسے آئیں جواب بھی دل و دیں یاد

اب کرم کی بھی دل کو تاب نہیں
کیجیے کس امید پر فریاد
ہائے، اس دل کی حسرتیں تسکیں!
جو محبت میں ہو گیا برباد

جبر میں اختیار ہے تو، مگر
جیسے کوئی قفس میں ہو آزاد
دل کی دنیا عجیب دنیا ہے
جتنی برباد، اتنی ہی آباد
بتکدہ، بتکدہ سہی تسکیں!
آ گئے اب تو، ہر چہ بادا باد

ترا خیال بھی ہے تیرے حسن سے معمور
تمام شوخی و مستی، تمام نکہت و نور

جنوں، کمالِ یقیں، انتہائے سوز و سُرور — جنوں نہ ہو تو محبت دل و نظر کا فتور
حیات راہِ محبت میں ساتھ دے نہ سکی — سفر تمام ہوا، اور ابھی ہے منزل دور
ہر ایک داغِ جگر، جنّتِ نظارہ سہی — تری نگاہ کی رسوائیاں نہیں منظور

تیری طلب کے سب ہیں مراحل — کشتی و دریا، طوفان و ساحل
تم دے گئے ہو، تنہائیٔ دل — تم کیا گئے ہو، خلوت نہ محفل

غمِ دل اور اتنا راحت انجام — جز اک اثر، جنونِ عشقِ ناکام
محبت بھی ہے، رسوائی کا ڈر بھی — ارے! نامِ محبت، کر نہ بدنام
یقیں، ذوقِ جنوں کی شرطِ اول — جنوں، خود آگہی کا دوسرا نام

ہر آرزو کا احساس ہے گم — کیا یاد آئے، جب آ گئے تم
کچھ چشمِ تر ہی کام آئی، ورنہ — رُودادِ دل، اور تابِ تکلّم
ننگِ طلب ہیں دونوں ہی، تسکیں! — تدبیرِ ساحل، فکرِ تلاطم

تسکیں! یہ کوئے دوست ہے، راہِ حرم نہیں
کچھ ہوش ہے، کہاں سے کہاں آ گئے ہو تم!

زندگی مرگِ ناتمام ہے آج — نہ تمنّا، نہ جستجو، نہ جنوں

ذرا حسن پیدا تو کر، زندگی میں — تری منتظر جلوہ گاہیں بہت ہیں
جبیں تیرے در پر جھکی تھی نہ جب تک — سمجھتے تھے ہم، جلوہ گاہیں بہت ہیں

وجہِ ستم، کچھ ہو، تو بتائیں! — ایک محبت، لاکھ خطائیں
دردِ محبت دل میں چھپایا — آنکھ کے آنسو کیسے چھپائیں
ننگِ زمانہ دیکھنے والے — ان کی نظر بھی دیکھتے جائیں

کفر نے بخشا ہے تسکیں! میرے ایماں کو فروغ — بتکدے میں بیٹھ کر رازِ حرم سمجھا ہوں میں

اگر ہو نہ آہوں سے آباد سینہ — خرد بے سلیقہ، جنوں بے قرینہ

وہی عظمتِ زندگی سے ہیں واقف کہ طوفاں سے گزرا ہے جن کا سفینہ

ہزاروں جام و ساغر ٹوٹتے ہیں بہت دشوار ہے میخانہ سازی
صداقت کیا، جو ہو محدود یہاں جنوں کیا، جب نہ ہو ہنگامہ سازی
ہزاروں بار جب ٹوٹی ہے توبہ تو آیا ہے شعورِ پاکبازی
محبت، حسن بن جاتی ہے، تسکیں! محبت میں اگر ہو بے نیازی

ان کی محفل میں، جہاں ہم کبھی آئے نہ گئے آج کیا کیا ہمیں الزام لگائے نہ گئے!

انجم و مہر و ماہ سے پہلے جلوہ تھا، جلوہ گاہ سے پہلے
کھیل سمجھے نہ کوئی شغلِ فغاں دم الٹتا ہے، آہ سے پہلے

تغافل کے تو پہلو اور بھی تھے ستم ہی کس لیے کم ہو گیا ہے!
نہ دن دیکھے، نہ صبح و شام دیکھے تجھے کیا چشم پُرنم ہو گیا ہے؟

اسیری سے فطرت بدلتی نہیں چھٹے، اور نشیمن بنانے لگے
سکوں، گمرہی ہے رہِ عشق میں قدم جب رکے، ڈگمگانے لگے

کس قدر ہم سے ناآشنا ہو گئے! تم محبت کے ہوتے ہی کیا ہو گئے!

دل جب آسودۂ امید کم ہوتا ہے غم کا احساس اگر ہو بھی، تو کم ہوتا ہے
ہم نے دیکھا ہے حسینوں کو بھی محرمِ سکوں ہم سمجھتے ہیں، محبت میں جو غم ہوتا ہے
روشِ عام نہیں، مسلکِ اربابِ جنوں بچ کے چلتے ہیں، جدھر نقشِ قدم ہوتا ہے
حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں جہاں میں تسکیںؔ! دل کے جانے کا مگر اور ہی غم ہوتا ہے

زندگی اپنی حقیقت سے تھی اب تک محروم تم ملے ہو، تو یقینِ دل و جاں آیا ہے

نگہ سادہ، اے معاذ اللہ! نگہ، التفات کیا ہوگی!

کمالِ محبت، جمال آفریں ہے اگر دل حسیں ہو، تو دنیا حسیں ہے
وہ اک سجدۂ بے جبیں، اللہ اللہ! کوئی آستاں جس کے قابل نہیں ہے

باایں نامرادی، باایں بدگمانی محبت سراپا، یقیں ہی یقیں ہے

مآلِ عشق پہ ہم صبر کر تو سکتے تھے مگر یہ دل، جو ابھی تک ترے خیال میں ہے
یہی ہو کفر، تو ایمان کس کو کہتے ہیں کہ سر ہے سجدے میں اور دل ترے خیال میں ہے

حضورِ حسن، اک افسانہ بن گیا اس کا کہی تھی بات جو آغازِ گفتگو کے لیے

ہزار رہزن اچھے ہیں، ایسے رہبر سے جو راہ چھوڑ دے، منزل کی جستجو کے لیے
گلوں سے کھیلنے والے! ہٹا نہ کانٹوں کو جہانِ حسن کی ہر شے ہے آرزو کے لیے

یہ فیصلۂ آخرِ اربابِ یقیں ہے جو کچھ ہے محبت ہے؛ نہ دنیا ہے نہ دیں ہے
ملتی نہیں بے جان دیے منزلِ جاناں مشکل تو ہے یہ راہ، مگر دور نہیں ہے

ٹیس تھی جس میں اک مدت سے، آج وہ چھالا پھوٹ گیا
ٹوٹ گئیں جب ساری امیدیں، آخر دل بھی ٹوٹ گیا
تیرے لیے ملتے تھے سب سے، اب یہ تعلق ٹوٹ گیا
ایک ترا کیا دامن چھوٹا، سارا زمانہ چھوٹ گیا
ترکِ محبت کی بھی کوشش، راس نہ آئی، اے تسکیں!
پھانس بھی دل کی دل سے نہ نکلی، دل کا دل بھی ٹوٹ گیا

تسکیں کا مرنا جینا کیا، افسوس ہے اتنا البتہ
غم جس کو رہا دنیا بھر کا، دنیا کو اسی کا غم نہ ہوا

ذرا بتاؤ، کبھی تم کو یہ خیال ہوا نگاہ کس پہ پڑی، کون پائمال ہوا
طرح طرح سے بھلایا، مگر یہ حال ہوا کہ ہر خیال سے، پیدا ترا خیال ہوا
ہزار دل اور بھی آئے تھے بے بلائے ہوئے مجھی سے کیوں یہ بھری بزم میں سوال ہوا

کفر و ایماں، جادۂ الفت کی ہیں، دو منزلیں
ایک ہے کعبے سے پہلے، ایک بتخانے کے بعد

احساسِ نامرادیِ الفت نہ پوچھیے — کیا دل کے ٹوٹنے میں ہے لذت نہ پوچھیے
کچھ اور پوچھیے یہ حقیقت نہ پوچھیے — کیوں آپ سے ہے مجھ کو محبت نہ پوچھیے

سجدوں سے طے مقامِ محبت نہ ہو سکا — کیا کیا ہوئی ہے سر کو ندامت نہ پوچھیے
جب یادِ یار سے بھی نہ تسکین ہو سکے — ہوتی ہے کیا وہ کاہشِ فرقت، نہ پوچھیے
تھی رازِ ابتدائے محبت، بس اک نگاہ! — ایسی نگاہ، جس کی حقیقت نہ پوچھیے

پیشِ نظر ہو جب وہ جمالِ نظر فروز — پھر اضطرابِ شوق کی حالت نہ پوچھیے
کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں، جز خیالِ یار — لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھیے
دونوں ہی بھول جانے کے قابل ہیں عشق میں — افسانۂ مجاز و حقیقت نہ پوچھیے

کعبے میں، بتکدے میں، حریمِ جمال میں — دل کی کہاں کہاں ہے ضرورت، نہ پوچھیے
تسکین! یہ جان و دل تھے ہمیں بھی کبھی عزیز — اب زندگی ہے کس کی بدولت، نہ پوچھیے

عذرِ ستم سے دل نہ دکھاؤ، پاسِ محبت رہنے دو — کون کہیگا تم کو ظالم! اور کہے، تو کہنے دو
کوئی کنارا، کوئی سہارا، کیا جانے کب مل جائے — یہ طوفاں کی ماری کشتی، بہتی ہے جب تک بہنے دو
حرف و حکایت، شکوہ شکایت دل میں لیے ہیں ہم کیا کیا — اپنے کرم کا ذکر کہاں تک، کچھ تو ہمیں بھی کہنے دو
مٹتے مٹتے داغ مٹینگے دردِ ہوس کے، اے تسکیں! — بنتے بنتے دل بنتا ہے، خوب اسے غم سہنے دو

کس سے پوچھیں، ہم نے کہاں، وہ چہرۂ روشن دیکھا ہے
محفل محفل ڈھونڈ چکے ہیں، گلشن گلشن دیکھا ہے

ہم کو دیکھو، منزل منزل لٹ کے ہوئے ہیں خاک نشین
ہم سے پوچھو کیسا کیسا ہم نے رہزن دیکھا ہے

کس کو دیکھیں، کس کو نہ دیکھیں: پھول بھی ہیں، کلیاں بھی، مگر
جس سے لگائی آنکھ، اسی کو، دل کا دشمن دیکھا ہے

شاغل قادری، سیّد محمد شاغل قادری

ایک مذہبی اور متدیّن گھرانے کے فرد، ۱۲ جنوری ۱۹۲۴ء کو بمنڈیہہ (ضلع گیا، بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ فتح الجبّار صوفی منش اور ابدال میں سے تھے۔ چونکہ وہ بیشتر عبادت میں مشغول اور عزلت گزیں رہتے تھے، اس لیے شاغل کی تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی ذاکر قادری کی نگرانی میں ہوئی۔

ان کے چچا اسد القادری نے انھیں بچپن ہی میں مختلف شعرا کے بہت شعر یاد کرا دیے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ابھی اسکول کی منزل طے نہیں ہوئی تھی کہ شعر گوئی کا چسکا لگ گیا۔ شروع میں تخلص صادق کیا۔ طبیعت چونچال تھی، اس لیے سنجیدہ کلام کے ساتھ مزاحیہ رنگ میں بھی کہنے لگے، ایسے کلام میں تخلّص 'ذبیا' رکھا۔ جب جھریا راج ہائی اسکول میں پہنچے، تو اب تخلص بدل کر پہلے 'دانش' اور پھر 'شاہد' رکھ لیا۔ ملازمت کے ابتدائی دور یعنی ملٹری انجینئرنگ سروس کے قیام کے زمانے تک 'چنے شرر' تخلص سے بھی لکھتے رہے۔ لیکن جب اگست ۱۹۴۷ء میں مستقل طور پر ریلوے کی ملازمت مل گئی اور بھاگلپور اسٹیشن پر تعیناتی ہوئی، تو اس کے بعد سے اپنے نام کے دو اجزا شاغل اور

قادری پر اکتفا کی، ان میں بھی ترجیح قادری کو رہی۔ مزاحیہ کلام میں البتہ آج تک پہلا تخلّص کا ذب ہی چلا آرہا تھا۔ اب اس کی جگہ "تلخ زمانی" نے لے لی۔

وہ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک بھاگلپور میں رہے۔ اس کے بعد تبادلہ ہوا، اور صاحب گنج پہنچے۔ یہاں ۱۹۶۱ء تک رہے اور اسی سال ہاٹ پورینی میں ریلوے اسٹیشن ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی رہے، رفاہِ عام کے کام، شعر و سخن کی خدمت، اور مشاعرے منعقد کرنے سے انھیں فرصت نہیں ملتی تھی۔ شروع میں پروفیسر اختر صدر شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی سے اصلاح لی۔ جب دورانِ ملازمت میں صاحب گنج پہنچے، تو حضرت سروش عظیم آبادی سے مشورہ کرنے لگے۔ انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام "متاعِ شوق" کے عنوان سے قیامِ بھاگلپور کے زمانے ہی میں مرتّب کر لیا تھا، اگرچہ اس کی اشاعت بہت بعد کو ہوئی (گیا: ۱۹۶۵ء)۔ انھیں غزل اور نظم، بلکہ ہر ایک صنفِ سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ مذہب اور سیاست ان کے دلپسند موضوع تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں غزل، نظم، قطعہ، نعت، سلام، ہجو سب ہی کچھ ہے۔ آخر میں تلخیات کے عنوان سے طنزیہ اور مزاحیہ کلام بھی ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی خاصی مہارت تھی؛ چنانچہ اس مجموعے میں چند قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں۔

یہ مجموعہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے نام بدیں الفاظ معنون کیا ہے:

> امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نام، جن کی نثر نے میرے فکر و فن کو جِلا دی۔

اس سے ان کی افتادِ طبع کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں: اپنے بزرگوں کی طرح انھیں بھی ملکی سیاست سے گہری دلچسپی تھی؛ چنانچہ جمعیۃ العلماءِ ہند سے باضابطہ وابستہ تھے۔ وہ جمعیۃ کے جلسوں کا بڑے بہت متاثر ہوئے۔ نظم کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے۔ ان کے نثری مضامین مختلف رسالوں میں منتشر پڑے ہیں اور آج تک مدوّن نہیں ہوئے۔ ان سے یقیناً ایک اچھی

ضخیم جلد تیار ہو جائے۔

شب جمعہ ۱۶ جولائی ۱۹۷۱ء ریلوے اسٹیشن پنجوارہ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ ان کی بیگم دائم المرض تھیں۔ اپنی اولاد نہیں تھی۔ ایک بچّے کو گود لے لیا تھا، وہی ان کا وارث ہوگا۔

چند شعر ان کے مجموعۂ کلام "متاعِ شوق" سے ماخوذ درج ذیل ہیں:

دھندلا دھندلا سا دل کا عالم ہے
آرزو کا چراغ مدّھم ہے

ہر طرف ہے بلا کی تاریکی
دور منزل ہے، راہ پُرخم ہے

نئے عنوان کی ہے مسیحائی
جو دوا دردِ دل کی ہے، سم ہے

موت ماحول پر ہوئی طاری
سرنگوں زندگی کا پرچم ہے

چشمِ حق بیں نہیں، مگر مایوس
روشنی گر نہیں، تو کیا غم ہے

دل میں شمعِ یقیں تو ہے روشن
ہوا اگر تیرگی کا عالم ہے

ہلکے ہلکے نسیم کے جھونکے
کہہ رہے ہیں کہ رات اب کم ہے

پھر چمن میں بہار آئیگی
کھلنے والا سحر کا پرچم ہے

دورِ فتن

رنگین فضائیں ہیں، بہاروں پہ چمن ہے
شاداب گل و لالہ و نسرین و سمن ہے

ہر شاخِ گل تر پہ عنادل ہیں غزلخوان
گلگشت میں مصروف کوئی غنچہ دہن ہے

خوش فہمی اربابِ چمن خوب ہے، لیکن
شاعر کی نظر میں یہ فقط خوابِ کہن ہے

دیکھا تھا خزاں میں جو بہاروں کا کبھی خواب
چھایا ہوا ذہنوں پہ اسی خواب کا ظن ہے

مرجھائے ہوئے پھول کو شاداب نہ کہیے
روتا ہے جو بلبل، تو نہ کہیے کہ مگن ہے

کب تک یہ ہیں اے دوست! حقیقت سے گریزاں
خطرے میں نشیمن ہے، مصیبت میں چمن ہے

بلبل کے لیے چین کی صورت نہیں اب بھی
صیّاد سے ملتا ہوا مالی کا چلن ہے

جس دل میں محبت نہیں ہر اہلِ وطن کی — وہ دل نہیں، اے دوست! ناسورِ کہن ہے
ہم جور و ستم پر تو نہ خاموش رہینگے — مانا کہ کٹھن مرحلۂ دار و رسن ہے
ہر غنچۂ خوابیدہ کو بیدار کرینگے — ہشیار رہو، قادری یہ دَورِ فتن ہے

ان کی پرسش پہ جو دیکھا متبسم مجھ کو — رازداں کو مرے انداز پہ رونا آیا

ہائے وہ تیرِ نیمکش، شاغل! — زخم تازہ ہے آج تک دل کا

شبِ فراق گزاری عجب تصور میں — کہ جیسے پاس مرے آپ آئے جاتے ہیں

جن میں ہنسنے کی سرِ دار جسارت آئی — ان کے قدموں میں زمانے کی سیادت آئی
رنگ لایا ہے مرا خونِ وفا گلشن میں — گل تو گل، خار میں بھی بوئے محبت آئی

ہوا اسے سود و زیاں کی فکر کیوں — جس نے تیرے عشق کا سودا کیا

رعنائیِ حیات کا باعث کبھی نہیں — وہ دردِ عشق، جس کی خلش دائمی نہیں

راہِ وفا میں کوئی دیتا ہے ساتھ کس کا! — غم کیوں منائیں ناحق ہم اپنی بیکسی پر

دل میں تصویرِ بتاں، لب پہ سلام اور درود — زیست مجموعۂ اضداد ہوئی جاتی ہے

ہم تو عشق کے بندے ٹھہرے — کوئی ناحق کیوں دشمن ہے
عشق کی منزل سہل نہیں ہے — ہر اک گام پہ دار و رسن ہے

ہر دل میں غم و درد ہے بیتابی ہے
عنقا چمنِ زیست میں شادابی ہے
ساقی کو بھی ہے تشنہ لبی کا رونا
صہبائے مسرت کی وہ نایابی ہے

تھا عہدِ خزاں میں جو چلن، اب تک ہے
بلبل کے لیے دَورِ محن اب تک ہے
کہنے کو تو آیا ہے گلوں کا موسم
صیدِ غم و آلامِ چمن اب تک ہے

ذلت کے خرابات میں پینے والو!
اکرام پہ اغیار کے جینے والو!
غرقاب منجدھار میں ہو جاؤ گے ہیں!
ہشیار، خبردار، سفینے والو!

افسردہ گل و لالہ کھلا دیتے ہیں
تاریک فضاؤں کو ضیا دیتے ہیں
یہ آخرِ شب اشکِ ندامت کے گہر
آئینۂ خاطر کو جِلا دیتے ہیں

خیر بہوروی، ابوالخیر

اس صدی کے آغاز (غالباً ۱۹۰۱ء) میں ضلع بلیا (یو پی) کے ایک گاؤں بہورہ میں پیدا ہوئے پرانے طرز کی فارسی، عربی کی تعلیم پائی تھی، اور اردو سے محبت تھی۔ اسی لیے مرحوم مولوی عبدالحق نے جب انجمن ترقی اردو کا دفتر ۱۹۳۶ء میں اورنگ آباد سے دلّی منتقل کیا، تو انھیں صدر دفتر میں بلا لیا۔ وہ تقسیم ملک تک انجمن کے نمائندۂ خصوصی کی حیثیت سے ملک بھر کا دورہ کرتے اور اس کی تنظیم کا کام کرتے رہے، کچھ زمانہ غالباً نائب معتمد بھی رہے۔ جب تقسیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں انجمن کا دفتر از سر نو علی گڈھ میں قائم ہوا اور قاضی عبدالغفار (ف جنوری ۱۹۵۶ء) اس کے سکریٹری مقرر ہوئے، تو خیر صاحب ان کے دست راست ثابت ہوئے۔ انھوں نے انجمن کے از سر نو قیام و استحکام میں ان کی بہت مدد کی۔ قاضی عبدالغفار کی رحلت کے بعد نئے ماحول میں وہ زیادہ دن نہیں رہے؛ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں مستعفی ہو گئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں 'غالب انسائیکلوپیڈیا' مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا؛ اور اسی سلسلے میں غالب کی تصویریں ایک جلد میں 'مرقع غالب' کے عنوان سے شائع کی تھیں

(لکھنؤ، ۱۹۵۷ء)۔ اس کے لیے غالباً یو پی حکومت نے کچھ مالی امداد کی تھی۔ اس کتاب کا ہندی اڈیشن بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن چونکہ پورا منصوبہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے مرقع غالب کے بعد وہ کوئی اور کام نہ کر سکے۔ انھوں نے لکھنؤ میں آل انڈیا میر اکاڈمی قائم کرنے میں جناب مقبول احمد صاحب لاری کا ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ لاری صاحب ہی کے ساتھ رہتے تھے اور یہ ان سے ہر طرح کا سلوک کرتے رہتے تھے۔

نجبر صاحب کو بہت دن سے یہ عارضہ تھا کہ اچانک ان کے منہ سے خون آنے لگتا۔ بلا مبالغہ بعض اوقات دو دو چلمچی خون خارج ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد ان کے جسم میں تازہ خون چڑھایا جاتا تھا۔ اسی سے روز بروز نقاہت بڑھتی گئی اور حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ مسلسل بیماری سے گھبرا کر وہ گزشتہ مئی کے اوایل میں اپنے وطن بہورہ چلے گئے تاکہ آخری ایام اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھ گزار سکیں۔

بروز ہفتہ ۱۷ جولائی ۱۹۷۶ء بوقت شب بہورہ ہی میں انتقال کیا۔ خدا مغفرت کرے۔

راز بلگرامی سیّد شریف الحسن

۱۹۰۱ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد ریاض الحسن بلگرامی کی کچھ زمینداری تھی۔ راز کی عربی فارسی کی کچھ تعلیم گھر پر ہوئی، اسکول میں آٹھویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن یہ کمی انھوں نے ذاتی مطالعے سے پوری کی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا، فارسی اور عربی دونوں میں بہت اچھی استعداد تھی، اور شعر میں خاص طور پر حافظہ اتنا اچھا تھا کہ حوالے میں سند دینے میں کبھی دقّت نہیں ہوتی تھی۔

فنِ عروض شاداں بلگرامی (ف جنوری ۱۹۴۸ء) سے حاصل کیا، لیکن شعر پر اصلاح سید وجاہت حسین رمز تلہری سے لی۔ اور طویل مشق سے خود اُستادی کا درجہ حاصل کیا۔ بلگرام کے بیسیوں نوجوان ان سے مشورہ کرتے تھے۔ شعر کے علاوہ نثر سے بھی مزاولت تھی۔ سید مقبول حسین وصل بلگرامی کے ماہنامے 'مرقع' میں برابر کے شریک تھے اور اس میں کبھی کبھی نثری مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس زمانے کا ایک مشہور تنقیدی مضمون شاد عظیم آبادی اور اکبر الہ آبادی کے کلام کے موازنے سے متعلق تھا جس پر کچھ بحث بعد کو نگار (لکھنؤ) میں ہوئی تھی۔

مطبوعہ تصانیف یہ ہیں: حسین بیتی؛ مآثر حسین؛ پیغامات

آخری ایام میں تاریخ بلگرام مرتب کرنے کا ارادہ تھا، لیکن اس کے لیے جس ذہنی اور جسمانی سکون کی ضرورت تھی، وہ میسر نہ ہوسکا اور کام نامکمل رہ گیا۔

کلام کبھی محفوظ نہیں رکھا، بلکہ جس نے طلب کیا، اس کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ نظم، غزل، نعت، قصیدہ سب اصناف میں کہا، لیکن تلاش کرنے پر شاید ایک معقول مجلد کے لیے بھی اب نہ مل سکے۔

سادات بلگرام کو اہل بیت سے بہت محبت رہی ہے۔ راز مرحوم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ چنانچہ مرثیہ خوانی سے بہت شغف تھا، بلکہ فارسی "وہ مجلس" کے پڑھنے میں تو ان کی خاص شہرت تھی۔

تپ دق کے مرض سے ۱۰ اگست ۱۹۷۱ء کو بلگرام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں:

بتوں کی زباں پر کلام محبت — بنا کعبۂ حق، مقام محبت
علی کے لیے خود نبی کہہ رہے ہیں — محبت کا پہلا امام محبت

کھل گئی بات، رخ یار کے ما تھے آئی — کچھ نہ کچھ پردۂ اسرار کے ما تھے آئی
ڈر رہا تھا، مرا کعبہ نہ کہیں طور بنے — خیریت ہو گئی، دیوار کے ما تھے آئی

قدرت کی نظر کا کیا کہنا سو بار اٹھی، پھر مڑ بھی گئی
جو گرد پڑی تھی عالم پر لمحوں میں ہوا سے اڑ بھی گئی
دنیا نے بالآخر دیکھ لیا مولود حرم کے صدقے میں
دیوار حرم قسمت کی دھنی خود ٹوٹ گئی، خود جڑ بھی گئی

طالب کشمیری، نند لال کول

پنڈت نند لال کول طالب جن کا مختصر علالت کے بعد اچانک ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء کو سرینگر میں انتقال ہو گیا، کشمیر کے خاصے صاحبِ وجاہت طبقے کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام پنڈت ٹھاکر پرشاد کول تھا، جو ریاست کے بڑے زمینداروں میں گنے جاتے تھے۔ طالب کے دادا پنڈت دیوہ کول حکومتِ کشمیر میں دفترِ دیوانی کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ وہ فارسی کے منتہی اور شاعر بھی تھے، دیوہ تخلص تھا۔ عربی میں بھی خاصی دستگاہ تھی اور سنسکرت اور ہندی سے بھی واقف تھے، بلکہ ہندی میں تو ان کا ایک آدھ شعر بھی ملتا ہے۔ افسوس ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ باقیاتِ صالحات میں سے فارسی کی چند غزلیں رہ گئی ہیں۔ شعر و سخن کے علاوہ خوشنویسی اور مصوری اور نقاشی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اہلِ نظر سے خراجِ تحسین لے چکی ہیں، بیشتر تصویریں ہندو دیومالا اور مذہب سے متعلق ہیں۔ ان کا ۱۸۹۲ء میں سرینگر میں انتقال ہوا۔ دیوہ کے والد یعنی طالب صاحب کے جدِّ امجد رائے راگھو ناتھ کول بہت بڑے رئیس اور زمیندار اور ریاست میں وزارتِ اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے تھے۔

پنڈت نند لال ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔ خاندان کا ماحول علمی تھا؛ اس لیے ان کی تعلیم پر پوری توجہ دی گئی؛ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں بی اے، دو سال بعد ۱۹۲۴ء میں ایم اے (فارسی)، پھر ۱۹۲۵ء میں منشی فاضل (فارسی) اور اسی کے ساتھ ایم، او، ایل اور ادیب فاضل (اردو) کے امتحان پنجاب یونیورسٹی سے بامتیاز پاس کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کرلی اور سری پرتاب کالج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک رہا۔ اس سال یہاں سے سبکدوش ہو کر امر سنگھ کالج میں پروفیسر اور صدر شعبۂ فارسی و اردو ہو کر چلے گئے، یہاں ۱۹۵۴ء تک رہے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء تک کے تین برس جموں و کشمیر یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں جموں و کشمیر کلچرل اکاڈیمی سے بھی وابستہ ہو گئے

جس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس میں شعر گوئی کا شوق لابدّ تھا، لہٰذا یہ بھی کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے کچھ دن دلبر تخلص کرتے رہے، پھر اسے بدل کر طالب کرلیا۔ شروع میں منشی رام سہائے تمنّا لکھنوی (ف ۱۹۴۴ء) سے اصلاح لی، جو منشی دوارکا پرشاد افق (ف ۱۹۱۳ء) کے بھائی اور منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی (ف ۱۹۷۰ء) کے چچا تھے۔ تمنّا سے اصلاح کا سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔ اس سال انھوں نے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) کا تلمذ اختیار کیا۔ کیفی مرحوم نے اپنی وفات سے مدتوں پہلے انھیں فارغ اصلاح قرار دے دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سیماب اکبر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) سے بھی شاگردی کا تعلق رہا؛ یعنی وہ کیفی اور سیماب دونوں سے بیک وقت استفادہ کرتے رہے۔ انھوں نے کیفی مرحوم سے تلمذ کا ایک شعر میں ذکر بھی کیا ہے:

حضرت کیفی کی شاگردی پہ نازاں کیوں نہ ہوں! میں ہوا طالب، تو بخشا، فیضِ روحانی مجھے

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے: (۱) رشحات التخییل یعنی کلام طالب (بدایوں ۱۹۲۵ء) اور (۲) مرقع افکار (بدایوں ۱۹۵۲ء) اس کے علاوہ (۳) ترانۂ طالب کے عنوان سے ایک طویل مسدس بھی شائع ہو چکا ہے۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے اردو میں پرتھوی راج چوہان کی سوانحعمری لکھی تھی، طالب نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ کشمیر میں فارسی کے ایک شاعر ہوئے ہیں، پنڈت راجہ کول عرض بیگی، وہ دیری تخلص کرتے تھے، بہت پختہ کلام ہے۔ دیوان شائع نہیں ہوا تھا۔ طالب صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ ایک کتاب "ادب ایران میں کشمیریوں کا حصہ" کے عنوان پر شائع کی تھی۔

پنڈت برج کشن کول بیخبر اور پنڈت جگموہن رینہ شوق نے 'بہار گلشن کشمیر' کے عنوان سے کشمیری پنڈت شعرا کا ایک تذکرہ دو جلدوں میں شائع کیا تھا (الہ آباد ۱۹۳۱ء-۱۹۳۲ء) طالب صاحب نے اس کے لیے شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی میں مرتبین کا بہت ہاتھ بٹایا تھا، جس کا انھوں نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے۔

طالب صاحب نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کا تجزیہ کر کے سرمایۂ کلام غالب کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین ماہی رسالے "نوائے ادب" (بمبئی) میں شائع کیا تھا۔ اسی کو مرتب کر کے کتابی شکل میں 'جوہر آیئنہ' کے نام سے چھپوایا۔ انھی مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ منتشر حالت میں پڑا ہے۔

انھوں نے آٹھویں صدی کی مشہور کشمیری شاعرہ للہ عارفہ کے کلام کا اردو اور فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ للہ کا کلام شیوی فلسفے پر مبنی ہے۔ طالب کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ موضوع کی دقت کے باوجود اس میں کہیں اشکال پیدا نہیں ہوا۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ رہ گئی۔

آخری ایام میں وہ "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" مرتب کر رہے تھے۔ یہ غالباً نامکمل رہ گئی۔ اچھا ہو کہ جتنا حصہ بھی لکھا جا چکا ہے، اسے شائع کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف ان کی محنت ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیگی، بلکہ آیندہ کام کرنے والوں کے لیے بنیاد

بھی ثابت ہو گی۔ وہ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی کہتے تھے جیسا کہ "بہار گلشن کشمیر" کے انتخاب سے ظاہر ہے۔ "مرقع اذکار" میں بھی کچھ فارسی کلام موجود ہے۔ خدا معلوم سارے فارسی کلام کی مقدار کتنی ہو، بہر حال یہ بھی غیر مطبوعہ رہ گیا۔ بہت سے مضمون مختلف رسائل و جرائد میں منتشر پڑے ہیں۔

انھیں علمی خدمات کے صلہ میں صدر جمہوریہ ہند نے امسال انھیں فارسی کا انعام (تین ہزار روپیہ سالانہ) عطا فرمایا تھا۔ وہ ۴ اکتوبر اس کی سند لینے کو دلی آنے والے تھے کہ چار پانچ دن کی مختصر علالت کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۷۱ء صبح ساڑھے سات بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے راہی ملک بقا ہو گئے۔ ان کی آخری کتاب جوہر آئینہ ابھی مطبع سے نہیں آئی تھی، یہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان کی موت سے ایک صلح کل اور شریف دوست، ہمدرد اور شفیق استاد، اردو کا ایک خاموش خادم ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

ہر کوئی محوِ تماشائے جمالِ یار ہے — ناچتی پھرتی صبا ہے، اور گاتی ہے بہار
غنچۂ سربستہ کہنے کو ہے اپنا حالِ دل — راز کلیوں کی چٹک سے کہہ سناتی ہے بہار

جس کو رفیق سمجھے تھے، نشتر سے کم نہیں — پہلو میں ایک خار ہے میرے بجائے دل
بچپن کا اک رفیق تھا اب وہ بھی چھٹ گیا — دل میرا آشنا ہے، نہ میں آشنائے دل

زخمِ جگر کی تشنگی اے ہمنشیں! نہ پوچھ — ہر شورِ نالہ، شورِ نمکداں سے کم نہیں
ہے اضطرابِ شوق، نقابِ رخِ امید — تارِ نگاہ، پردۂ مژگاں سے کم نہیں

لطفِ جفائے یار کا نقشہ نہ کھنچ سکا — کس کام کی ہماری یہ طبعِ لطیف ہے
دیکھا جو وقتِ نزع، کہا: دے رہا ہے دم — طالب بہانہ ساز بھی ہے اور ظریف ہے

ہو میرے رنج و راحت کا نہ یارب! راز داں کوئی
نہ سننے پائے محشر میں بھی میری داستاں کوئی

عناصر کے قفس کی تیلیاں، اک روز ٹوٹیں گی
ابھی سے ڈھونڈ لے ملکِ عدم میں تو مکاں کوئی

بند رکھتا ہو زبانِ التجا، شوقِ سکوت
اپنی پُر حسرت نگاہیں چشمِ حیراں ہو گئیں

اب وہ سودائے محبت سر سے ہی جاتا رہا
ہمتیں رنج والم سے پائمالِ ہو گئیں

رباعی

دنیا تو وبالِ جاں ہے پیری کے لیے
ہے خواہشِ پرواز اسیری کے لیے

طالبؔ! پیری میں کب کوئی ساتھ چلے
ہاں ایک عصا ہے دستگیری کے لیے

عارف عباسی بلیاوی۔ قاضی محمد عثمان عباسی

ان کا شجرۂ نسب حبرِ امت حضرت عبداللہ عباس سے ملتا ہے۔ یہ خاندان پہلے چریاکوٹ (ضلع اعظم گڑھ) میں مقیم تھا۔ ضلع بلیا میں بیلتھرا روڈ ریلوے اسٹیشن سے کوئی چار میل دور ایک گاؤں بسوہاری ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ چریاکوٹ سے نقل مکان کرکے بسوہاری میں آبسے۔ یہاں حکومتِ وقت نے ان کی مناسب قدر و منزلت کی اور سکندر پور غربی کی قضاۃ ان کے سپرد کردی۔

عارف کے والد قاضی محمد سلیمان عباسی صاحب علم بزرگ تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی کی تحصیل دیوبند اور دلی کے مدارس میں کی تھی، لیکن اس کی تکمیل نہیں کرسکے تھے۔ انھوں نے ساری عمر کہیں ملازمت نہیں کی، اپنی گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال میں مصروف رہے اور اسی اکلِ حلال پر قانع تھے۔

عارف صاحب یکم مئی ۱۹۱۲ء کو بسوہاری ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر بمشکل سات آٹھ برس کی ہوگی جب ان کے والد قاضی محمد سلیمان اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی حسبِ دلخواہ نہ ہوسکی۔ انھوں نے امیر الدولہ اسلامیہ اسکول

لکھنؤ سے دسویں درجے کی سند لی اور اس کے بعد کرسچین کالج لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔
انٹر تک یہاں تعلیم پائی اور اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کی ٹھانی، لیکن
گھر کے ناسازگار حالات نے تکمیل کی فرصت نہ دی، آخری سال میں یہ سلسلہ ترک کر دینا
پڑا۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔

بسر اوقات کے لیے اب انھوں نے کالون تعلقدار کالج لکھنؤ میں مدرسی کر لی۔ یہاں
والیان ریاست اور تعلقداروں کے نونہال تعلیم پاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی
کے ساتھ اس کالج کے حالات بھی دگرگوں ہو گئے، تو عارف صاحب یہاں کی ملازمت
سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ریاست نانپارہ اور محمدی تعلقہ (ضلع کھیری) میں
صاحبزادگان کے اتالیق کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۱ء تک رہا۔ اس سال
انھوں نے آخری مرتبہ غیروں کی غلامی سے گلو خلاصی پائی۔

اس کے بعد انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی۔ بقیہ زندگی اپنی آبائی کاشتکاری کی نگرانی
میں لگے رہے۔ اس کے ساتھ کچھ تجارت کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔ انھوں نے بیلتھرا روڈ
(ریلوے اسٹیشن) میں سمینٹ کی دکان کر لی، جس سے بفضلہ اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ عزت
آبرو کے ساتھ گھر کا اجلا خرچ چل جاتا تھا۔

صحت بالعموم اچھی رہی، جو سادہ اور آزاد زندگی کا خاصہ ہے، لیکن دو برس ہوئے، بیوی
کی موت (۱۵ اگست ۱۹۶۹ء) نے اس پر بہت برا اثر ڈالا۔ ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء کو دل پر پہلا حملہ
ہوا۔ علاج معالجے میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن بے سود۔ اپنے عزیز دوست حکیم سیف الدین احمد
کے پاس میرٹھ شہر گئے ہوئے تھے کہ وہاں دوسرا حملہ ہوا۔ اسی میں ۲۶ ستمبر ۱۹۷۱ء کو صبح
ساڑھے پانچ بجے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ وہیں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم
صاحب موصوف کے خاندانی قبرستان شاہ سلطان میں آخری خوابگاہ نصیب ہوئی۔
یوں معلوم ہوتا ہے، گویا میرٹھ کی مٹی ہی نے انھیں وہاں کھینچ بلایا تھا۔

اپنے پیچھے اولادِ جسمانی میں پانچ بیٹے اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے۔ سب سے بڑے سعید الظفر الہ آباد یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ انھیں بھی علم و ادب سے شغف ہے۔ اور سعید عارفی کے قلمی نام سے لکھتے ہیں۔

عارف نے شعر گوئی اگرچہ زمانۂ طالبعلمی ہی میں شروع کر دی تھی، لیکن اس میں باقاعدگی ۱۹۴۱ء میں آئی۔ ابتدا میں آزاد فتحپوری اور حکیم سید باقر حسین شاعر لکھنوی سے (ف ۱۹۶۲ء) مشورہ رہا۔ بعد کو جگر مرادآبادی سے مستقلاً تلمذ اختیار کر لیا۔ حبیب احمد صدیقی نے بھی ان کی ذہنی اور فکری تربیت میں خاصی دلچسپی لی تھی۔ وہ خوش فکر اور زود گو اور پُرگو شاعر تھے، مگر افسوس کہ کلام کی تدوین سے متعلق بہت بے پروا رہے۔ چنانچہ کوئی مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ ان کے بڑے صاحبزادے سعید عارفی اسے مختلف رسائل و جرائد سے فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔

دولت کونین ہے، گر غم ملے — غم بھی وہ، جو ہر نفس پیہم ملے

مجھ کو ہر غم سے ہو گئی ہے نجات — تیرے غم کے یہ فیض، یہ برکات

وہ تو کہیے، ترے غم نے بڑا کام کیا — ورنہ مشکل تھا غمِ زیست گوارا کرنا

حسن کی فطرت، مکمل احتیاط — عاشقی، بیگانۂ سود و زیاں

نظر آتی ہے جس کی روشنی میں اک نئی منزل — خدا رکھے، ترا نقشِ قدم ایسا بھی ہوتا ہے

لالہ و گل کہیں خورشید و قمر ہوتا ہے — حسن ہر رنگ میں فردوسِ نظر ہوتا ہے

میری اس نیند پہ بیداریِ کونین نثار — آنکھ لگتے ہی ترے پاؤں پہ سر ہوتا ہے

اب مٹی جاتی ہے یہ لذتِ ناکامی بھی — کیا قیامت ہے کہ آہوں میں اثر ہوتا ہے

ایک وہ بھی طلب و شوق کی منزل ہے جہاں — حسن خود ساتھ مرے گرمِ سفر ہوتا ہے

اللہ اللہ، یہ مرے حسنِ تصور کا فروغ — دل میں اک شمع سی روشن ہے تری یاد کے ساتھ

وہ روئے زیبا، فردوسِ رنگیں — وہ قدِ رعنا، تکمیلِ محشر

حسنِ تبسم، نازِ گلستاں — موجِ نفس میں تسنیم و کوثر
ہر جنبشِ لب، اعجازِ فطرت — ہر لغزشِ پا، آشوبِ محشر

عمل بیگانۂ حسنِ یقیں ہے — بنائے زندگی ہو خاک محکم

ہے یقیں کے دم سے روشن کائنات — اے اسیرِ حلقۂ وہم و گماں!

عکسِ خرد سے دنیا اندھیری — نورِ جنوں سے عالم منوّر

جہاں تک جس کو احساسِ نظر ہے — وہیں تک حسن میں رعنائیاں ہیں

محبت میں، محبت کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے — کہ دل روتا ہے اور ہنستے ہیں ہم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں کبھی چشمِ کرم بھی بار ہوتی ہے — گلوئے اشکِ شبنم کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے
زبانِ عشق بن جاتی ہے اکثر بے زبانی بھی — نگاہوں سے برس پڑتا ہے غم، ایسا بھی ہوتا ہے
ہجومِ غم میں بھی، عارف! سکوں محسوس کرتا ہوں — خوشی سے بھی الجھ جاتا ہے دم، ایسا بھی ہوتا ہے

پھونک کر میں نے آشیانے کو — روشنی بخش دی زمانے کو
وہ ترا غم تھا، جو سنور گیا — زندگی کے نگارخانے کو
جس کی دیوانگی ہو نازِ خرد — کون سمجھائے اس دِوانے کو
کچھ حجابات اٹھ گئے، عارف! — کچھ حجابات ہیں اٹھانے کو

تری ہی سمت محبت کے قدم اٹھتے ہیں — موڑ آنے سے کہیں راہ بدل جاتی ہے!

کیا کیجے اب اس کو کہ دل بیٹھ رہا ہے — اے دوست! یہ اٹھنے کو تو اٹھا ترے در سے
کیا بات ہے آج ان کو ندامت سی ہے، عارف! — کیا پا گئے وہ کچھ، مرے اندازِ نظر سے

رہروانِ رہِ تسلیم و رضا ہیں یہ لوگ — شکوۂ غم تیرے شایانۂ غم کیا کرتے
وہ جو ناموسِ مشیئت کے امیں ہیں، عارف! — وہ ثنا خوانیِ اربابِ کرم کیا کرتے!

عشرتِ نیم نگاہی بھی غنیمت سمجھو — فرصتِ شوق کے لمحات کہاں ملتے ہیں!

دلِ حسرت زدہ ہے، نظر شرحِ آرزو — کس کی نگاہِ لطف ہے سائل، نہ پوچھیے

گم ہو گیا جو اپنے ہی جلوؤں کے حسن میں اس کامیابِ دید کی مشکل نہ پوچھیے

وہ نگاہِ مست کی گردشیں کہ ہزار جام نثار ہوں

وہی دورِ بادۂ بے سبو، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نہ سکون تھا کسی حال میں، نہ قرار تھا کسی رنگ میں

تمھیں پا کے بھی وہی جستجو، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

منظر اکبرآبادی، شمشاد حسین صدیقی۔

منظرؔ اردو کے مشہور شاعر جناب سیمابؔ اکبرآبادی (ف ۱۹۵۱ء) کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت والد مرحوم کی نگرانی میں پائی۔ لیکن کمزوریِ صحت اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہ میں حائل ہوئی۔ سیمابؔ مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلے میں کانپور کے بعد اجمیر، ٹونڈلہ، آگرہ وغیرہ میں رہے۔ منظرؔ کا بچپن بھی انھیں مقامات میں بسر ہوا۔ ٹونڈلہ کے قیام کے زمانے میں یہ وہاں کے ریلوے ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے، لیکن ابھی دسویں درجے تک نہیں پہنچے تھے کہ سیمابؔ وہاں سے چلے آئے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اور سب کام سے ہاتھ اٹھا کر آگرے میں قصرالادب کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ "پیمانہ" جاری کیا۔ منظرؔ اپنی کمسنی کے باوجود اس ادارے سے وابستہ ہو گئے؛ اور یوں تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد کچھ فارسی عربی اور اردو مدرسۂ عالیہ، جامع مسجد آگرہ اور مدرسۂ محمدیہ، آگرہ میں حاصل کی۔

قصرالادب کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف پرچے شائع ہوتے رہے، جن میں ہفتہ وار

تاج، ثریا، شاعر، کنول، مشورہ، ہفتہ وار ایشیا نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ منظر کسی نہ کسی حیثیت سے ان سب سے متعلق رہے اور غالباً پندرہ برس تک ایشیا کے ایڈیٹر رہے۔

جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی، اس میں شعر گوئی گویا لازمۂ حیات تھی۔ یہ بھی بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے؛ اصلاح اپنے والد سے لی۔ اگرچہ غزل بھی کہتے تھے، لیکن زیادہ مزاولت نظم سے رہی۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں سیماب کا کراچی میں انتقال ہوگیا، تو منظر صاحب آگرے سے پاکستان چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے ایک ماہنامہ "پرچم" کے نام سے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ پاکستان میں پریشان حال رہے۔ انھیں حکومتِ پاکستان کی طرف سے ادبی وظیفہ ملتا تھا۔ تندرستی ادھر بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ ضیق النفس کا عارضہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود بظاہر تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اچانک ۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء شب میں کھانسی کا شدید دورہ پڑا، جس سے ناک اور منہ سے خون جاری ہوگیا۔ اور دس منٹ بعد آناً فاناً ساڑھے دس بجے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

اب نمونے کے چند شعر دیکھیے، جو مختلف رسائل سے جمع کیے گئے ہیں:

میں پوچھتا ہوں یہ دنیا کے بامرادوں سے ... وہ کیا کرے کہ جو ناکامِ آرزو ہو جائے

جسے منظور ہو بربادیِ مطلق، منظر! ... آئے، وہ جامۂ ہستی کا گریباں ہو جائے

لڑکپن تھا کہ تھی ہر چیز پر اک سادگی طاری ... جوانی ہے کہ اک دنیا جواں معلوم ہوتی ہے

عبادت ہے کہ سجدے روز کرتا ہوں خدا کو میں ... طبیعت ہے کہ اب تک بت پرستی کو ترستی ہے

دیکھیے، کس نام سے ہو ذکرِ مرگِ عاشقی ... نام میری بےخودی کا زندگی مشہور ہے

ستارے چپ، فضا خاموش، پچھلے شب کا سناٹا ... مناسب وقت ہے، دل چاہتا ہے اک فغاں کر لیں

اب کہیں تیری تمنا کا ٹھکانا بھی نہیں
دیکھ انجام، تمناؤں کے ٹھکرانے کا

مرا دل مرگیا تو زندگی کو رو چکی دنیا
نشاطِ محفلِ ہستی عبارت ہو مرے دل سے

عجب اک چیز ہے انساں کا ہونا بھی، نہ ہونا بھی
جہاں آباد ہوتا ہے، وہیں برباد ہوتا ہے

کبھی مثلِ غیر رسماً مرا حال پوچھ لیتا
جو نہ چارہ ساز تھا تو، تو زمانہ ساز ہوتا

برباد کرکے دے نہ فریب التفات کے
اب ہم تری نگاہ کے قابل کہاں رہے

جب میں نہ تھا، تو دل کا تعین محال تھا
جب دل نہ تھا، تو آپ کے جلوے کہاں رہے

جدید ہو کوئی تصویر ذہنِ فطرت میں
بنا بنا کے ہیولے مٹائے جاتے ہیں

بیکار ہو، جنوں سے کبھی فرصت اگر ملے
اب اتنی دور لوٹ کے جائیں، تو گھر ملے

سامی، مہادیو پرشاد

...ئی (یوپی) کے ایک متوسط الحال کائستھ خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام
...ی پرشاد تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے: بڑے شاردا پرشاد تھے اور چھوٹے یہی مہادیو پرشاد۔
...دیو پرشاد ۲ جولائی ۱۸۹۵ء کو ہردوئی میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم جوبلی
ہائی اسکول، لکھنؤ میں پائی۔ اس کے بعد کیننگ کالج میں داخلہ لیا۔ بی ایس سی آخری سال
میں تھے کہ والد چل بسے۔ چونکہ اس کے بعد مالی حالت ٹھیک نہ رہی، اس لیے تعلیم کا
سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب انھوں نے ضرورتاً فیض آباد کے ایک اسکول میں نوکری کرلی۔ چندے
بعد نارمل اسکول، جبلپور میں منتقل ہو گئے، اور پھر گویا عمر بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے۔
۱۹۲۰ء میں محکمۂ تعلیم نے انھیں تدریس کی تربیت حاصل کرنے کے لیے منتخب کیا۔
جس کی سند اسپینس ٹریننگ کالج، جبلپور سے سند حاصل کی؛ اور اس کے بعد
وہیں گورنمنٹ کالج ہائی اسکول میں مدرّس مقرر ہو گئے۔
۱۹۳۹ء کے اواخر میں تہکاری سبھا، جبلپور نے انھیں ہتکارنی سٹی کالج میں اردو فارسی
کا لکچرر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اردو یا فارسی میں ایم اے نہیں تھے۔ اس لیے

یونیورسٹی اپنے قواعد کی رُو سے ان کے انتخاب پر بجا طور پر معترض ہو سکتی تھی، لیکن ان کی مسلّمہ قابلیت اور تجربے کے پیشِ نظر ناگپور یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد نے استثنائی طور پر ان کے تقرر کی اجازت دے دی۔ اس پر انھوں نے جنوری ۱۹۴۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بقیہ عمر اسی ہتکارنی کالج میں گذار دی۔ اپنی گرتی صحت اور پیرانہ سالی کے باعث وہ یہاں سے ۱۹۷۰ء میں سبکدوش ہوئے۔

پچھلے کئی برس سے ان کی صحت تسلّی بخش نہ تھی۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں کچھ نقص پیدا ہو گیا تھا، جس سے گردن میں بھی کجی آ گئی تھی۔ مزید مصیبت یہ کہ نجی حالات بھی بہت ناخوشگوار ہو گئے۔ خانگی جائداد سے متعلق کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا اور نوبت عدالت تک پہنچی۔ مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔ اور وہ پریشان رہنے لگے۔ اسی زمانے میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور اس کے بعد اس کے متواتر حملے ہوتے رہے۔ آخری حملہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ہوا اور اسی دن سہ پہر کے پانچ بجے وہ میڈیکل کالج میں جان بحق ہو گئے۔ لاولد فوت ہوئے۔

جیسا کہ ذکر ہوا وہ گھر کے ناموافق حالات کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے، لیکن خداداد ذہانت اور ذاتی جدوجہد سے انھوں نے یہ کمی پوری کر لی۔ سائنس کے وہ طالب العلم رہے تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی میں ان کی مہارت کا کچھ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پی ایچ ڈی کے طلبہ اور پروفیسر ان سے مشورہ کرتے اور رہنمائی حاصل کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی جب سے وہ بہت دن تک مدھیہ پردیش کے فارسی عربی بورڈ کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔

شعر و سخن سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ جب شعر کہنے لگے، تو افتخار الملک مضطر خیرآبادی سے مشورہ کیا۔ افسوس کہ ایک نعتیہ نظم (ردیتِ حسنہ) کے علاوہ جو جذباتِ ...

کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا! اتنا اطمینان ہے کہ وہ محفوظ ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔

اس نعتیہ نظم کی شانِ نزول یہ ہے کہ ۲۸ فروری ۱۹۲۷ء (یعنی شب ۵/۶ شعبان ۱۳۴۵ھ) کو مغرب کے بعد ایک ستارہ ٹوٹا اور آہستہ آہستہ اس کی روشنی سے آسمان پر لفظ محمدؐ ظاہر ہوا۔ یہ منظر کم و بیش آدھ گھنٹے تک دیکھا گیا اور پھر بتدریج مدھم ہوتا ہوا مٹ گیا۔ یوپی اور مدھیہ پردیش (سی پی) کے متعدد شہروں میں ہزاروں اشخاص نے اسے دیکھا۔ اس زمانے کے اخباروں میں بھی اس کا بہت چرچا رہا تھا۔ اس سے متعلق یکم مارچ ۱۹۲۷ء کو جبلپور میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا، جس کے کوائف "ستارۂ محمدیؐ" کے عنوان سے علی احمد جبلپوری نے شائع کیے تھے۔ اس مجموعے میں سامی کی اس نظم 'رویتِ حسنہ' کے علاوہ تین فارسی رباعیاں، ایک فارسی قطعہ اور ایک فارسی نعت بھی شامل ہیں۔ یہ نظم 'رویتِ حسنہ' انھیں ایام میں 'جذباتِ سامی' کے عنوان سے بھی چھاپی گئی تھی۔ یہ مسدس کی شکل میں ہے۔ اس میں سترہ بند (۵۱ شعر) ہیں۔

غزل کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں

سامی کی حقیقت کیا احباب کی شفقت ہے
اچھوں کو تو اچھا ہی اچھا نظر آتا ہے

عشق میں لٹتے ہیں اکثر کارواں منزل کے پاس
غرق ہو جاتی ہیں اکثر کشتیاں ساحل کے پاس

تم تھے، تو نگاہوں میں ویرانہ گلستاں تھا
ہم آج گلستاں کو ویرانہ سمجھتے ہیں

اک ہم ہیں کہ غیروں کو اغیار نہیں سمجھا
اک آپ ہیں اپنوں کو بیگانہ سمجھتے ہیں

نیکیوں کے بھی بدلے اب بدی سے ملتے ہیں
دوستی کے سب پہلو دشمنی سے ملتے ہیں

انھیں غرض کہ صدائیں سنیں غریبوں کی — یہ بیخودی تھی ہماری جو ہم پکار آئے

ایسی پرسش سے تو بہتر تھا تغافل تیرا — حال یوں پوچھا کبھی جیسے شناسائی نہ تھی

اب انھیں میری وفا کا اعتبار آیا، تو کیا! — بعدِ مردن، مژدۂ دیدار بھی آیا، تو کیا!

جہاں سارا نظر آئینۂ صورت نما نکلا — کہ جب بت کو نگاہِ غیر سے دیکھا، خدا نکلا

ایک مدت سے جو کچھ کہہ نہ سکا تھا ساحی — میں درِ حضرتِ مضطر پہ جبیں سا نہ ہوا

افقر موہانی، سید محمد حسین

محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ (ف ۱۳۲۵ء) کے خلیفہ حضرت نصیر الدینؒ (ف ۱۳۵۶ء) چراغ دہلی کے نام سے کون صاحب علم واقف نہیں ہوگا! انھیں کے خلیفہ اور جانشین حضرت سید محمد گیسو دراز تھے (ف ۱۴۲۲ء) جن کا مدفن گلبرگہ میں ہے۔ ان سے آگے یہ سلسلۂ طریقت چلا۔ ان کے خلفا میں سے حضرت سید شاہ عبد الحکیم عرف دادا میاں اولاً بہت دن کالپی (ضلع جالون) میں مقیم رہے اور پھر ۸۵۰ھ میں وہاں سے نقل مکان کر کے قصبۂ موہان (ضلع اناؤ) میں اقامت گزیں ہو گئے۔ یہی دادا میاں ہمارے شاعر سید محمد حسین افقر موہانی کے جد اعلیٰ تھے۔ حضرت دادا میاں کی آٹھویں پشت میں افقر کے دادا مولانا شاہ غلام علی پیرزادہ عرف میاں جی ہوئے۔ پیری مریدی کا یہ سلسلۂ رشد و ہدایت انھیں پر ختم ہو گیا۔ ان کے جانشین مولانا سید اکرام علی (افقر موہانی کے والد) تھے۔ یہ ۱۸۴۵ء میں موہان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے عربی فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم اپنے والد یعنی حضرت میاں جی سے پائی۔ وہ چاہتے تو یہ سجادہ نشینی جاری رکھتے، لیکن انھوں نے یہ سلسلۂ بیعت قائم نہیں رکھا؛ اور خود سید حاجی وارث علی شاہ، دیوہ (ف مارچ ۱۹۰۵ء) کے مرید ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

انھوں نے قصبۂ موہان اور قرب وجوار کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں بجنور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، بسمل تخلص تھا۔ افقر صاحب نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ان کا کلام دیوان کی شکل میں مرتب نہ ہو سکا، صرف کچھ اوراق میرے پاس موجود ہیں۔

افقر (جیسا کہ انھوں نے خود مجھے اطلاع دی تھی) ۳۱ جولائی ۱۸۸۷ء کو اپنے وطن مالوف موہان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے محمد حسین کے علاوہ ان کا تاریخی نام "ظفر وارث" بھی رکھا جس سے ۱۸۸۷ء برآمد ہوتے ہیں، ان کے بے تکلف معاصرین آخر تک انھیں اسی تاریخی نام سے پکارتے رہے۔ افقر کی ننھیال قصبۂ آسیون (ضلع اناؤ) میں تھی۔ چنانچہ ان کی ابتدائی تعلیم یہیں اپنے ماموں مولانا ضیاالدین قادری کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کے بعد یہ موہان آگئے اور اب دینیات اور دوسرے علوم رسمیہ کی تحصیل میں لگ گئے۔ انھوں نے مقامی اردو مڈل اسکول سے ۱۹۰۱ء میں بعمر ۱۴ سال مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں وہ مستقلاً لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں انھوں نے حکیم عبدالعزیز (جھوائی ٹولہ) سے طب کی تعلیم پائی، لیکن انھوں نے کبھی باقاعدہ مطب نہیں کیا۔ جب فکر معاش ہوئی، تو ۱۹۰۷ء میں مطبع نولکشور میں مصحح مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ بہت دن تک رہا۔ کئی سال بعد سرکاری ملازمت مل گئی اور وہ کورٹ آف وارڈس میں ضلعدار مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد تحصیل میں ناظر اور واصل باقی نویس کے عہدوں پر بھی رہے؛ ان کا زیادہ زمانہ ملیح آباد (ضلع لکھنؤ) میں گذرا۔

افقر ۱۹۱۲ء میں بمبئی چلے گئے۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ وہاں کے ایک سیٹھ حاجی منشی محمد حسین لکھنؤ آئے۔ جب وہ مطبع نولکشور گئے، تو یہاں اُن کی ملاقات افقر سے ہوئی۔ منشی محمد حسین کا ایک ہفتہ وار پرچہ 'مفید روزگار' تھا؛ وہ اس کے لیے کسی

ایڈیٹر کی تلاش میں تھے۔ جب وہ افقر صاحب سے ملے، تو انھیں بمبئی آنے اور مفید روزگار کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ افقر نے اسے قبول کر لیا اور اپنی سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر بمبئی چلے گئے۔ یہاں وہ تین برس ۱۹۱۵ء تک رہے۔ مفید روزگار کے ایڈیٹر تو تھے ہی، منشی محمد حسین کے ایما پر انھوں نے ایک مزاحیہ پرچہ مولانا پیچ بھی جاری کیا۔ لیکن بمبئی کی مرطوب آب و ہوا انھیں راس نہیں آئی؛ اب وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ بالآخر انھوں نے تنگ آکر ان صحافتی سرگرمیوں پر لات ماری اور لکھنؤ کی راہ لی۔ اس سے معاش کا مسئلہ تو حل نہیں ہو سکتا تھا۔ بارے مطبع نولکشور کے منتظمین نے دستگیری کی اور یہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں وہ ڈسٹرکٹ گزٹ کے مدیر ہو کر گونڈہ چلے گئے۔ یہ کانگریس اور خلافت کی سرگرمیوں کی روز افزوں ترقی کا زمانہ تھا؛ ان دونوں کے خلاف حکومت کے پراپگنڈے کی مشین تیزی سے کام کر رہی تھی، اور اس کام کے لیے سب ضلعوں سے گزٹ شائع ہونے لگے تھے۔ گونڈہ گزٹ بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ ۱۹۲۲ء میں یہ گزٹ بند ہو گیا اور افقر صاحب لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں ان کا ملجا و ماوا لے دے کے نولکشور چھاپہ خانہ تھا، اب کے انھیں صحافتی تجربے کے پیش نظر روزانہ اودھ اخبار کا نائب مدیر مقرر کیا گیا۔

اس زمانے میں سید جالب دہلوی (ف جولائی ۱۹۳۰ء) لکھنؤ میں ہمدم اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ افقر صاحب سے ان کے دید و وادید کے تعلقات تھے، جالب کے مشورے سے افقر نے ماہنامہ 'جامِ جہاں نما' جاری کیا؛ اس کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۲۷ء میں نکلا تھا۔ اس میں لکھنوی اسلوب بیان اور طرزِ سخن پر بڑی کڑی تنقید شائع ہوئی، جس سے یہاں کے شعرا تلملا اٹھے، اور انھوں نے افقر کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا لیا۔ مخالفوں کے نام لکھنے سے فائدہ؟ یہ سمجھیے کہ عزیز، آرزو، بیخود موہانی، آسی الدنی، امید امیٹھوی

وغیرہ تو البتہ غیر جانبدار رہے، بقیہ تقریباً تمام بڑے اور چھوٹے شاعر ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ لیکن اصغر گونڈوی، بیخود موہانی، اور راز لکھنوی جام جہاں نما کے ممتاز مضمون نگار تھے۔ جب لکھنوی شعرا کی دھمکیاں بےسود ثابت ہوئیں، تو متعدد حضرات نے ہتک عزت کے مقدمے دائر کر دیے۔ افقر نے ان کے اوچھے حملوں کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا؛ اور بالآخر مخالفوں کو ہر میدان میں زک اٹھانا پڑی۔ یہ پرچہ اپنی پوری آن بان سے ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد وہ پانچ چھ برس تک پڑھاتے رہے، جہاں سے ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں اتر پردیش کی حکومت نے ان کا ایک سو روپیہ ماہانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا، جو انھیں اپنی وفات تک ملتا رہا۔ توکل اور صبر و شکر انھیں ورثے میں ملا تھا؛ اس لیے اس قلیل وجہِ معاش کے باوجود انھوں نے کبھی شکایت کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی حضرت وارث علی شاہؒ (دیوہ) کے مرید تھے۔ ان کے نام کے ساتھ وارثی کا اضافہ اسی مناسبت سے تھا۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، انھیں معلوم ہوگا کہ وہ بالعموم ایک گیروا تہمد باندھے رہتے تھے۔ یہ بھی وارثی گروہ کا امتیازی نشان ہے۔ ان کے کمرے میں عین پلنگ کے اوپر حضرت وارث علی شاہؒ کی ایک تصویر لٹکی رہتی تھی، اگرچہ اس پر ایک پردہ پڑا رہتا تھا۔

انھوں نے اپنے پیر کی یاد منانے کو ۱۹۰۵ء میں سالانہ طرحی مشاعرہ کی بنیاد رکھی تھی؛ یہ مشاعرہ ۷ اپریل کو ہوا کرتا تھا۔ اسے وہ اپنی زندگی بھر باقاعدگی سے کرتے رہے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ مصرعِ طرح ہمیشہ ہزج مثمن سالم میں ہوتا اور قافیہ آستان۔ اس کے لیے وہ شاعروں کو دعوت نامہ بھیجتے تھے، اور ان شاعروں کے علاوہ اور کسی کو کلام پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

چونکہ وہ بہت کمزور رہنے لگے تھے اور کمزوری روز بروز بڑھ رہی تھی؛ اس لیے انھیں معلوم تھا کہ اب وہ

زیادہ دن جیسے کے نہیں۔ چنانچہ آخری مشاعرے کے موقعہ پر انھوں نے اپنے احباب اور تلامذہ سے ان کے نام لے کر یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس مشاعرے کو آیندہ بھی جاری رکھیں۔ سالِ رواں کے مشاعرے میں انھوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ آیندہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہیں ہو سکینگے۔ وہی ہوا۔

کبرسنی کا عالم تھا۔ ۸۴ برس کی عمر ہندستان کے معیارِ عمر کو دیکھتے ہوئے کم نہیں ہے۔ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ بہت معذور ہو گئے۔ سالِ گذشتہ دوسرا حملہ ہوا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اب دنوں کے مہمان ہیں، لیکن موت کا بہانہ قلبی دورہ ہوا۔ وہ ایک زمانے سے محلہ لاٹ کلن (ماموں بھانجے کی قبر کے موڑ پر) لکھنؤ میں رہتے تھے۔ یہیں منگل کے دن ۲ نومبر ۱۹۷۱ء/۱۲ رمضان ۱۳۹۱ھ کو بعدِ مغرب انتقال ہوا۔ تدفین اگلے دن (۳ نومبر) بعدِ ظہر ہوئی۔ نمازِ جنازہ ان کے رشتے کے بھتیجے محمود اختر دارثی نے پڑھائی عیش باغ کے قبرستان میں قبر نصیب ہوئی۔

ابھی وہ مڈل اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ انھوں نے (۱۹۰۰ء میں) شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا سب سے پہلا شعر تھا:

دل غنی ہے تو مفلسی کیا ہے
گھر میں اللہ کے کمی کیا ہے

یہ شعر ان کے خاندان کے مذہبی ماحول کا ترجمان ہے۔ جس زمانے میں یہ لکھنؤ آئے ہیں یہاں حکیم ضامن علی جلال (ف ۱۹۰۹ء) اور منشی امیر اللہ تسلیم (ف مئی ۱۹۱۱ء) دو صاحبِ فن اساتذہ موجود تھے۔ چونکہ افقر کو مومن (ف ۱۸۵۲ء) کے کلام سے شغف تھا، اس لیے انھوں نے تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔ تسلیم خود نواب اصغر علی خاں نسیم (ف ۱۸۶۶ء) کے شاگرد تھے، جن کا مومن کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح افقر کا سلسلۂ سخن تیسری پشت میں مومن سے جا ملتا ہے۔ اصغر گونڈوی (ف نومبر ۱۹۳۶ء) اور حسرت موہانی

(ف ۱۹۵۱ء) ان کے خواجہ تاش تھے۔ افقر ۱۹۰۵ء کے آخر میں تسلیم کے شاگرد ہوئے؛ حسرت ان سے دو تین سال پہلے شاگرد ہو چکے تھے اور اصغر گونڈوی دو تین سال بعد آئے۔

ان کی کچھ تصنیفات شائع ہو چکی ہیں: (۱) رسائل تصوف، پانچ حصے (لکھنؤ ۱۹۱۵ء)؛ (۲) عید کی ڈالی (لکھنؤ ۱۹۱۷ء)؛ (۳) سعی عمل (نظمیں) (الہ آباد ۱۹۲۲ء)؛ (۴) مختصر سوانحعمری حضرت حاجی وارث علی شاہؒ (لکھنؤ ۱۹۳۳ء)؛ (۵) فردوس معانی (پہلا دیوان) (لکھنؤ ۱۹۲۶ء)؛ (۶) رہنماے شاعری حصّہ اول (لکھنؤ ۱۹۶۰)؛ (۷) نظرگاہ (دوسرا انتخابی دیوان) (لکھنؤ ۱۹۶۱ء)؛ (۸) رہنماے شاعری، حصّہ دوم (لکھنؤ ۱۹۶۷ء) ان میں سے دو کتابوں (نمبر ۳ اور ۷) پر حکومت کی طرف سے پانچ پانچ سو روپیہ انعام عطا ہوئے۔ ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ پڑا ہے، جس سے ایک مجلد تیار ہو سکتا ہے۔ بظاہر اس کے شائع ہونے کا امکان اب کم ہی ہے۔ اور جو انھوں نے مصحفی کی تقلید میں شاگردوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیا، اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے!

افقر کو زبان و بیان و عروض پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ملک کے مختلف حصّوں میں موجود ہے، جن کی بدولت ان کا نام روشن رہیگا۔ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر سلام سندیلوی بھی ان کے شاگرد ہیں۔

جسمانی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ محشر موہانی تھے۔ وہ طب کے فارغ التحصیل تھے اور طبیب کی حیثیت ہی سے ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ افقر اس زمانے میں حج کو گئے ہوئے تھے، وہ ان کی غیر حاضری میں فوت ہوئے۔ ماشاءاللہ ان کی اولاد موجود ہے۔ ان کے علاوہ دو لڑکیاں، شادی شدہ اپنے گھر بار والی موجود ہیں۔

کچھ کلام بطور نمونہ دیکھیے:

وہ کیوں جانے لگا دیر و حرم کی ٹھوکریں کھانے ترے افقر کو تیرے میکدے پر ناز ہے ساقی!

یکتائیِ جمال کی اللہ رے وسعتیں
سو جلوے ہیں بطرزِ دگر، کچھ نہ پوچھیے

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا، نہ دیکھا

معاذ اللہ نزاعِ دیر و کعبہ
بحمد اللہ درِ میخانہ آیا!

موت کے ڈر سے کانپنے والے
موت ہی حاصلِ حیات نہ ہو

ہو کرم میں نہاں ستم نہ کہیں!
اتنا ممنونِ التفات نہ ہو

لے بس آؤ، مل جائیں، چھوڑیں ضدوں کو
نہ تم بات والے، نہ ہم بات والے

وہ ہونگے جہاں، صبح کی بات ہو گی
جہاں ہونگے ہم، رات ہی رات ہو گی

جو کچھ چار تنکوں کو ہم جانتے ہیں
وہ گلچین و صیاد کم جانتے ہیں

دل غنی ہے، تو مفلسی کیا ہے
گھر میں اللہ کے کمی کیا ہے

یوں تو تمام رات تڑپتے کٹی، مگر
گزری جو دل پہ وقتِ سحر، کچھ نہ پوچھیے

اس کی دنیا کا عالم نہ پوچھو
جس کی دنیا تمھاری نظر ہے

کسی نے نہ پہچانا ان کو اسی سے
ہزاروں بنے جلوے، مگر ایک ہی سے

ہے مقصودِ دیر و حرم ایک لیکن
وہ کافر ہے، جو کہے شیخ جی سے

ہر اک سے ان کا وحشی داستاں کچھ اور کہتا ہے
نہیں ہوتا جہاں کوئی، وہاں کچھ اور کہتا ہے

سب کچھ ہے، اور کچھ نہیں ساماں ترے بغیر
دنیا ہے ایک خوابِ پریشاں ترے بغیر

مشکل نہیں ہے کوئی بھی ہوتے ہوئے ترے
مشکل نہیں ہو کوئی بھی آساں ترے بغیر

جینا ہی کچھ محال نہ تھا تیرے ہجر میں
مرنا بھی اپنا اب نہیں آساں ترے بغیر

ہوتا گیا حضوریِ جاناں سے دور تر
وہ جو کشاکشِ حق و باطل میں رہ گیا

گبر مومن کو، تو کافر کو مسلماں کردے
جس کو جو چاہے، وہ غارتگرِ ایماں کردے

اللہ ری تقدیر کی ناکامی پیہم
یوں بیٹھا ہوں اب، جیسے کوئی کام نہیں ہے

سنی تو اس نے غیروں سے، ہوا گو بدگماں ہم سے
بہر صورت رہی بہتر ہماری داستاں ہم سے

تجلی حسنِ جاناں کی نہیں موقوف ایمن پر ۔ جہاں محسوس کرتا ہوں، وہیں معلوم ہوتی ہے

فکرِ دنیا، فکرِ عقبیٰ، فکرِ حق، فکرِ سخن ۔ چار دن کی زندگی، افقرؔ! ہے، کیا کیا کیجیے

خفا وہ ہیں، اجل روٹھی ہے، دل بیتاب، جاں مضطر ۔ اٹھائے کب تک ایسی زندگی کی سختیاں کوئی

اس کی نہیں خدائی کہ اس کا خدا نہیں ۔ تم جس کو مل گئے، اسے پھر کیا ملا نہیں

تے بلب، ساغر بدست و خُم بسر لغزش بپا ۔ میکدہ سے جو بھی نکلا، میکدہ بر دوش تھا

میں کہوں گا نہ پریشانیٔ خاطر، ناصح! ۔ اور اس نے جو مرا حال پریشاں دیکھا!

دامن کا چاک، جیب کا چاک، آستیں کا چاک ۔ سب مل گئے ہیں چاکِ گریباں کے آس پاس

گزرتے ہیں جنابِ شیخ جب میخانے سے ہو کر ۔ نہیں کہتے زباں سے کچھ، مگر ہاں، دیکھ لیتے ہیں

جبینِ شوق! نہ سجدے میں اتنی کر سبقت ۔ ہر ایک نقشِ قدم، نقشِ پائے یار نہیں

تمھارے وعدے کا ہو لاکھ اعتبار، مگر ۔ وہ کیا کرے، جسے قسمت پہ اعتبار نہیں

دلکش یوں ہی تھی، میری محبت کی داستاں ۔ دنیا کا اس پہ حسنِ بیاں، کچھ نہ پوچھیے

افقرؔ کو اس کے حال پہ رہنے بھی دیجیے ۔ بس جان کر خرابِ جہاں، کچھ نہ پوچھیے

خدا رکھے، غضب کی دلکشی دنیا میں ہے، افقرؔ! ۔ جو نکلیگا، وہ دے کر جان اس محفل سے نکلیگا

میں کعبے کو ترے کچھ، زاہد! کہتا نہیں بس یہ کہتا ہوں

ہوتے ہوئے ان کی چوکھٹ کے سرِ اور کہیں خم کون کرے!

مل جاتا ہے جو راہ میں کوئی خرابِ عشق ۔ ذکر اس کا چھیڑ دیتے ہیں پھر ہم اسی سے ہم

جنابِ شیخ نہ فرمائیں کچھ یہاں، افقرؔ! ۔ یہ میکدہ ہے، مشائخ کی خانقاہ نہیں

سیّد عبداللطیف[1] (ڈاکٹر)

ڈاکٹر سید عبداللطیف بروز جمعہ ۶ صفر ۱۳۰۹ھ (۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء) کو کرنول (تامل ناڈ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت تک پہنچتا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ جہانیاں جہاں گشت اثنا عشری امام دہم حضرت علی نقی (ف ۲۵۴ھ) سے دسویں پشت میں تھے، لیکن فرشتہ سے قبل کی کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کا ذکر نہیں ملتا، نہ خود جہانیاں جہان گشت کے ملفوظات ہی میں کوئی اس طرح کا دعویٰ ہے۔ بعد کے مصنفوں نے فرشتہ کی تقلید کی ہے، لیکن ہر جگہ درمیانی کڑیوں کے ناموں میں اور سلسلے میں کچھ نہ کچھ اختلاف ملتا ہے۔ واللہ اعلم

اس خاندان کے جو فرد سب سے پہلے ہندستان آئے، وہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے دادا سید جلال الدین حسین سرخ بخاری ابن سید علی ابو المؤیّد تھے۔ وہ سلطان شمس الدین التتمش کے عہد میں بخارا سے بھکر آئے۔ یہاں سے ملتان پہنچے اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا سے علوم باطنی کی تکمیل کی۔ ملتان سے اوچہ گئے، جو بہاولپور سے ۳۸ میل دور دریائے ستلج اور چناب کے سنگم پر ایک مختصر سا قصبہ ہے۔ یہ کسی زمانے

میں بڑا علمی مرکز رہا ہے۔ سید جلال سرخ بخاری کا ۹۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۱ء میں انتقال ہوا۔ وہ اوچہ ہی میں مدفون ہیں۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت بن سید احمد کبیر بن سید جلال سرخ بخاری کے حالات سے اہلِ دل کے سینے روشن ہیں۔ وہ صاحبِ علم و قلم اور برگزیدہ صوفی تھے۔ ان کا بعمر ۷۷ سال چہارشنبہ ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ (۳ فروری ۱۳۸۴ء) کو اوچہ ہی میں انتقال ہوا اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

اس خاندان نے ہر دور میں صوفیۂ کرام اور علمائے عظام پیدا کیے ہیں۔ ان کی ایک شاخ کرنول میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اسی کرنولی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شاہ حسین الحسینی وہاں کے مشہور عالم و صوفی تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں کرنول میں رحلت کی اور خاندانی احاطے میں اپنے جدِ اعلیٰ حضرت شاہ عبداللطیف قادری عرف یاہو بادشاہ (ف ۱۶۷۹ء) کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ ان کی عمر کے بارھویں سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ مقامی ہائی اسکول میں بھیج دیے گئے، یہاں سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کی سند لی۔ اس سے فارغ ہوکر اعلیٰ تعلیم کے لیے مدراس کرسچین کالج میں داخلہ لیا، یہاں سے ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کے والد سید شاہ حسین ان کے کرسچین کالج میں داخلے کے خلاف تھے۔ وہ ٹھہرے پرانی وضع کے مذہبی آدمی، انھیں اندیشہ ہوا کہ بیٹا زیادہ انگریزی پڑھ کر گمراہ اور بیدین ہوجائیگا۔ لیکن سید عبداللطیف نے یہ برجستہ جواب دے کر انھیں قائل کر دیا کہ اباجان، میں تو انگریزی اس لیے سیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے قرآن اور اسلام کی مقدس تعلیمات کو مغربی ممالک میں عام کرسکوں۔ انھوں نے بچپن کے اس وعدے کو آخر میں پورا

کر دکھایا۔ کالج میں ان کا خاص مضمون اصولِ تنقیدِ ادبیات اور تاریخِ تنقیدِ ادبیاتِ انگریزی تھا اور اس میں وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں سب سے اول آئے تھے۔

اس زمانے میں نواب بیگم بیّ کے بھائی میر اسد علی خان مرکزی مجلسِ وضع قوانین کے رکن تھے۔ ان کی وساطت سے سید عبد اللطیف صاحب، سید نواب علی چودھری سے ملے اور ان کے ذاتی سکریٹری مقرر ہو گئے۔ چونکہ سید نواب علی بھی مجلسِ مذکور کے رکن تھے، اس سے ان کا قیام اکثر دلّی میں رہتا تھا اور ان کے ہاں ملک کے عمائد کی آمد و رفت تھی۔ اس طرح سید عبد اللطیف کا ان سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں سر ابراہیم رحمت اللّٰہ (بمبئی) تھے۔ وہ ان کی قابلیت اور انگریزی میں مہارت سے خاص طور پر بہت متاثر ہوئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چند برس بعد جب انھوں نے بمبئی کے مضافات میں پنچ گنی کے پہاڑی مقام پر متموّل طبقے کے طلبہ کے لیے ایک پبلک اسکول قائم کیا، تو انھوں نے اس کی پرنسپلی کے لیے ڈاکٹر عبد اللطیف کو دعوت دی۔ وہ وہاں دو برس تک رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد کا قیام عمل میں آیا، تو وہ ۱۹۲۰ء میں یہاں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ یونیورسٹی کے مختلف مضامین کے چار اسسٹنٹ پروفیسروں کو مزید تعلیم کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ ہر ایک کو تین سال کی تعلیمی رخصت دی جائے، جس کے دوران میں انھیں نصف تنخواہ ملیگی، مزید براں ہر ایک کو خرچ کے لیے تیس ہزار روپیہ قرض بھی دیا جائے، جس پر ان سے سود نہیں لیا جائیگا۔ انگریزی کے شعبے سے ڈاکٹر سید عبد اللطیف کے بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ ان کے علاوہ خلیفہ عبد الحکیم اور پروفیسر وحید الرحمٰن کا انتخاب ہوا تھا) خیال تھا کہ یہ بی اے آنرز (انگریزی) میں داخلہ لیں۔ مشکل یہ پیش آئی کہ ریاست کے نمایندۂ مقیم انگلستان نے اطلاع دی

کہ تمام جگہیں پُر ہو چکی ہیں، لہذا امسال داخلہ ممکن نہیں؛ اگلے برس یعنی ۱۹۲۳ء میں داخلہ ہو سکیگا۔ ان ایاّم میں ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار سید شاہ حسین حسینی بہت سخت بیمار تھے اور حالت تشویشناک تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ ولایت کا داخلہ ایک برس کے لیے ملتوی ہو گیا ہے، تو مایوسی کا اظہار تو درکنار، انھوں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو، بلا ٹلی ——— اب میں یکسوئی سے والد کی خدمت اور تیمارداری کر سکونگا۔ لیکن جب ان کے والد کو صورتِ حال کی اطلاع ملی، تو انھوں نے سخت مخالفت کی اور اصرار کیا کہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ تم انگلستان جاؤ اور لندن یا آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے اصحابِ مجاز سے ملو، وہ لازماً تمھارے داخلے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لینگے، اور انھوں نے مزید یہ کہا کہ بےفکر رہو، تمھاری واپسی تک مجھے موت نہیں آئیگی۔ اس حکم کے آگے انھیں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، اور یہ انگلستان چلے گئے۔

انگلستان میں وہ کنگز کالج (لندن یونیورسٹی) کے صدر شعبۂ انگریزی پروفیسر سر اِزرائیل گولانز کے سامنے پیش ہوئے۔ سر اِزرائیل اور ان کے ساتھی پروفیسر عبداللطیف صاحب کی انگریزی میں مہارت اور انگریزی ادب پر عبور سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے پوچھا: آپ بی اے (آنرز) میں داخلے کی جگہ ایم اے یا پی ایچ ڈی کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے؟ بھلا انھیں کیا عذر ہو سکتا تھا! چنانچہ یہ براہِ راست پی ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگے۔ مقالے کا موضوع قرار پایا: انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر؛ اور اس کی تیاری اور پیش کرنے کی میعاد تین برس مقرر ہوئی۔ یہ ۱۹۲۲ء کے شروع کی بات ہے۔

۱۹۲۳ء کے وسط میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی نے انگلستان اور امریکا کی یونیورسٹیوں کے انگریزی کے پروفیسروں کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں شمولیت کے لیے انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں نے اپنا ایک ایک نمائندہ بھیجا، لیکن لندن

یونیورسٹی نے سراز رائیل گولانز کی سفارش پر دو نمایندے بھیجنے کی منظوری دی: ایک وہ خود اور دوسرے سید عبداللطیف، حال آنکہ وہ ہنوز صرف ریسرچ اسکالر تھے اور پروفیسر نہیں بنے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سراز رائیل کے دل میں ان کی کتنی وقعت تھی، اور وہ ان کی قابلیت کے کس درجہ قائل تھے۔ اسی سفر میں انھوں نے ہارورڈ اور ییل یونیورسٹیوں کا امریکا میں، اور میک گل کا کینیڈا میں دورہ کیا۔

امریکا سے واپسی پر سراز رائیل نے ان سے کہا کہ آپ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں ؟ تین سال کی قید تو عام حالات میں ہے۔ مقالے کے لیے آپ کا مواد جمع ہو چکا ہے، تو آپ اسے یکجا کر کے قلمبند کر دیجیے ! ہم آپ کا مقالہ دو ہی سال میں لینے کو تیار ہیں۔ اس پر انھوں نے دو مہینے کی رخصت لی اور شمالی سکاٹ لینڈ کے شہر سٹرتھ پیفر چلے گئے۔ وہاں ٹھہر کر انھوں نے ایک مختصر نویس کی مدد سے مقالہ مکمل کیا اور لندن واپس آکر اسے پیش کر دیا۔ لیکن سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد (کانووکیشن) کا زمانہ ابھی دور تھا۔ بارے سراز رائیل کی وساطت اور اثر و رسوخ سے یہ مہم بھی سر ہو گئی؛ ایک غیر معمولی کانووکیشن کا انتظام کیا گیا، جس میں انھیں سند عطا کی گئی (۱۹۲۴ء)۔ یوں یہ تین برس کی جگہ دو ہی برس میں اپنا کام مکمل کر کے حیدر آباد واپس پہنچ گئے۔

جب یہ انگلستان گئے ہیں، تو یونیورسٹی نے ان سے بھی ایک معاہدے پر دستخط کرائے تھے کہ واپسی پر یہ کم از کم دس برس تک یونیورسٹی کی ملازمت کریں گے؛ نیز ان کی تنخواہ کا ایک حصہ قرض میں مجرا کرنے کو کاٹا جائے گا۔ چنانچہ واپس حیدر آباد پہنچے، تو یہاں ۵۰۰-۱۰۰۰ روپے کے گریڈ میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جونہی دس برس پورے ہوئے، انھوں نے درخواست دی کہ مجھے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ انھوں نے لکھا کہ میرا ارادہ مزید ملازمت کرنے کا نہیں ہے؛ یکسوئی سے کچھ علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری صرف اتنی درخواست ہے کہ پنشن کم از کم اتنی ضرور ہو کہ شریفانہ بر اوقات کے لیے کفایت کر سکے، تاکہ معاش کی تشویش

میرے علمی کام کے رستے میں حائل نہ ہو۔ یونیورسٹی کے اصحاب مجاز نے یہ درخواست منظور کرلی۔ اولاً انھوں نے پوری تنخواہ پر ایک سال کی رخصت منظور کی؛ پھر ملازمت کے زمانے میں پانچ برس کا اضافہ کیا، تاکہ پنشن کی رقم کچھ بڑھ جائے۔ لیکن اس سے بھی پنشن ڈھائی سو ماہانہ سے متجاوز نہیں ہو سکتی تھی۔ جب یہ حالات نظام مرحوم، میر عثمان علی خان (وفات فروری ۱۹۶۷ء) کے علم میں آئے، تو انھوں نے حکم دیا کہ چونکہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ملازمت سے دست بردار ہونے سے مدّعا خدمتِ علم ہے، اس کی قدر کرنا چاہیے۔ پس ان کے لیے پوری پانچسو ماہانہ کی پنشن منظور کی جاتی ہے (جو عام حالات میں پچیس سالہ ملازمت کے اختتام پر دی جاتی ہے)

ترکِ ملازمت کے بعد، ۱۹۳۰ء ہی میں انھوں نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار نیو ایرا (عصرِ نو) جاری کیا۔ اور اس زمانے میں نظامِ دکن اور ان کی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیں اور حیدرآباد میں اصطلاحات نافذ کریں، جس سے لوگوں کو ریاست کے نظم و نسق میں شریک کیا جا سکے۔ ۱۹۳۰ء میں نظام کو یہ مشورہ کوئی مردِ قلندر ہی دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سب ان کے خلوص کے قائل تھے، اس لیے اگرچہ کسی نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا، لیکن ان سے کوئی بازپرس بھی نہیں ہوئی۔

ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی کچھ کم اہم نہیں تھیں، اگرچہ وہ رہیں یکسر ذہنی اور نظریاتی سطح پر کیونکہ انھوں نے عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ چوتھے دہے میں ہماری سیاسی فضا بڑی ہیجان خیز تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ملک کی آزادی کے لیے اصرار کر رہے تھے، لیکن جس بات پر دونوں متفق نہیں تھے، وہ تھا یہ مسئلہ کہ انگریزوں سے گلوخلاصی کے بعد ملک کا دستور کیا ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی اس مسئلے پر دو رسالے (انگریزی میں) قلمبند کیے تھے: (۱) مسلم کلچر اِن انڈیا (ہندستان میں اسلامی کلچر)، اور (۲) ڈفرنٹ کلچرل زونز ان انڈیا (ہندستان میں مختلف کلچری خطّے) انھوں نے

ان رسالوں میں جو نظریہ پیش کیا تھا، بعد کو اسے ایک باقاعدہ اسکیم کی شکل دے دی جس کی رُو سے ہندستان کا دستور وفاقی قرار پاتا تھا۔ ہر ایک وفاقی خطّے کے لیے پوری اندرونی آزادی کی سفارش تھی؛ مرکز میں صرف دفاع، امورِ خارجیہ، تجارتِ درآمد و برآمد اور مواصلات کے اہم ذرائع رکھے گئے تھے؛ غیر محسوب اختیارات بھی وفاقی خطوں کو تفویض کیے گئے تھے۔ اس سے وہ مسلم لیگ کے حلقوں میں بھی خاصے معروف و مقبول ہو گئے۔ بلکہ جناح صاحب ان پر بہت اعتماد کرنے لگے۔ مسلم لیگ نے کسی زمانے میں عبداللہ ہارون کی صدارت میں ایک فارن کمیٹی بنائی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے نظریے کے مطابق پاکستان اسکیم کا ایک خاکہ وضع کیا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی اس کمیٹی کے رکن تھے (دوسرے اراکین غلام رسول مہر، رضوان اللہ، ڈاکٹر افضال حسین قادری، پیر علی محمد راشدی تھے)

اپنی وفاقی اسکیم سے متعلق ان کی فریقین کے زعما سے خط وکتابت رہی۔ بالآخر گاندھی جی نے مسز سروجنی نائیڈو کی وساطت سے انھیں بمبئی آنے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے ملنے کی دعوت دی۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ اس پر یہ بمبئی پہنچے اور کانگریس کے لیڈروں سے ملے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے شبِ ۸ اگست کے جس جلسے میں "ہندستان چھوڑ دو" کی قرارداد منظور کی تھی (اور جس کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے غبارِ خاطر کے پہلے ہی خط میں کیا ہے)، ڈاکٹر سید عبداللطیف نہ صرف اس میں موجود تھے، بلکہ دوسرے لیڈروں کے ساتھ شہ نشین پر بیٹھے تھے۔ آدھی رات کے بعد علی الصباح یہ سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور انھیں مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا گیا۔ اگر مسلم لیگ چاہتی، تو اب بھی گفت وشنید کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن مسٹر جناح (ف ستمبر ۱۹۴۸ء) نے جو رویہ اختیار کیا، ڈاکٹر سید عبداللطیف اس سے اتنے دل گرفتہ ہوئے کہ انھوں نے اس کے بعد نظریاتی اور ذہنی سطح پر بھی کل ہند سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب انھوں نے اپنی تمام

توجہ حیدرآباد کے مسائل پر مرکوز کردی۔ اسی مقصد سے انھوں نے اپریل ۱۹۴۶ء
میں ایک اور انگریزی ہفتہ وار کلیرین (Clarion) نام کا نکالا۔ یہ پرچہ تین برس
تک جاری رہا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۲ مئی ۱۹۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ یہ وہ
زمانہ ہے جب مجلس اتحادالمسلمین اور مولوی قاسم رضوی (ف جنوری ۱۹۷۰ء) کی
عاقبت نااندیشی کے باعث حیدرآباد کی فضا بہت مکدّر ہو رہی تھی۔ رہی سہی کسر میر لائق
علی (ف اکتوبر ۱۹۷۱ء) کی وزارتِ عظمیٰ نے پوری کردی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف
نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح حیدرآباد کے قائدوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ وہ جس
رستے پر جا رہے ہیں، وہ تباہی کے غار کی طرف جاتا ہے جس سے ریاست حیدرآباد
اور نظامِ دکن دونوں ملیامیٹ ہو جائینگے۔ لیکن رضوی نقّار خانے میں لطیفی طوطی کی
صدا کسی نے نہ سنی۔ نتیجہ ہم سب کو معلوم ہے؛ اور اسی کی پیشگوئی انھوں نے کلیرین کے
آخری شمارے کے اداریے میں کی تھی۔

حیدرآباد کے انضمام کے بعد وہ اتنے دل برداشتہ تھے کہ ہجرت کرکے مدینہ منورہ چلے
جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک لطیفۂ غیبی کے نتیجے میں انھوں نے یہ ارادہ ترک کردیا۔
بہرحال کچھ دن سکون اور آرام کے لیے پنچ گنی چلے گئے۔ وہاں سے واپس حیدرآباد
آئے، تو ان کے وطن کرنول سے ایک وفد پہنچا کہ وہ آئیں اور عثمانیہ کالج، کرنول کی
پرنسپلی سنبھال لیں۔ اس کالج کے قیام میں خود ان کی مساعی بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں۔ یہاں
کا انتظام ابتر تھا اور منتظمین کو اندیشہ ہونے لگا تھا کہ چشم بددور کالج بند ہو جائیگا۔
وفد کے اراکین ان کے ملنے والے تھے اور مقصد نیک، ان کے اصرار کے سامنے انھیں
ہتھیار ڈالنا پڑے۔ وہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک دو برس اس کالج کے پرنسپل
رہے۔ جب ایک معقول جانشین کا انتظام ہوگیا، تو مستعفی ہو کر حیدرآباد چلے آئے۔
۱۹۵۲ء میں کرنول سے واپسی کے بعد انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمایش پر

انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز اور اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز کی بنا رکھی۔ مولانا آزاد کی وساطت اور سفارش پر انھیں اس کام کے لیے مرکزی اور آندھرا پردیش حکومت نے مالی امداد بھی دی۔ ان دونوں اداروں کی طرف سے تقریباً ۴۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد وہ مولانا آزاد کے بہت قریب آگئے، اگرچہ وہ انھیں آزادی ملک سے بہت پہلے سے اچھی طرح جانتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے شاہکار ترجمان القرآن کا ترجمہ انگریزی میں کر دیں، اور اس کے لیے انھیں دعوت دی کہ وہ ان کے پاس آکر دلّی میں قیام کریں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء سے مولانا آزاد کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک ان کا بیشتر زمانہ مولانا آزاد کے ساتھ بسر ہوا۔ جس دن مولانا کی رحلت ہوئی ہے، وہ یہیں کوٹھی میں موجود تھے۔

میری ان سے پہلی ملاقات مولانا آزاد ہی کے دہاں ہوئی۔ میں ۱۹۵۴ء میں مصر سے آیا، تو حسبِ معمول مولانا کی خدمت میں بھی سلام کو حاضر ہوا۔ مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہ خود مہینے دو مہینے یاد فرمالیتے تھے۔ ان کے سکرٹری محمد اجمل خان مرحوم مجھے ٹیلیفون سے مطلع کر دیتے کہ کل صبح آجایئے، وقت وہی فجر سے پہلے کا ہوتا۔ میں پہنچ جاتا اور دو تین گھنٹے مختلف موضوعات پر خوب گپ رہتی۔ بالعموم ناشتے کے بعد میں اجازت لیتا کہ اب ان کی دوسری منصبی مصروفیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن رخصت ہو رہا تھا؛ مولانا آزاد میرے ساتھ کمرے کے دروازے تک آئے۔ دروازہ کھولا، تو سامنے سے ڈاکٹر صاحب گزر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا کو سلام کیا۔ اس پر مولانا نے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ مالک رام صاحب کو تو جانتے ہونگے! انھوں نے جواب نفی میں دیا۔ مولانا نے تعارف کرایا اور واپس کمرے میں چلے گئے؛ اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آگئے۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں رہیں۔

ایک دن کہنے لگے: میں تو خود آپ کی تلاش میں تھا۔ بات یہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب 'عورت اور اسلامی تعلیم' کا انگریزی ترجمہ اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کروں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا! میں نے حامی بھرلی۔ اس پر انھوں نے جناب عبدالعلی سے اس کا ترجمہ کروایا اور 'وومن ان اسلام' کے عنوان سے اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کردیا (حیدرآباد ۱۹۵۹ء)

ان سے آخری ملاقات مارچ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں ان کے مکان پر حیدرآباد میں ہوئی۔ میں غالب صدی تقریبات میں شرکت کے لیے جناب عابد علی خان کا بلایا ہوا گیا تھا۔ اگرچہ قیام بحد مختصر صرف دو ہی دن کا تھا، لیکن ناممکن تھا کہ بن ملے چلا آتا۔ چنانچہ ایک دوست کے ہمراہ حاضر ہوا۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس موقع پر ایک لطیفہ ہوگیا: جانے کیسے، دکن کی قوموں کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے کہا یہ لوگ تو اناڑی ہیں۔ وہ ذرا چونکے اور دریافت کیا کہ کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا کہ جب آریہ لوگ یہاں آئے، تو انھوں نے یہاں کی غیر آریہ اقوام کو (ان۔ آریہ) کہنا شروع کیا، جس سے رفتہ رفتہ لفظ نایار اور نیر بنے۔ اردو والوں نے اسی کو بگاڑ کر اناڑی بنا لیا اور معنی اس کے ہوئے، وہ شخص جو کسی خاص فن میں طاق نہ ہو۔ ہنس پڑے اور کہا آپ کی اپج کی داد دیتا ہوں، لیکن خیال رکھیے، کوئی سن نہ لے۔

افسوس کہ مولانا آزاد کی زندگی میں وہ ترجمان القرآن کا ترجمہ مکمل نہ کرسکے۔ تفسیر سورۂ فاتحہ اور البقرہ کے متن اور حواشی کا ترجمہ وہ کر چکے تھے کہ مولانا چل بسے۔ یہ حصہ انھوں نے دیکھ لیا تھا اور اس پر صاد کردیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کام اس کے بعد بھی جاری رکھا اور اسے ۱۹۶۱ء میں تین جلدوں میں مکمل کرلیا۔ ان میں سے دو جلدیں شائع ہوچکی ہیں؛ اور تیسری زیرِ طبع ہے۔

ترجمان القرآن صرف پہلے ۱۸ پاروں کے ترجمے اور تفسیری حواشی پر مشتمل ہے؛ مولانا اسے

مکمل کر ہی نہیں سکے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب اسے انگریزی میں منتقل کر رہے تھے، تو انھیں اپنا وہ وعدہ یاد آیا جو انھوں نے تعلیم کے آغاز میں اپنے والد سے کیا تھا۔ اس پر انھوں نے عزم کر لیا کہ جس طرح بھی ہو پورے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر دینا چاہیے۔ ان کے ہندستانی اور یورپی دوستوں نے بھی ان سے اس کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس پر بقیہ ۱۲ پاروں کے متن کے ترجمے کا اضافہ کیا اور اسے بھی شائع کر دیا۔ ترجمے میں ان کا اصول یہ تھا کہ اصلی متن کی روح نمایاں ہو، نہ کہ محض مرادف الفاظ رکھ دیے جائیں۔ ان کا ترجمہ سب کے سامنے ہے اور صاحب نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں تک اس میں کامیاب رہے ہیں۔

اوپر جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے، ان کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مکمل فہرست درج ذیل ہے۔

1. The Influence of English Literature on Urdu Literature (1924)
2. Ghalib - A Critical Appreciation of His Life & Urdu Poetry (1927)
3. The Muslim Culture in India (1932)
4. The Muslim Problem in India (1939)
5. The Pakistan Issue - Plan of Federal Constitution of India. Congress-League reaction and Press statements (1943)
6. The Cultural Basis of a New World Order (1937)
7. An Outline of The Cultural History of India - edited and compiled (1958)
8. Address on National Integration (1967)
9. Language and National Integration (1968)
10. The Concept of Society in Islam (1937)
11. Prayers of the Prophet (1937)
12. Towards Reorientation of Islamic Thought - A fresh examination of the Hadith Literature (1954)
13. Basic Concept of the Quran (1958)
14. Bases of Islamic Culture (1959)

15. **Madras University Lectures :**
    Principles of Islamic Culture (1961)
16. **Was the Prophet of Islam Unlettered ? (1964)**
17. **The Problem of Islamic Studies in Indian Universities (1964)**
18. **The Call of the Quran (1966)**
19. **Faith and Action — The Quranic View (1967)**
20. **The Unity of Man — The Quranic View (1968)**
21. **Tarjuman-al-Quran of Mawlana Abul Kalam Azad—a rendering into English in three volumes Vol. I (1962). Vol II (1967). Vol. III under print)**
22. **Al-Quran rendered into English (1969)**
23. **The Mind Al-Quran Builds (1952) Revised edition (1971)**

اردو دان حلقوں میں ان کا نام اس مختصر کتابچے کی وجہ سے زندہ رہیگا، جو انھوں نے غالب کے عنوان سے انگریزی میں لکھا تھا (حیدرآباد ۱۹۲۸ء) بعد کو اس کا سید معین الدین قریشی کا کیا ہوا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا (حیدرآباد ۱۹۳۲ء)۔ یہ صحیح معنی میں مطالعۂ غالب کے سلسلے میں انقلابی مضمون ثابت ہوا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ غالب پر کچھ [illegible] نکتہ چینی کی۔ اردو میں غیر جانبدارانہ اور معروضی تنقید کا یوں بھی فقدان تھا (اور بدقسمتی سے اب تک ہے) اور غالب سے متعلق مبالغہ آمیز خیالات تو ہمارے ذہنوں پر بےطرح مسلط تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (وفات نومبر ۱۹۱۸ء) نے اس سلسلے میں کچھ ایسے بلند بانگ دعاوی کیے تھے کہ جو سمجھے وہ بھی اور جو نہ سمجھے وہ بھی گنگ ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر بجنوری کے مطالعے اور وسعت نظر اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی ذہانت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ "محاسن کلام غالب" میں انھوں نے غالب سے زیادہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس مضمون پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جیتے رہتے، تو ان میں توازن آجاتا اور وہ غالب کی حقیقی عظمت پر بھرپور لکھتے اور اسے ہم سے [illegible]

طریقے پر روشناس کراتے۔

خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی مختصر کتاب 'غالب' میں اسی افراط و تفریط میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی دوسری اہم کوشش غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب دینے کی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے سر اکبر حیدری کی وساطت سے نسخۂ حمیدیہ کی اصل یعنی نسخۂ بھوپال حاصل کیا اور پورے کلام کو مرتب کرکے چھاپنا شروع کردیا۔ اس کے ۱۲۶ صفحات تک چھپ چکے تھے کہ اس مطبع میں جہاں یہ چھپ رہا تھا، آگ لگ گئی اور مطبوعہ کاغذات اور ان کا تیار کردہ اصل مسودہ بھی جل کر راکھ ہوگئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس افسوسناک حادثے کے بعد دوبارہ اسے مرتب کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی؛ یوں یہ مفید کام ادھورا رہ گیا۔ خوش قسمتی سے مطبوعہ حصّے کے فرمے کسی طرح تمکین کاظمی مرحوم (م ۱۹۶۱ء) کے ہاتھ لگ گئے تھے، جو انھوں نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو بھیج دیے اور انھوں نے دیوان کا نسخۂ عرشی مرتب کرتے وقت ان سے استفادہ کیا۔ بہرحال الفضل للمتقدّم کے اصول کے مطابق ڈاکٹر لطیف ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ دیوان کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ان کے ذہن میں آیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کے اصول مرتب کر دیے، جس سے ان کے پیروں کو روشنی ملی اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

ان کی انہی علمی خدمات کے اعتراف میں ابھی پارسال یوم جمہوریہ (۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء) کے موقع پر حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔

پانچ چار سال سے ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ پہلے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ بائیں آنکھ پر عمل جراحی کرایا، جو بدقسمتی سے ناکام رہا اور آنکھ بالکل بیکار ہو کے رہ گئی۔ دوسری کی بینائی بھی بہت کم تھی اور وہ مدد کے بغیر چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کمی نہیں کی۔ قرآن کا ترجمہ انھوں نے اسی زمانے میں

مکمل کیا۔ پہلے اٹھارہ پاروں کے متن کا ترجمہ تو ترجمان القرآن کے ساتھ پورا ہو ہی چکا تھا، اب تکمیل کے لیے باقی بارہ پاروں کا ترجمہ درکار تھا۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے اگرچہ اس کے حرف شناس ضرور تھے۔ انھوں نے طریقہ کار یہ اختیار کیا کہ تین چار معاون ساتھ لیے۔ ایک قرآن کی آیت پڑھتا، دوسرا اس کے مختلف ترجمے (اردو۔ فارسی۔ انگریزی) پڑھتا، کبھی کبھی وضاحت کے لیے بعض اہم تفسیروں کا متعلقہ حصہ بھی پڑھا جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنا ترجمہ لکھوا دیتے، جو ان کے نزدیک اصل کی روح کے قریب ترین تھا۔ وہ ترجمے سے زیادہ ترجمانی کے قائل تھے۔ اگر کوئی موجودہ ترجمہ یا ترکیب ان کے معیار پر پوری اترتی تو انھیں ان معنوں کو لفظ بلفظ اپنے ہاں لے لینے میں بھی عار نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اصلی مقصود یہ تھا کہ ایک اوسط درجے کے قاری کی سمجھ میں آجائے کہ قرآن کیا کہنا چاہتا ہے۔

پچھلے سال ڈیڑھ سال سے انھیں حلق کے کینسر کی شکایت تھی۔ علاج معالجہ ہوا لیکن بیسود؛ اب خوراک تک گلے سے نہیں اترتی تھی۔ سیال چیزوں پر کوئی کہاں تک جی سکتا ہے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب آخری مرحلہ بہت دور نہیں ہے، تو چھ ماہ قبل انھوں نے کرنول میں اپنے جدِّ اعلیٰ حضرت سید عبداللطیف یاہو بادشاہ کے مزار کے جوار میں اپنی قبر کھدوائی۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی ساری عمر حیدرآباد میں بسر ہوئی، یہاں کے بھی آپ پر حقوق ہیں، آپ نے کرنول کو حیدرآباد پر ترجیح کیوں دی، تو جواب میں یہ شعر پڑھا:

> ما بفلک ماندہ ایم، یارِ ملک بودہ ایم
> باز آنجا میرویم خواجہ کہ آں شہر ماست

اپنی بیماری کے آخری ایّام میں وفات سے کوئی ایک مہینا پہلے انھوں نے "ڈاکٹر سیّد عبداللطیف قرآنک اینڈ ادر کلچرل اسٹڈیز ٹرسٹ" کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم

کیا، جس میں صرف یہ تین چار سطریں ہیں:

منکہ ڈاکٹر سیّد عبداللطیف ولد حضرت سیّد شاہ حسین صاحب مرحوم، عمر ۸۰ سال، پیشہ وظیفہ یاب پروفیسر جامعہ عثمانیہ، ساکن ۷۔۴ آغاپورہ، حیدرآباد بہ ثبات ہوش وحواس، اُس دیرینہ دلچسپی کی بنا پر جو مجھے قرآنی اور دیگر مذہبی امور سے ہے، ایک قرآنی ٹرسٹ قائم کرتا ہوں اور اپنی تمام کتابوں کے حقِ تصنیف کو اس ٹرسٹ کے حوالہ کیا ہوں۔

اس کے اخراجات کے لیے بیس ہزار روپیہ کا عطیہ بھی اپنی جیب سے دیا اور اپنی جملہ تصنیفات کا حقِ اشاعت بھی ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کسی زمانے میں ایک ادارہ اسلامیات کے لیے قائم کرنا چاہتے تھے، اور جیساکہ چودھری محمد شفیع (م۔ش) نے ڈاکٹر سید عبداللطیف کو ایک خط میں لکھا تھا، اقبال مرحوم اس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دینے والے تھے۔ ادارے کی تاسیس سے قبل اقبال رحلت فرما گئے۔ بہر حال ان کے کام کی تکمیل ڈاکٹر عبداللطیف نے کر دی، اپنی زندگی میں بھی ادارہ کے ذریعے سے اور مرنے کے بعد کے لیے یہ 'قرآنی ٹرسٹ' قائم کر کے۔ خدا کرے، اس کے کارکنوں کو اسی خلوص اور تندہی سے کام کی توفیق ملے جو ان دونوں مرحوموں کی خواہش تھی۔

آخر وہ وقت آگیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ۴ نومبر ۱۹۷۱ء (۱۴ رمضان ۱۳۹۱ھ) ساڑھے پانچ بجے صبح اپنی قیام گاہ پر جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ہوش و حواس آخری لمحے تک بجا رہے، بلکہ ان کے اردگرد لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے؛ انھوں نے خود کہا کہ اب کوئی سورۂ یٰسین کی تلاوت کرے؛ اور اس کے بعد پورے سکون سے اپنے مولائے حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

لاولد فوت ہوئے۔ لیکن ان کی اولادِ معنوی اتنی ہے، بالخصوص ان کا انگریزی ترجمۂ قرآن

کہ اس سے مستفیض ہونے والے ہمیشہ انھیں دعائے خیر سے یاد رکھینگے۔ اسی دن یعنی ۴ نومبر سہ پہر کو ۴ بجے معظم جاہی مارکیٹ کی مسجد مالاکنٹہ میں نمازِ جنازہ ہوئی، جس کی امامت مولانا ابوالوفا نے کی۔ اس کے بعد میّت کرنول گئی، جہاں ان کی وصیّت کے مطابق اگلے دن (۵ نومبر) بعد نمازِ جمعہ تدفین عمل میں آئی۔ یرحمہ اللہ تعالیٰ

مہر، مولانا غلام رسول

"۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو مولانا غلام رسول مہر کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔"

نئی نسل کے، خصوصاً وہ لوگ جو آج پچیس کے پیٹے میں ہیں، انھوں نے یہ ایک سطری خبر پڑھی یا سنی ہوگی۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ غلام رسول مہر کون تھے اور انھوں نے اردو صحافت کی خصوصاً اور علم و ادب کی عموماً کیا خدمت کی!

مولانا غلام رسول مہر ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء کو جالندھر سے کوئی چار میل دور، ایک چھوٹے سے گاؤں پھولپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قریب کے ایک اور گاؤں میں ہوئی۔ اس کے بعد جالندھر شہر کے مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا یہاں انھوں نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اب وہ لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج سے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کیا۔ وہ ابھی انٹر کے درجے میں تھے کہ مولانا ابو الکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۲ء میں اپنا شہرہ آفاق ہفتہ وار الہلال کلکتہ سے جاری کیا۔ مہر صاحب اس سے پہلے شعر کہنے لگے تھے اور مذہبی اور سیاسی مطالعے میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی الہلال کے خریدار

بن گئے اور یہ پرچہ مسلسل ان کے مطالعے میں رہنے لگا۔

مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعے سے ملک کی عام سیاسی بیداری میں عموماً اور مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں خصوصاً جو اہم رول ادا کیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریز دوستی اور کانگریس دشمنی کا جو سبق دیا تھا، وہ اس وقت تک اس ملک میں اسلامی سیاست کا اصلِ اصول بنا ہوا تھا۔ اس کے خلاف پہلی آواز مولانا ابوالکلام آزاد نے بلند کی۔ ان کا اسلوبِ تحریر، اور اپنے نظریات کی تائید میں قدم قدم پر نصِّ حدیث سے استدلال ایسا برجستہ اور بدیع تھا کہ اس نے گویا آگ لگادی۔ نوجوان طبقہ الہلال پر دیوانہ وار فریفتہ ہوگیا۔ غلام رسول مہر بھی الہلال اور صاحبِ الہلال کے والہ و شیدا بن گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی تنظیم کے لیے ایک جماعت 'حزب اللہ' بنائی تھی اور اس کے اراکین کی تربیت کے لیے 'دارالارشاد' قائم کیا تھا۔ غلام رسول مہر بھی 'حزب اللہ' اور 'دارالارشاد' کے رکن بن گئے۔ ان تمام اراکین کے نام ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے۔ مہر صاحب نے مولانا آزاد سے جو تعلق اپنی نوجوانی میں قائم کیا تھا، اسے اپنے آخری دم تک نباہا۔ اس دوران میں کیسے کیسے سیاسی زلزلے اور نظریاتی ہنگامے نہیں ہوئے لیکن ان کے پائے ارادت کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ مولانا کے عاشق تھے اور کبھی ان کا نام حضرت اور رحمۃ اللہ علیہ کے اضافے کے بغیر نہیں لیتے تھے۔

مہر صاحب نے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کرلیا، تو انھیں حیدرآباد (دکن) میں ملازمت مل گئی۔ وہ وہاں پائیگاہ وقارالامراء میں انسپکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر اتحادی قوتوں کا ترکی کے خلاف رویہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بہت تشویش کا باعث رہا تھا۔ مہر صاحب نے حیدرآباد کے بعض دوستوں کے مشورے سے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا، "سلطنت" اس کا نام تجویز ہوا اور انھوں

نے اجرا کے لیے درخواست دے دی۔

ادھر مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بنگال سے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ چونکہ بہار کے علاوہ بیشتر دوسری صوبائی حکومتیں پہلے سے ان کے اپنے ہاں داخلے پر پابندی عائد کر چکی تھیں، اور سب راستے مسدود پا کر وہ رانچی چلے گئے اور تین چار مہینے بعد وہیں ان کی نظربندی کا حکم صادر ہو گیا۔ ان کے کلکتے سے نکلنے پر حکومت نے ان کے گھر اور دفتر کی تلاشی لی، اور ان کے تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ انھیں میں "حزب اللہ" کے اراکین کا رجسٹر بھی تھا، جس میں من جملہ اور اصحاب کے مہر صاحب کا نام بھی درج تھا۔ یہ سب لوگ حکومت کی نظر میں مشتبہ اور خطرناک قرار پائے اور ان سے متعلق پوچھ گچھ ہونے لگی۔ شدہ شدہ مہر صاحب کا کھوج بھی نکلا، اور رپورٹ ملی کہ ان دنوں یہ حیدرآباد میں ہیں اور ایک اخبار "سلطنت" نکالنے کے لیے ان کی ڈکلیریشن کی درخواست زیر غور ہے۔ حکومت جو مولانا آزاد کے اخبار الہلال ہی کے اثرات سے جز بز ہو رہی تھی، بھلا ان کے کسی مرید کے اخبار کی اجازت کیوں دینے لگی تھی چنانچہ ان کی درخواست رد کر دی گئی۔ اس سے تھوڑے دن بعد ہی ۱۹۲۰ء میں مہر صاحب حیدرآباد سے وطن واپس آئے۔

مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کو اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار سے روزانہ بنایا تھا۔ ظفر علی خان اردو صحافت کا ایک اور درخشندہ نام ہے۔ ان کا اخبار زمیندار گویا اردو صحافت کی درسگاہ تھا۔ بھلا جس اخبار میں مختلف اوقات میں عبداللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتحپوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان میکش، نصراللہ خان عزیز نے کام کیا ہو اور وہاں سے الگ ہونے کے بعد زندگی بھر کامیاب صحافتی گزاری ہو، اس اخبار کو صحافت کی درسگاہ کے سوائے اور کس نام سے یاد کیا جائیگا؟ اور ان اصحاب میں سے کس کا نام اردو صحافت میں فراموش کیا جا سکتا ہے؟

یہ حقیقت ہے کہ ظفر علی خاں بنیادی طور پر ادبی آدمی تھے۔ وہ اگر سیاست کے خارزار میں نہیں پھنس گئے ہوتے، اور یکسوئی سے علم و ادب اور صحافت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہتے، تو آج اردو کا دامن کیسے کیسے گلہائے رنگ رنگ سے معطر اور مشکبو ہوتا۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہی بات حسرت موہانی اور مولانا محمد علی پر اور شاید کسی حد تک مولانا ابو الکلام آزاد پر بھی صادق آتی ہے۔ کون بتا سکتا ہو کہ ان اصحاب کی شکل میں اردو ادب نے کتنی بڑی قربانی دی ہے، سیاست کی بارگاہ پر!

۱۹۲۰ء میں مولانا ظفر علی خان نے اصرار کر کے عبد المجید سالک کو زمیندار میں آنے کی دعوت دی۔ سالک صاحب اس وقت مولوی سید ممتاز علی (امتیاز علی تاج کے والد) کے رسالوں تہذیبِ نسواں اور پھول کے ایڈیٹر تھے۔ سالک کو انکار کرتے نہ بنی؟ اور وہ زمیندار سے وابستہ ہوگئے۔ تھوڑے ہی دن بعد ان کا نام سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپنے لگا اور وہ اس کے اداریے لکھنے لگے۔ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء کا زمانہ ہماری تحریکِ آزادی کے آغاز کا زمانہ تھا اور شباب کا بھی۔ عدم تعاون کی تحریک پورے زور شور سے چل رہی تھی۔ حکومت بھی اپنے پورے لاؤ لشکر سے اس کے مقابلے پر کھڑی ہوگئی تھی۔ ادھر کسی نے حکومت کے خلاف کوئی بات کہی یا لکھی، اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔

پنجاب میں روزنامہ زمیندار خاص طور پر حکومت کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ ظفر علی خان گرفتار ہوئے، ان کے بیٹے اختر علی خان گرفتار ہوئے، یہی اب سالک صاحب کے ساتھ پیش آیا۔ انھوں نے ایک اداریہ لکھا، جو حکومت کی نظر میں قابلِ اعتراض ٹھہرا چنانچہ وہ گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لیے جیلخانے بھیج دیے گئے۔

مہر صاحب حیدرآباد سے واپس آکر خلافت تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے اور اس کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نکالنے کی بھی فکر میں تھے۔ سالک کے جیل چلے جانے کے بعد زمیندار کے منیجر جو مہر صاحب کے دوست تھے، ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آیئے اور

زمیندار کی باگ ڈور سنبھالیے۔ انھوں نے بھی خیال کیا کہ اگر ذاتی اخبار نکالنے سے پہلے کسی دوسرے پرچے میں کچھ تجربہ حاصل ہو جائے، تو یہ مفید رہیگا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں مہر صاحب زمیندار کے ایڈیٹر بن گئے۔ لیکن وہ یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکے۔ پکڑ دھکڑ کا زمانہ تھا، اور زمیندار تو خاص طور پر معتوب سرکار تھا۔ ممکن ہے، حکومت نے اپنے کل پرزوں کے ذریعے سے بھی دباؤ ڈالا ہو۔ بہرحال مہر صاحب کے خاندان کے بزرگ لاہور آئے اور انھوں نے اصرار کیا کہ وہ زمیندار کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیں اور واپس اپنے وطن چلیں۔ مہر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد ہی حکومت نے زمیندار کی مالی ضمانت ضبط کر لی، جس پر (عارضی طور پر) اس کی اشاعت بالکل بند ہو گئی۔

تین چار مہینے بعد زمیندار پھر جاری ہو گیا۔ اب کے اخبار کے کرتا دھرتا مہر صاحب کے گاؤں پہنچے اور ان کے خاندان والوں کو قائل معقول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پر مہر صاحب دوبارہ زمیندار کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سالک صاحب بھی قید کاٹ کر رہا ہوئے اور آکر ان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ مہر و سالک کا یہ قران السعدین روزنامہ زمیندار کا تو خیر ہے ہی، اردو صحافت کا بھی زرّیں دَور ثابت ہوا۔ مہر کے سنجیدہ، متین، مدلل اداریوں کی اور سالک کے افکار و حوادث میں ہمارے تمام قومی مسائل پر طنز و مزاح کے انداز میں تبصرے کی دھوم مچ گئی۔ بہت لوگوں نے ان کی نقل کی۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

مارچ ۱۹۲۷ء کے آخر میں مہر و سالک نے بوجوہ زمیندار سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اخبار کے بیشتر عملے نے بھی ان کا ساتھ دیا؛ ان میں ادارتی شعبے اور کاتب تک سب شامل تھے۔ شروع میں ان کا اپنا نیا اخبار جاری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن عملے کے آجانے سے وہ مجبور ہو گئے کہ ان کے روزگار کا مسئلہ تھا۔ اب ان کے لیے اخبار

نکالنے کے سوائے کوئی چارہ کار نہ رہا۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۲۷ء کو روزنامہ انقلاب جاری ہوا۔ جن اصحاب کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس سے نظریاتی اختلاف کے باوجود اعتراف کرینگے کہ انقلاب نے صحافتی معیار سے کمتر کبھی کوئی بات نہیں کی۔
مہر نے یورپ اور مغربی ایشیا کے بیشتر ممالک کے سفر کیے تھے۔ اور وہاں کے کئی اکابر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر ان کی گہری نظر تھی جو ایک روزنامہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔
۱۹۴۷ء میں آزادی آئی۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ ایک کی جگہ دو ملک وجود میں آئے۔ مہر و سالک نے دیکھا کہ تبدیل شدہ حالات آزاد صحافت کے لیے سازگار نہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ اپنی آزادیٔ رائے بھی قائم رکھیں اور حکومت بھی ہم سے خوش رہے، تو یہ ناممکن ہے۔ چونکہ آزادیٔ ضمیر ان کے نزدیک خوشنودیٔ حکومت سے عزیز تر تھی، انھوں نے انقلاب کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو انقلاب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ایک کامیاب، بااثر و رسوخ، نفع مند اخبار کو اصول کی خاطر بند کر دینے کی ایسی اور مثال شاید ہی کہیں مل سکے!

اس کے بعد مہر صاحب نے براہِ راست سیاست سے بہت کم تعلق رکھا۔
ان کی کتاب "غالب" پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے غالب کے خطوط اور دوسری تحریروں کے اقتباسات کو اس طرح سے مرتب کیا ہے کہ اس سے کم و بیش غالب کی پوری سوانحعمری سامنے آگئی ہے۔ یہ کتاب ان کے غالب سے متعلق ایک بڑے پروگرام کا حصہ تھی، جو ان کی اور اور سرگرمیوں کے باعث ادھورا رہ گیا۔ لیکن اہلِ نظر مجھ سے اتفاق کرینگے کہ جو کچھ ہو گیا، وہ بھی بہت قابلِ قدر ہے۔ پچھلے ۳۵ برس میں غالب پر بہت کام ہوا ہے اور اس کی بعض اچھی سوانحعمریاں وجود میں آئی ہیں۔ اس کے باوجود مہر کی 'غالب' کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوئی اور غالب کا

کوئی سنجیدہ طالبعلم اس کے مطالعے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلے میں بہت بعد کو انھوں نے اردو خطوطِ غالب بھی دو جلدوں میں مرتب کیے تھے ان کے ساتھ مکتوب الیہم کے حالات اور مفید حواشی کا اضافہ کیا، جس سے ان کا افادہ وسیع تر ہو گیا۔

صحافت سے دستکش ہو کر انھوں نے اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر لیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی کے حالات جمع کرنا شروع کیے تھے۔ اب فرصت مہیا ہوئی، تو انھوں نے اس کتاب کی تکمیل پر توجہ کی۔ ۱۸ سال کی محنت شاقّہ اور تلاش و تحقیق کے بعد اسے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے انھوں نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی اور کون کون سے کنوئیں نہیں جھانکے۔ حضرت سیّد احمد شہید کی تحریک کے بقیۃ السیف افراد کو ریاست ٹونک میں پناہ ملی تھی۔ ان اصحاب کے باعث تحریک سے متعلق بہت قلمی لٹریچر ٹونک کے سرکاری کتب خانے میں جمع ہو گیا تھا۔ مہر صاحب اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے مولانا آزاد نے وہاں سے منگوا کر انھیں دیا تھا۔

بعد کو انھوں نے حضرت شہید کے رفیقوں کے حالات بھی جمع کر کے "سرگزشت مجاہدین" کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کے کوائف "انقلاب ۱۹۵۷ء" کے نام سے شائع کیے۔

غالب کے بعد ان کا دوسرا پسندیدہ موضوع اقبال تھا۔ ان کے اقبال کے ساتھ بہت زمانے کے تعلقات تھے، بلکہ ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع بھی ملے تھے۔ جب ۱۹۳۱ء میں اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے ہیں، تو مہر بھی ان کے ساتھ تھے۔ واپسی پر بھی دونوں یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے ایک ساتھ مؤتمر اسلامی، یروشلم کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ مہر صاحب کہا کرتے تھے کہ اقبال کا صرف

نصف یا ایک تہائی کلام شائع ہوا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اقبال نے اپنی کئی نظمیں یا شعر اس لیے شائع نہیں کیے یا کسی مجموعے میں شامل نہیں کیے کہ ان کے خیال میں یہ ان کے معیار سے فروتر تھے یا ان کے عام طرزِ فکر سے میل نہیں کھاتے تھے۔ چونکہ مہر مدتوں ان کے ساتھ رہے تھے، اس لیے اس طرح کا وافر کلام ان کے پاس جمع تھا۔ وہ اسے توضیحی حواشی کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ خدا معلوم، اب اس ذخیرے کا کیا حشر ہوتا ہے! انھوں نے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم مجموعوں کے مطالب و معانی سے متعلق مستقل مصنّفات چھوڑی ہیں۔ ایک کتاب اقبال کی سوانح سے متعلق بھی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے بچّوں کے ادب پر خاصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں ان کی چھوٹی بڑی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، کوئی پچاس کتابیں ہونگی۔ انھوں نے ترجمے بھی کیے۔ اس میں زیادہ توجہ تاریخِ اسلام پر رہی۔ عجیب ہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔ لیکن ترجمہ ہو کہ تالیف، سوانح ہو کہ تاریخ، سیاست ہو یا مذہب، ادب ہو یا شعر۔ غرض کوئی میدان ہو، وہ کسی قسم کی گھٹیا بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جو بھی کہی اور جب بھی کہی، ایسی کہ سننے والے کو اس سے شرم محسوس ہوئی، نہ خود انھیں کبھی بعد کو اس کے باعث ندامت۔

صحت کی طرف سے کبھی شکایت نہیں کی۔ سرخ و سفید رنگ، بلند بالا، ورزشی متناسب جسم۔ وہ اپنی عادات میں بہت باقاعدہ تھے۔ مسلم ٹاؤن میں ان کا اپنا مکان تھا۔ نہر یہاں سے بہت قریب ہے۔ گرمی سردی ہر موسم کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد نکل پڑتے۔ نہر کے کنارے کنارے کوئی دو میل چلے جاتے۔ اس طرح روزانہ کم و بیش چار میل کا اوسط تھا۔ واپس آکر ناشتہ کرتے اور اس کے بعد کام کی میز پر بیٹھ جاتے۔ بارہ بجے تک نوشت و خواند کا مشغلہ رہتا۔ یہاں سے اٹھتے تو دوپہر کا کھانا کھاتے اور پھر تھوڑی دیر

قیلولہ کرتے۔ تین بجے دوبارہ مطالعے کی میز پر پہنچ جاتے اور چھ بجے تک مشغول رہتے۔ پھر شام کی سیر اور اس سے واپسی کے بعد کا وقت احباب کے لیے وقف تھا۔ یا وہ ان کے وہاں آجاتے یا یہ کسی کے وہاں چلے جاتے۔ رات کا کھانا کھا کر جلد سو جانے کے عادی تھے۔

ایسی منظم زندگی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ موت اچانک ہوئی۔ منگل کے دن ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء (۲۶ رمضان ۱۳۹۱ھ) کو علی الصباح حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن سہ پہر کو مسلم ٹاؤن ہی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ راغب مرادآبادی کے قطعۂ تاریخ کے آخری مصرع سے عیسوی تاریخ نکلتی ہے۔ یہ ہے:

نژادِ قدس و وقارِ وطن غلام رسول
(۱۹۷۱)

وہ ہنوز کالج کے طالب علم تھے کہ ۱۹۱۴ء میں ان کی شادی ہوئی۔ لیکن چار پانچ سال بعد یہ بیگم دو خرد سال بچے اپنی یادگار چھوڑ کر انھیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ دوسرا نکاح انھوں نے بہت دن بعد ۱۹۲۹ء میں کیا۔ اس خاتون سے ان کے دس بچے پیدا ہوئے۔ وفات کے وقت ان کے گیارہ بچے موجود تھے۔ چھ بیٹے (عبدالسلام اسلم، فاروق شاہین، اکرم، جاوید سلطان، طارق، امجد سلیم) اور پانچ بیٹیاں۔ پانچ بڑے بیٹے برسرِ روزگار ہیں، سب سے چھوٹے امجد سلیم بی اے کے طالبعلم ہیں۔ تین بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے گھر بار کی ہیں، دو ہنوز ناکتخدا ہیں۔

میرے ان کے ۱۹۲۶ء سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ۴۵ برس تھوڑی مدت نہیں ہوتی۔ غالب نے مومن کے انتقال پر کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ۴۰ برس سے جانتے تھے، حضرت ۴۰ برس کا تو دشمن بھی نہیں ملتا، دوست کا کیا ذکر! میں مہر کے لیے کیا کہوں۔ میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا۔ نیکی اور شرافت کا نمونہ، دوست پروری اور وضعداری کی مثال:

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

سیّدین، خواجہ غلام السیّدین

ان کا سلسلۂ نسب حضرت رسول کریم صلعم کے مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ یہ اور اردو شاعری کے مجدّد خواجہ الطاف حسین حالی (ف دسمبر ۱۹۱۴ء) ہمجدی تھے۔
مولانا حالی نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے خواجہ ملک علی ہروی، عہدِ غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ - ۱۲۸۷ء) میں ہندستان آئے۔ حکومتِ وقت نے ان کی مناسب آؤبھگت کی۔ جاگیر اور پانی پت کی قضاۃ کے علاوہ انھیں منڈی میں مختلف اجناس کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ لیکن یہ سارا جاہ و مال بہت مدّت سے ختم ہو چکا تھا اور سیّدین کے باپ دادا تک خاندانی نیکنامی اور عزّت و شرف کے سوائے اس میں سے کچھ نہ پہنچا۔
سیّدین کے دادا خواجہ غلام عبّاس کا نکاح مولانا حالی کی بھانجی سے ہوا تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ غلام الحسنین، غلام الثقلین، غلام السبطین۔ سب سے بڑے غلام الحسنین قابلِ ذکر عالمِ دین اور مصنّف تھے۔ انھوں نے ہربرٹ اسپنسر کی مشہور کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" کے عنوان سے اردو میں کیا تھا۔ میں نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں ان کے

بعض مذہبی رسالے اور ایک آدھ مناظرے کی کتاب دیکھی تھی۔ ان کا ۱۹۲۸ء میں لاولد انتقال ہوا۔

سب سے چھوٹے خواجہ غلام السبطین تجارت اور ملازمت کرتے رہے۔ ہماری زبان کے نامور افسانہ نگار اور ناول نویس اور فلم ساز خواجہ احمد عباس انھیں کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں رحلت کی۔

خواجہ غلام الثقلین صحیح معنوں میں فخرِ خاندان تھے۔ وہ ۱۸۷۵ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ ۱۸۸۴ء میں وہ حالی کے ساتھ دلّی آئے۔ پانچ برس بعد یہاں گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ یہی زمانہ تھا جب انھوں نے 'النظر فی التاریخ' کے عنوان سے کوئی ۲۰ صفحات کا مضمون حیدرآباد کے مشہور ماہنامے 'حسن' میں چھپنے کو بھیجا۔ یہ مضمون 'حسن' کے معیار کے مطابق قابلِ انعام ٹھہرا اور انھیں ایک اشرفی انعام میں ملی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ برس سے متجاوز نہیں تھی۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۸۹ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا، اور چار سال بعد ۱۸۹۳ء میں (بعمر ۲۰ برس) بی اے اور پھر ۱۸۹۵ء میں قانون کے امتحان پاس کیے۔ ۱۸۹۶ء کے شروع میں وہ ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہو گئے۔ وہاں وہ پانچ برس سے کچھ زیادہ رہے۔ ۱۹۰۱ء میں وطن واپس آئے اور میرٹھ میں وکالت شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کے جشنِ تاجپوشی کے موقع پر دسمبر ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہز ہائی نس سر آغا خان کی زیرِ صدارت دلّی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر خواجہ غلام الثقلین نے "اصلاحِ تمدّن" (سوشل ریفارم) سے متعلق ایک تقریر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس نے اپنی سرگرمیوں میں اس موضوع کا اضافہ کر دیا؛ اور اس کے لیے الگ شعبہ قائم کر کے خواجہ غلام الثقلین ہی کو اس کا سکرٹری بنا دیا۔ انھوں نے پورے خلوص سے اس شعبے کا پیغام گھر گھر پہنچانے

کے لیے جنوری ۱۹۰۳ء میں اپنا مشہور رسالہ "عصرِ جدید" جاری کیا، جو پہلے ماہنامہ اور بعد کو ہفتہ وار شایع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف شہروں کے دورے کیے، تقریریں کیں، نیز اس تحریک کے مقاصد کی تشریح کے لیے ایک کتاب بھی تصنیف کی، جس کا نام "مضامینِ اصلاح و ترقی" تھا ــــ یہ بیشتر مفت تقسیم کی گئی تھی۔

وہ اعتقاداً شیعی تھے اور شیعہ کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں سنی شیعہ فرقوں کے اختلاف اور کشمکش سے بہت رنج تھا۔ انھوں نے بساط بھر دونوں گروہوں میں صلح صفائی اور یکجہتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ علمائے کرام نے انھیں اپنے تعاون سے محروم رکھا!

۱۹۰۹ء کے انتخاب میں وہ صوبائی کونسل کی رکنیت کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے، جو ان سے کہیں زیادہ باثر و رسوخ تھے؛ لہذا وہ ہار گئے۔ لیکن وہ اس سے حوصلہ نہیں ہارے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور اب کے اپنے مدمقابل خان بہادر سید آل نبی وکیل و رئیس آگرہ کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے۔ اکثر ان کے نام کے ساتھ "آنریبل" لکھا جاتا ہے؛ یہ اسی انتخابی کامیابی کا نتیجہ ہو۔

لیکن افسوس، اب ان کی صحت خطرناک حد تک خراب رہنے لگی۔ اگر وہ احتیاط کرتے اور مناسب طریقے پر علاج ہوتا، تو شاید تندرستی بحال ہو جاتی۔ لیکن ایمان کی حرارت اور قوم کی زبوں حالی کی اصلاح کا جذبہ انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ کثرتِ کار، لمبے لمبے اندرون و بیرون ملک سفروں کی کوفت، اور ذہنی تشویش نے انھیں قبل از وقت موت کے منہ میں ڈھکیل دیا۔ جسم ان کی روح کا ساتھ نہ دے سکا، اور تندیِ صہبا سے یہ آبگینہ پگھل گیا۔ بروز جمعہ ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء رات کے دس بجے اس مجاہدِ قوم کا حرکت قلب بند ہو جانے سے پانی پت میں انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اٹھا، اور عیدگاہ کے متصل درگاہ میراں جی میں سپردِ خاک ہوئے۔ صرف ۴۳ برس کی عمر پائی۔

بھلا یہ کوئی مرنے کی عمر تھی!

ان کا نکاح مولانا حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین (ف ۱۹۲۲ء) کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ سے ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑے: مختار فاطمہ، غلام السیدین، سیدہ خاتون، اظہر عباس، مصداق فاطمہ۔ مختار فاطمہ کا نکاح سید مستحسن زیدی سے ہوا تھا۔ سیدہ خاتون کا عین عنفوانِ شباب میں ۱۹۲۹ء میں انتقال ہو گیا۔ حالی کے مختصر مجموعۂ سخن 'جواہراتِ حالی' میں ایک چھوٹی سی مثنوی ان سے متعلق ملتی ہے۔ سیدین کی کتاب 'آندھی میں چراغ' میں بھی ایک مضمون ان سے متعلق موجود ہے۔ خواجہ اظہر عباس ابھی چار برس ہوئے ۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ مصداق فاطمہ بحیثیت ادیب و مصنف صالحہ عابد حسین کے نام سے مشہور و معروف ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

خواجہ غلام السیدین، جنھیں ان کے سب احباب 'سیدین' کے نام سے جانتے ہیں، مرحوم خواجہ غلام الثقلین کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۴ء کے دن پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تربیت اپنے والد اور نانا (حالی) کی نگرانی میں ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن مجید ختم کیا؛ اس کے ساتھ علم تجوید و قرأت کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ان کی انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اور پھر علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۲۳ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ اس سال اپنی یونیورسٹی سے بی اے کے واحد طالب علم تھے؛ اس امتحان میں وہ درجۂ اول میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں یوپی کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر مسٹر میکنزی تھے، وہ ان کے نتیجے اور خاص طور پر انگریزی میں غیر معمولی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی سفارش پر حکومت نے انھیں وظیفہ عطا کیا اور یہ ولایت چلے گئے۔ وہاں لیڈز یونیورسٹی سے پہلے تعلیم و تدریس کی سند (ڈپلوما) اور پھر ۱۹۲۵ء میں ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی

سال کے آخر میں وہ ہندستان واپس آئے۔

واپسی پر اوّل علی گڈھ ٹریننگ کالج میں ریڈر مقرر ہوئے۔ تھوڑے دن بعد حبیب الرحمن صاحب صدر شعبہ کہیں باہر گئے، اور یہ ان کی جگہ پر لگ گئے۔ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ۱۹۲۷ء میں انھیں کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ ترقی کر کے پروفیسر ہوگئے۔ اتنی کم عمر میں شاید ہی کوئی اور پروفیسر بنا ہو۔ وہ اس کالج میں ۱۹۳۸ء تک رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ریاست کشمیر کی حکومت نے ان کی خدمات حاصل کرلیں اور وہ مدیر محکمۂ تعلیم کے عہدے پر وہاں چلے گئے۔ کشمیر میں وہ ۱۹۴۵ء تک رہے۔ اب ان کی ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے ملک میں شہرت ہو چلی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ریاست رامپور نے انھیں اپنے ہاں بلا لیا۔ وہ دو برس تک رامپور میں مشیرِ تعلیم رہے۔ آزادیِ ملک پر جب ریاست جمہوریۂ ہند میں شامل ہونے والی تھی، تو ان کا عہدہ بھی تخفیف میں آگیا۔ جب مئی ۱۹۴۷ء میں وہ یہاں سے سبکدوش ہوئے، تو حکومتِ بمبئی نے اسی عہدے پر انھیں اپنے ہاں مقرر کر دیا۔

انھوں نے صوبۂ بمبئی کے تعلیمی نظم و نسق میں ایسی خوشگوار اصلاحات کیں کہ شدہ شدہ حکومتِ ہند تک ان کی خبر پہنچی۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد وزیرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں بلا کر مرکزی وزارتِ تعلیم میں مشیر اور جائنٹ سکرٹری کے عہدے پر فائز کر دیا۔ (اس زمانے میں سکرٹری ڈاکٹر تاراچند تھے) ۱۹۵۴ء میں ان کے بعد پروفیسر ہمایوں کبیر (ف ۱۸ اگست ۱۹۶۹ء) سکرٹری ہو کر آئے، تو سیّدین ایڈیشنل سکرٹری مقرر ہوئے اور تین سال بعد ان کے مستعفی ہونے پر، ۱۹۵۷ء میں سکرٹری بن گئے۔ یہیں سے ۱۹۶۱ء میں پنشن پر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ یہاں سے فراغت پائی، تو حکومتِ کشمیر نے انھیں دوبارہ اپنے ہاں دوبارہ بلا لیا۔ لیکن اب ماحول دوسرا تھا۔ حکومت کے کل پرزے انھیں اپنے مصالح کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سیّدین کو یہ مداخلت پسند نہیں تھی۔ اب کے وہ سال بھر سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکے اور ۱۹۶۲ء کے شروع میں مستعفی ہو گئے۔

اپنی ملازمت کے دوران میں (۱۹۵۸ء) وہ دعوتی پروفیسر کی حیثیت سے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک گئے تھے۔ اب جو ملازمت کا جوا گلے سے اترا، تو بیرون ملک کی مختلف یونیورسٹیوں نے اپنے ہاں مدعو کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ وسکانسن یونیورسٹی (امریکا) گئے (۱۹۶۲ء - ۱۹۶۳ء)۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء - ۱۹۶۴ء کا ایک سال ہوائی یونیورسٹی میں گذرا۔ یہاں وہ مرکز برائے شرق و غرب میں سینیر اسکالر بن کر گئے تھے۔ ہوائی ہی سے ۱۹۶۴ء میں وہ سٹان فورڈ یونیورسٹی گئے اور اسی سال کے آخر میں وہاں سے واپس آئے، تو یہاں حکومت ہند ایک تعلیمی کمیشن کی تشکیل کا منصوبہ مکمل کر چکی تھی؛ انھیں بھی اس کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ وہ اس عہدے پر دو برس (۱۹۶۶ء تک) رہے۔ کمیشن کا کام ختم ہوا، تو یہاں دلّی میں ایک سرکاری تعلیمی اور انتظامی معاملات کے ادارے کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۶۹ء میں الگ ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں شکاگو یونیورسٹی نے دنیا بھر سے آٹھ ماہرین تعلیم کا انتخاب کر کے انھیں امتیازی خدمات کا تمغہ دیا تھا۔ ہندستان کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ان آٹھ میں سے ایک ذات سیدین صاحب کی تھی۔ وہ شکاگو سے جون ۱۹۷۰ء میں وطن لوٹے تھے۔ اگر ہم گنوائیں کہ وہ یہاں ہندستان میں اور بیرونی ممالک میں کون کونسی یونیورسٹیوں اور اداروں کی منتظمہ یا عاملہ کے رکن رہے، تو یہ طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں سیدین صاحب کا ہاتھ رہا ہے۔ انھوں نے پس پردہ رہ کر خاموشی سے اس میدان میں جو خدمات سرانجام دی ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ملک سے باہر جس ادارے سے وہ بہت دن تک وابستہ رہے، وہ یونسکو ہے۔ وہ اس کی مرکزی سرگرمیوں سے مختلف سطح پر منسلک رہے اور اس کی طرف سے انھوں نے بعض ممالک کا دورہ بھی کیا۔

تمکین صاحب کو اردو اور انگریزی۔ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ (یوں وہ فارسی اور عربی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتے تھے) ان کی اردو نثر بڑی جاندار اور شگفتہ ہے۔ بظاہر ایسی سہل ممتنع کہ قاری خیال کرے کہ ایسی نثر لکھ لینا کیا مشکل ہے! لیکن لکھنے بیٹھے، تو دانتوں پسینہ آجائے اور اسے معلوم ہو کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ تحریر کے علاوہ وہ تقریر کے بھی مرد میدان تھے، اور ان کی یہ صلاحیت کا ملاً خداداد تھی۔ رشید احمد صدیقی نے کسی جگہ ان کی ۱۹۱۶ء کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے۔ جو انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڈھ کے موقعہ پر اسٹریچی ہال میں کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس کی تھی اور اس کمسنی کے زمانے میں یہ تقریر انھوں نے اس اطمینان اور وقار سے کی تھی کہ سننے والے بہت دن تک اس کا چرچا کرتے رہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی زندگی میں بعض بڑے بلند پایہ اور طلیق اللسان مقررون کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ میں بلاخوف تردید، پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ قدرت زبان، لہجے کی متانت۔ انداز و اسلوب خطاب، موضوع کے مالہ، وما علیہ سے پوری واقفیت، دلائل کی قوت، اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت، سامع کی تشفی اور اطمینان۔ غرض ان تمام باتوں میں جو کسی اچھی اور کامیاب تقریر کا مابہ الامتیاز ہیں، تمکین کسی سے کم نہیں تھے۔ گفتگو میں بھی ان کا یہی انداز تھا بلکہ یہاں ہلکا سا مزاح کا پہلو سونے میں سہاگے کا کام دیتا تھا۔ وہ کبھی جارحانہ رویہ نہیں اختیار کرتے تھے۔ نرم لہجے میں، وثوق سے، اپنا عندیہ پیش کرنے میں کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق انھوں نے ورثے میں پایا۔ ان کے خاندان نے علم و ادب کی ترقی و ترویج اور قوم کی ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت میں جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، اور یہاں ان سے متعلق کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں، نہ یہ ممکن ہی ہے۔ تمکین نہ صرف ان اقدار عالیہ کے وارث تھے، بلکہ

انھوں نے اپنی زندگی کو، اپنے گفتار وکردار کو، ان اصولوں کے مطابق ڈھال کر اپنے ہمعصروں کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا۔ ان کا موضوع سخن تعلیم تھا۔ وہ ساری عمر معلم رہے۔ سقراط سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے روزمرہ کی گفتگو کے ذریعے سے اپنے عہد کے نوجوانوں کو جو آگے چل کر یونانی قوم کے کرتادھرتا بننے والے تھے سکھایا کہ اچھا آدمی اور اچھا شہری کہلانے کا مستحق کون ہے اور کسی شخص کو اس لفظ "اچھا" کا مصداق بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ سیدین کا مطمح نظر بھی ساری عمر یہی رہا۔

وہ اقبال کے عاشق تھے، اور اقبال کا بیشتر کلام انھیں یاد تھا۔ وہ تحریر و تقریر میں بلکہ عام گفتگو میں بھی عموماً اقبال کے اشعار استدلال یا موضوع کی وضاحت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے "اقبال کا تعلیمی فلسفہ" کے عنوان سے ایک کتاب بھی انگریزی میں تصنیف کی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں لاہور سے چھپی تھی۔ نظر ثانی اور اضافے کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں چھپا۔ اس موضوع پر آج تک یہ واحد کتاب ہے۔

ان کی بیشتر کتابیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ اردو میں مندرجۂ ذیل عنوانات ہیں:

روح تہذیب (دلی ۱۹۳۲ء)؛ اصول تعلیم (ہندستانی اکاڈمی، الہ آباد ۱۹۴۹ء)؛ علی گڈھ کی تعلیمی تحریک (۱۹۳۵ء) قومی سیرت کی تشکیل (۱۹۳۸ء)؛ شہید وفا بدایوں ۱۹۳۴ء)؛ آندھی میں چراغ (دلی ۱۹۶۲ء)؛ ذہن انسانی کا ارتقا (نظام لیکچر، دلی یونیورسٹی ۱۹۶۶ء) زبان، زندگی اور تعلیم (انجمن ترقی اردو، علی گڈھ ۱۹۷۱ء)؛

آندھی میں چراغ پر انھیں ۱۹۶۴ء میں ساہتیہ اکاڈمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ آخری کتاب (زبان، زندگی اور تعلیم) زیر طبع تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور یہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ یہ ان کی وفات کے کوئی ہفتہ بھر بعد شائع ہوئی۔ انگریزی کی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں کی تعداد ۲۸ ہے۔

ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں مادرِ علمی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ء میں انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔ ان کے احباب نے ایک مجموعۂ مضامین بعنوان ارمغانِ الفت ان کی ساٹھویں سالگرہ پر ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ان کی نذر کیا تھا، اس کے مرتب ڈاکٹر سید عابد حسین ہیں اور یہ کتاب صدرِ جمہوریۂ ہند ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کے ہاتھوں پیش کی گئی تھی۔ حکومتِ ہند نے ۱۹۶۶ء میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی سرفراز کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ وہ ہنوز بسلسلۂ ملازمت بمبئی میں تھے کہ انھیں دل کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ یہیں ۱۹۵۰ء میں پہلا دورہ پڑا۔ لیکن اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کوئی نمایاں کمی نہیں کی۔ حسبِ معمول اپنے کام کاج میں لگے رہے۔ لمبے لمبے بری اور ہوائی سفر بھی کرتے رہے، چنانچہ ۱۹۵۰ء ہی میں وہ یونسکو کے کسی کام سے عراق گئے ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں۔ میں ان ایام میں بغداد میں مقیم تھا۔ میری ان سے پہلی ملاقات وہیں بغداد میں ہوئی۔ ان گزشتہ بیس بائیس برس میں ہمارے تعلقات میں بہت گہرائی آگئی تھی۔ ان کی وفات سے میں ایک مہربان دوست سے محروم ہوگیا۔ رحمہ اللہ تعالی۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، ۱۹۶۳ء میں وہ وسکانسن میں تھے۔ وہاں ان کی رفیقِ حیات کا انتقال ہوگیا (۲۷ جنوری ۱۹۶۳ء)۔ اس کا ان کی صحت پر بہت ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ وہ اپنی قوتِ ارادی سے مردانہ وار کام میں جٹے رہے۔ لیکن یہ امر واقع ہے کہ اس حادثے سے ان کا دل بجھ گیا تھا۔ دل کا دوسرا شدید حملہ ۱۹۶۶ء میں علی گڈھ میں ہوا، جہاں وہ مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اس کے بعد متواتر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہلکے ہلکے حملے ہوتے رہے۔ تیسرا شدید حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سینے میں درد کی شکایت کی، حسبِ دستور ان کے معالج انھیں اپنے ساتھ اسپتال لے گئے۔ اگلے دن (۱۱ دسمبر) کوئی سوا تین بجے اللہ کا یہ نیک بندہ

اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گیا۔ ہوش و حواس آخر تک قائم رہے، بلکہ تین بجے تک وہ حاضرین سے باتیں کرتے اور انھیں مختلف ہدایتیں دیتے رہے تھے۔ تجہیز و تکفین ۲۰ دسمبر کی صبح کو ہوئی۔ نماز جنازہ مولانا سیّد علی صاحب (پیش امام مسجد پنجہ شریف، کشمیری گیٹ) نے پڑھائی، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن ہوئے!

آسماں تربت پہ تیری عنبر افشانی کرے!

نواب کلب علی خان (ف ۱۸۸۷ء) والی رامپور کے ایک بیٹے شبیر علی خان تھے۔ سیّدین کی شادی انھیں کی صاحبزادی عزیز جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ اولادیں چار بیٹیاں (زہرہ، بلقیس، سیدہ، ذکیہ) اپنی یادگار چھوڑیں۔

اِشاریہ

۱- اشخاص

(کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحے پر نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے)

ش

غ

ف

۲۔ مطبوعات (کتب، رسائل)

پ

ت

ز

س